صحرانورد کے خطوط
آٹھ رومان
مصنف:- میرزا ادیب
ناشران:-
مکتبہ اردو لاہور
قیمت

فہرس

انتساب
اپنی شفیق
ماں
کے نام
خدمت گزار
میرزا ادیب

پیش لفظ

ایک دفعہ میرے ایک دور افتادہ عزیز دوست نے لکھا تھا۔ "لوگ صحرا نورد کے خطوط کو حسن و عشق کی رنگین و دلآویز داستانیں یا محض تخیل کے تجربات و واقعات سمجھ کر نہایت شوق و دلچسپی کیساتھ پڑھتے ہیں اور مجھے کوئی شک نہیں کہ دلچسپی و دلآویزی کے لحاظ سے ان افسانوں کا درجہ اردو ادب میں نہایت بلند ہے مگر میں ان خطوط کو کسی دوسرے نقطۂ نظر سے پڑھا کرتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کے معتقد میری تائید کریں لیکن جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان داستانوں میں ظلم اور مظلومیت کی کشمکش کو نہایت کامیابی اور خوبی کیساتھ پیش کیا گیا ہے۔ خیر اسی چیز نے مجھے متاثر کیا ہے اور ان خطوط کو بار بار پڑھنے پر مجبور کیا ہے حتیٰ کہ سیل حوادث کو میں کم از کم پانچ بار پڑھ چکا ہوں۔"

یہ خط پڑھ کر مجھے جتنی مسرت ہوئی اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں۔ یہ میرے محترم و عزیز دوست پہلے شخص ہیں جنہوں نے خطوط کی گہرائیوں میں ڈوب کر میرے دل کی حقیقی تڑپ کو معلوم کیا ـــ میری اصلی خلش کا پتہ لگایا۔ اسکے بعد کئی حضرات نے ادب لطیف کے سالناموں یا افسانہ نمبروں پر ریویو کرتے ہوئے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا۔

ظلم اور مظلومیت کے تصادم کی داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانیت کی اپنی تاریخ۔ انسانیت کی تخلیق کیساتھ ہی ظلم نے بھی جنم لیا اور ظلم کے پیدا ہوتے ہی مظلومیت نے بھی آنکھ کھولی۔ اگر ہماری نگاہیں ازمنۂ ماضیہ کے کثیف پردوں کو چیر کر گذشتہ واقعات کو اپنے سامنے دیکھیں تو ہم یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تاریخ انسانی کا کوئی دور بھی کائنات ارضی کا کوئی حصہ بھی ظلم و مظلومیت کے تصادم سے خالی نہیں۔ دریائے نیل کے ساحلوں پر فرعون مصر نے بےکس بندگان خدا کو استبداد کے پاؤں تلے روندا۔ تو وادئ فرات میں مقدس پیالوں کی توہین کرنیوالے قاہر حکمران بیلشضر نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ارض بغداد میں ہلاکو نے وحشت و بربریت کا وحشتناک مظاہرہ کیا تو سرزمین ایران میں تیمور نے آباد و شاداب خطۂ ارض کو دم بھر میں جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ چار بڑے ظالم تھے۔ تاریخ انسانی پکار پکار کر ان کے ظلموں کا اعلان کر رہی ہے مگر یہ تو وہ ظالم ہیں جن کے نام تاریخ میں درج ہیں۔ ان کے علاوہ لاکھوں کروڑوں ظالم اس کرۂ ارض پر آئے اور ظلم و تشدد کر کے چلے گئے۔ ان کے کارنامے ہمارے سامنے نہیں لیکن ہمیں اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ ظلم روز ازل سے لیکر اب تک ہر دور میں ہوتا رہا ہے!

ان خطوط میں زیادہ تر ظلم و مظلومیت کے تصادم ہی کا ذکر ہے۔ افسوس کہ میں یہاں تفصیل سے کسی چیز کا ذکر نہیں کر سکتا۔ مندرجہ ذیل سطور کو صرف ایک اشارہ سمجھئے!

پہلا خط ہی ظلم و مظلومیت کی داستان ہے نعیم ظلم کرتا ہے مگر آخر میں پشیمان ہوتا ہے جب سر سے پانی گزر چکا تھا، سات سال کی
مسلسل بے قراری نعیم کی پشیمانی پر شاہد نہیں؟

دوسرے خط میں یہ امر زیادہ واضح ہے "دختر صحرا" ایک ڈرپوک لڑکی ہے جو اپنے آپکو بیحد کمزور سمجھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خوفناک بوڑھیا
کے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے اور اسکی یہی کمزوری اسکی بربادی کا موجب بنتی ہے۔ برعکس "دختر صحرا" آخر میں اپنی دشمن کا مقابلہ کرتی ہے اور اُسے
آنکھوں سے محروم کردیتی ہے مگر یہ واقعہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ کمزور دل لڑکی کی تمام مسرتیں خاک میں مل چکی ہوتی ہیں۔ وہ اگر چاہتی —
اسے اگر اپنے دل پر قابو ہوتا تو وہ اپنی مسرتوں کو خاک میں ملنے نہ دیتی!

تیسرے خط میں یوروپا باوجود ملکہ ہونے کے مظلوم ہے اُسکی قوت فیصلہ کمزور ہے اور یہی کمزوری اسکی المیہ پر منتج ہوتی ہے۔ چوتھے خط میں موری تی
کا پجاری اپنی سب سے بڑی آرزو کے پورا ہونے کے بعد ہوس کا شکار ہوجاتا ہے اور یہی ٹریجیڈی ہے۔ چھٹے خط میں شیریں کا وجود خاص طور پر مظلومیت
کا نمائندہ ہے۔ اس خط میں جا بجا ظلم و مظلومیت کا تصادم پایا جاتا ہے کیونکہ یہ حکایہ جنمیں بھی ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم!

قارئین ایک اور جذبہ بھی ان خطوط میں پائیں گے اور وہ ہے حب الوطنی۔ مجھے یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ میں وطن پرستی کو انسان
کا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہوں۔ ساری دنیا کے وطن ہونیکا میں قائل نہیں!

ان سطور کے بعد مجھے ان حضرات کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی جہت سے میری ہمت افزائی فرمائی مجھے بیحد افسوس ہے کہ میرے دو
عزیز و مکرم دوستوں یعنی پروفیسر اختر اورینوی ایم اے اور سید راحت گیلانی بی اے ایل ایل بی علیگ کے دیباچے کتاب میں شریک نہ ہوسکے
دیباچے اسوقت پہنچے جبکہ کتابت ختم ہو چکی تھی اور چند کاپیاں پریس میں بھجوائی . . . . جا چکی تھیں میں اپنے دونوں محترم دوستوں
کی خدمت میں معذرت خواہ ہوں اور اُن کی کرمفرمائیوں کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دونوں دیباچے ادب لطیف میں شریک ہونگے
ان کے علاوہ مجھے مکتبہ اردو کے سرگرم باہمت اور بلند ارادہ پروپرائٹر چودھری نذیر احمد کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہی کی کوششوں سے کتاب
ظاہری محاسن سے آراستہ ہو کر چھپ رہی ہے۔

میں اپنے احباب میں سے جناب شبلی بی کام، سید احسان علی شاہ بی اے، جناب اثر چکوالی، جناب یزدانی جالندھری، محترمہ شکیلہ اختر
محترمہ خورشید بیگم سید تنویر نقوی کا ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے کتاب کی اشاعت میں خاص دلچسپی لی۔

میرزا ادیب

۱-۶/۳۹ - مکتبہ اردو لاہور

صحرا نورد کا پہلا خط

چوہدری نذیر احمد صاحب مالک مکتبہ اردو لاہور نے برانچ کواپریٹو کیپٹیل پرنٹنگ پریس لاہور سے

طبع کرایا

افسانۂ خونیں

عزیز دوست ——————————— !!!

باور کرو۔ کہ چار جولائی کی رنگین و نزہت آگیں، افسردہ اور اداس شام مجھے اب تک نہیں بھولی۔ اور نہ کبھی بھول سکتی ہے۔ قدرتی طور پر تم شام کی ان متضاد کیفیات پر اظہارِ تعجب کرو گے، تمہارا تعجب بجا۔ میں نے شام کو رنگین اور نزہت آگیں اس لئے کہا۔ کیونکہ اس وقت میری نگاہِ تخیل کے سامنے دور و نزدیک۔ نزدیک و دور، شامِ صحرا کے وہ حسین مناظر، وہ رومانیت خیز مظاہرِ قدرت، جن کی بچپن سے میری رومانیت پرست طبیعت پرستار رہی ہے۔ فضا میں چھا رہے تھے۔ افسردہ اور اداس اس لئے کہ میں اپنے عزیز وطن کو، جس کا ذرہ ذرہ میرے لئے سجدہ گاہِ عقیدت تھا "نیرا کی وادی" کو جس کے آغوشِ راحت بخش میں میں نے ہزاروں مسرت سے لبریز دن اور سینکڑوں انبساط آگیں چاندنی راتیں گزاری تھیں۔ چھوڑ رہا تھا۔ اور سب سے آخر میں یہ کہ اپنے پیارے راشد سے، جس کی مخلصانہ رفاقت، بے غرضانہ غمگساری اور دردمندانہ سلوک کے اثرات میرے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور جو اس وقت ساحلِ بحر پر کھڑا رنج و غم کے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے خاموش الوداعی پیغام دے رہا تھا۔ رخصت ہو رہا تھا۔ ایک غیر معین مدت کے لئے رخصت ہو رہا تھا۔ میرے عزیز دوست! وہ غم انگیز سماں میری آنکھوں کو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ جب تم بادلِ اندوہگیں، و باچشمِ اشکبار مجھے رخصت کر رہے تھے، ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

میں نے ایک لرزہ محسوس کیا۔ اور جہاز سینۂ بحر پر چلنے لگا۔ آہ وہ کیا نظارہ تھا۔ زبان کے اظہارِ جذبات کی تمام وسعت اس اثر کو جو اس وقت میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ بیان کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ میں نے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ محسوس کیا؟ بس یہ سمجھ لو۔ کہ وہ سب کچھ دیکھا۔ جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہ سب کچھ محسوس کیا۔ جسے محسوس کرنے کی آرزو تھی۔ جاذبِ دل و نگاہ مناظر، خوبصورت و مسرت بخش شفاف چشمے، اگرچہ ان کے ساتھ ہی مجھے حوصلہ کُش

مصائب بھی برداشت کرنا پڑے۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک ہیبتناک صحرا، سر بگریباں ریت کے خوفناک تودوں کو، سینے پر اُٹھائے، ہیبت خیز درختوں کو پہلوؤں میں لئے میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہیبت ناک صحرا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی عظمت و ہیبت نے جسم اختیار کر لیا ہے۔ ہر لمحہ۔ ہر گھڑی وُہ وُہ محیر العقول و تحیر آفریں واقعات نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہیں جنہیں کبھی الف لیلہ کے اُن ہوشربا افسانوں میں پڑھا کرتا تھا جو تمہارے نزدیک پیداوار تھے انسانی دماغوں کے، حقیقت سے کوسوں دُور۔ مگر آج انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

رختِ سفر باندھتے وقت میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اپنی صحرائی زندگی کے واقعات گاہے گاہے تمہیں لکھتا رہوں گا۔ آج ایفائے وعدہ کی پہلی منزل پر قدم رکھتا ہوں۔ اور پہلا افسانہ بھیجتا ہوں۔ یہ افسانہ، یہ خونچکاں افسانہ مجھے کس طرح ملا۔ یہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ کل صبح جب کہ آفتاب کی پہلی کرن ریگِ صحرا کی پیشانی کو چوم رہی تھی، میں ایک وادی گلپوش کے نزدیک چشمے کے کنارے ٹھہر گیا۔ خیمہ لگایا۔ اور اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اچانک میری نظر وادی میں ایک سنگ مرمر کی تربت پر پڑی۔ دل بیتاب ہو گیا۔ وہاں پہنچا۔ تربت کی پیشانی پر لکھا تھا "یہاں بدنصیب رحیلہ سو رہی ہے جس نے محبت کی۔ اور جو محبت ہی کے ہاتھوں دُنیا سے رخصت ہو گئی"۔ تربت کے عقب میں چند سیڑھیوں کے بعد ایک اور تربت تھی پکی۔ ایک دو منٹ تک مَیں وہیں کھڑا رہا۔ پھر پاس ہی ایک جھاڑی کے قریب لیٹ گیا۔ تاثرات جوان قبروں کو دیکھ کر میرے دل پر چھا گئے تھے۔ اشعار کی صورت میں لبوں سے نکلنے لگے۔ اسی اثنا میں میری آنکھ لگ گئی جب سورج کی حدت آفریں کرنیں تودہائے ریگ کے سینوں پر نقش و نگار بنا رہی تھیں ماہ ذکی کی تمازت اندوز لہریں میرے چہرے کو جھلس رہی تھیں۔ میں جاگ اُٹھا۔ سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی۔ وُہ کاغذ کا ایک پُرزہ تھا جو ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ مَیں اُٹھا۔ پتھر کو ہٹایا۔ چند اَوراق نظر آئے۔ یہی اَوراق ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہُوں۔ اِن اَوراق میں ایسا خونیں، ایسا دردناک افسانہ درج ہے۔ جو تمہیں بے اختیار آنسو بہانے پر مجبور کر دیگا۔ یہ اوراق جو ایک ستم معقد محب کے عشقِ نالہ ساماں کی اشک طلب واردات اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ چند دن کے بعد تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ میری طرح تم بھی انہیں پڑھو گے۔ اور روؤ گے، روؤ گے اور پڑھو گے۔ مرحوم کی نعش کو کسی قافلے نے دفن کر دیا۔ کہاں! اُسکی محبوبہ کے پاس — میں عنقریب ایک اور افسانہ بھیجوں گا —!!

تمہارا۔ ۔ ۔ ۔ "صحرا نورد"

بابِ اوّل

آغازِ محبّت

یاد ہیں سارے وُہ عیشِ بافراغت کے مزے
دِل ابھی بھُولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

زندگی سب سے بڑی، سب سے بڑھکر ہیبت ناک سزا جو رُوحِ انسانی کو دیتی ہے۔ وُہ اضطراب ہے۔ آہ سات سال تک میری رُوح اضطراب و اضطرار میں مُبتلا رہی۔ معلوم نہیں۔ اِس طویل عرصے میں مَیں نے ایک لمحہ، ایک ثانیہ، وقت کے ایک حقیر ترین حصّے میں بھی دِل، دماغ اور رُوح کو جہنم کدۂ اضطراب کے سکون سوز شعلوں میں جلتے ہُوئے نہ پایا ہو۔ اس وقت جبکہ میری بدنصیب زندگی مصیبتوں کے مختلف منازل طے کرکے مَوت کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اور عنقریب میرا گُلِ ہستی اُن پھولوں کی طرح جنہیں ہوا کے بے رحم تند و تیز جھونکے شاخوں سے چھین چھین کر میری جانب پھینک رہے ہیں۔ زندگی کی نازک شاخ سے گر کر مُرجھا جائیگا۔ میں اپنے دِل میں مسرت کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ آج سے چار دن پیشتر جب لوگ اطمینان، اطمینان کہا کرتے تھے تو میں اُس طفلِ شیر خوار کے مانند، جو ماں کے لبوں سے گوش ناآشنا لفظ سن کر حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگتا ہے۔ حیران ہُوا کرتا تھا۔ اور سوچا کرتا تھا۔ کہ میری دُنیا میں یہ لفظ کبھی شرمندۂ معنی بھی ہُوا؟ مگر آج میری رُوح مطمئن ہے۔ رات تاریک ہے۔ لیکن میری قسمت سے بڑھکر تاریک نہیں۔ سامنے سیاہ پوش اُونچے درخت کی شاخ پر کوئی مغموم پرندہ اپنی غمگین نوائیوں سے ہوا میں مدھم سا ارتعاش پیدا کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے تیز و تند جھونکے درختوں کی شاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر سمع خراش شور پیدا کرتے ہُوئے تاریکی میں ملفوف فضا کے سکون کو بے طرح زخمی کر دیتے ہیں۔

—— میرے ہر طرف نکہت ریز پھولوں کا ہجوم منتشر ہے۔ تیز رَو ہوا کی ظالمانہ دست درازیاں ان پتّوں کو نوچ رہی ہیں۔ آسمان پر کوئی ستارہ نہیں، چاند بھی کسی سیاہ بادل کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ مَیں اپنے آخری ہمدم چراغ کی لرزتی ہوئی روشنی میں اپنی مجروح عشق زندگی کا افسانۂ خونین لکھنے کا ارادہ کر رہا ہُوں جب

ہوا کا تیز جھونکا آتا ہے۔ چراغ کا شعلہ تاب مقابلہ نہ لا کر کانپ کانپ جاتا ہے۔ مگر بجھتا نہیں مجھے یقین ہے۔ میرا یہ رفیقِ زندگی میرے ساتھ وُہ سلوک نہیں کریگا۔ جو گذشتہ سات سال میں دُنیا نے میرے ساتھ کیا۔ یا خود میں نے اپنے ساتھ کیا ——— میں اپنا افسانہ خونچکاں کیوں لکھ رہا ہوں؟ کیونکہ یہ میرے دِل کی آخری آرزو ہے۔ اور میں اپنے دل کی آخری آرزو ضرور پوری کروں گا۔ اپنا افسانہ محبت تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ موت کا خوفناک ہاتھ میرے جسم سے رُوح اور میرے ہاتھ سے قلم چھین لے۔ میں اپنی داستانِ عشق اس لئے نہیں لکھ رہا۔ کہ کوئی پڑھے اور اُس کے سینے میں میری طرف سے رحم پاش جذبات موجزن ہوں۔ اور وُہ میری دلگدازداستانِ محبت پر چند آنسو بہائے، مجھے دُنیا کے رحم کی ضرورت نہیں۔ میں اب دُنیا بنانے والے کے پاس جا رہا ہوں۔ جو مجھ پر ضرور رحم کرے گا۔ اور یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ اب ہوا ختم گئی ہے۔ چاند نکل آیا ہے۔ میرے اردگرد روشنی پھیل گئی ہے۔ یہ میرے لئے یک گونہ اطمینان کا باعث ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا۔ کہ وارداتِ الفت ختم کئے بغیر میری زندگی کی آخری گھڑیاں ختم ہو جائیں۔ مگر یہ پھول ——— ؟ یہ پھول مجھے بہت ستا رہے ہیں۔ کاش ہوا کی یہ گلباریاں بھی ختم ہو جائیں۔ مجھے اِن ننھی ننھی جانوں پر بہت رحم آتا ہے۔ آہ۔ یہ سرخ پھول کہاں سے آگیا، اب تک میری نظروں نے اِسے نہیں دیکھا تھا۔ آہ اِسی قسم کا سُرخ پھول تھا۔ جو ایک چاندنی رات کو "قصرِ سفید" کی بائیں جانب مختصر سے شاداب باغ کے وسط میں میری محبوبہ دِلنواز رحیانہ (میرے چچا کی اکلوتی بیٹی) نے ایک دِلربایانہ ادا کے ساتھ مجھے دیا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ غزالیں آنکھوں میں تبسم کی لہریں لرز رہی تھیں۔ میں نے ایک سفید پھول توڑ کر اُس کی جانب بڑھایا۔ اُس نے ممنونیت آگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھول کو ہاتھ میں لیا اور لاابالیانہ انداز میں اس کی پتیاں توڑنے لگی۔

"ہیں۔ تم میری محبت کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو" میرے لبوں سے بے اختیارانہ نکلا۔

"تم مرد بھی عجیب ہو۔ ذرا سی بات پر ہنگامہ بپا کر دینا تمہاری عادت ہے" اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"مگر عورتیں عجیب تر ہیں، اتنی بڑی بات کو معمولی سی بات سمجھ لیتی ہیں"!

"بڑے باتونی ہو۔ یہ تو اپنا پھول میں نے تم سے مانگا ہی کب تھا"؟

"پہلے پھول مجھے دیا ہی کیوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا۔ کہ میں بھی تمہیں اس کا عوض دُوں"؟

"مجھے تو اس کا خیال تک بھی نہیں تھا!"

"مجھے تو خیال تھا نا"

اس کے بعد ہم سنگ مرمر کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ رحیلہ کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ "قصر سفید" کے عقب میں پھولوں کی کئی کیاریاں تھیں۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد وہ پھولوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔ اور اس کے جاں بخش نغموں کی صدائیں میرے کانوں میں آنے لگیں۔ رحیلہ کی یہ عادت تھی۔ کہ جب پھول توڑتی۔ یا اُن کی دیکھ بھال کرتی، تو عجیب راحت فزا نغمے اُس کے لبوں سے برسنے لگتے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ مختلف قسم کے پھول دامن میں لئے مسکراتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی مسرت ——— وہ مسرت جو دنیا کی خوش بخت ہستیوں ہی کا حصہ ہے۔ میرے جسم کے ذرّے ذرّے پر طاری ہو جاتی، میرے اللہ! مجھے "رحیلہ" سے کسقدر محبت تھی!

باب دوم

ایک عجیب واقعہ

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے ——— اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ان حسین اور مقدس دنوں میں کبھی یہ خیال میرے دماغ میں نہ آسکتا تھا۔ کہ رحیلہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے جدا ہو سکتی ہے۔ میں ہر وقت لطافت کدہ محبت کی مسرت بریز فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ محبت نے اس ظلمت کدہ عالم، اس دنیائے غم بنیاد کو میری نگاہوں میں۔ نور و نکہت اور راحت و شادمانی سے بریز جنت بنا دیا تھا۔ محبت نے مجھے وہ سب کچھ دے دیا تھا۔ جس کے حصول کے لئے ایک انسان کے خواب بیقرار رہتے ہیں۔ یکایک میرے شہد چشیدہ ہونٹوں نے سراب غم کی تلخی محسوس کی۔ یعنی ابھی مجھے "قصر سفید" میں آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ ایک منحوس صبح کو والد محترم کی وفات کی دلخراش خبر نے مجھے نیم بیہوش سا کر دیا۔ والدہ کو دنیا سے رخصت ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ کہ یہ دوسرا دلدوز سانحہ پیش آیا۔ والد کی وفات کا غم مجھے یقیناً

مجنوں بنا دیتا۔ مگر چچا جان اور رحیلہ کی دلسوزانہ ہمدردی نے غم و رنج کے اثرات میرے دل سے مٹا دیئے۔ میں پھر پہلے کی طرح فردوسِ محبت کی فضاؤں میں سانس لینے لگا۔ گھر جانے کو نہ تو میرا دل چاہتا تھا، اور نہ چچا جان اس کی اجازت دیتے تھے۔ اُنہوں نے میری چھوٹی بہن کو بھی وہیں بُلا لیا۔ اب ہر وقت میں تھا اور رحیلہ ——— رحیلہ کے جلوے تھے۔ اور میری آنکھیں!! اوائل عمر ہی سے مجھے فن سپہ گری کا شوق تھا۔ اس لئے چچا جان کی رضامندی حاصل کر کے میں ان کی فوج میں شامل ہو گیا۔ امارت و ثروت کا تو یہ تقاضا تھا۔ کہ میری زندگی اُس زمانے کے امیرزادوں کی طرح آغوشِ عشرت ہی میں بسر ہوتی۔ لیکن میں فطرۃً کاہل زندگی سے بہت متنفر تھا۔ اگرچہ فوج میں ایک عہدہ جلیلہ ملنے کے ساتھ ہی مجھے کئی کئی گھنٹے رحیلہ کی مفارقت برداشت کرنا پڑتی تھی چچا جان میری بہادرانہ کارگزاریوں اور متہورانہ کارناموں کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور رحیلہ کے بعد میں ان کی نگاہوں میں سب سے بڑھ کر عزیز تھا۔ چچا جان ایک وسیع و دولتمند ریاست "شجاع آباد" کے حکمران تھے اس لئے دولت اور ثروت کی وہاں کمی نہ تھی۔ ایک دن میں اور رحیلہ شام کے وقت حسبِ معمول قصرِ سفید کے پائیں باغ "فردوسِ منظر" میں فوارے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اپنے فوجی کارنامے سُنا رہا تھا۔ اور وہ سُن سُن کر اظہارِ مسرت و دلچسپی کر رہی تھی۔ کہ اتنے میں بابا جوزی ہمارا بوڑھا خادم مغموم و متفکر صورت بنائے ہوئے آیا۔ رحیلہ نے اُس کی ہیئت کذائی دیکھتے ہوئے مذاقاً کہا۔

"بابا جوزی! آج تو تم عجائب گھر کی مکمل زینت بن سکتے ہو!"

"بڑی شریر ہو رحیلہ! تمہیں کیا معلوم کہ ریاست میں کیا ہو رہا ہے؟" بابا جوزی نے کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے۔ بتاؤ کچھ تو معلوم ہو۔ ریاست کے سب سے بڑے جاسوس تمہیں تو ہو!"

"امیر بیدار بخت خاں خفیہ طور پر حضور کے خلاف بغاوت کا جال پھیلا رہا ہے!"

امیر بیدار بخت خاں ریاست میں بہت دولت مند انسان تھا۔ اور ہزاروں لوگوں کے دلوں کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اُس کے اثر و اقتدار سے خود چچا جان بھی خائف رہا کرتے تھے۔ امیر اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور اس کا جواں ہمت بیٹا ثروت خاں سلطنت میں سب سے زیادہ طاقتور و شجاع سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اُسے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ صرف تعریف سُنی تھی۔ جب میں لوگوں کی زبان سے اس کی شخصیت کے متعلق تعریفی کلمات

سُنتا۔ تو میرے دل میں جذباتِ رشک پیدا ہو جاتے اور اب وہ رشک حسد کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے ہزیمت دُوں ـــــ اسے قتل کر دوں، اب جونہی میں نے بیدار بخت کا نام سنا، میری توجہ معاً ثروت خاں کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور سینے میں جذباتِ حسد اُبھرنے لگے۔ بابا جوزی نے امیر کے خوفناک ارادے کی خبر سُن کر جمیلہ تو خاموش رہی۔ اور میری طرف استفہام انگیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ گویا مجھ سے پُوچھ رہی ہے۔ کہ یہ بات غلط ہے یا درست:

"یہ تو ہوا ہی کرتا ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا" امیر اور اُس کا لڑکا ہماری ریاست کا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں؟"

"آپ اسے اہمیت نہ دیں۔ مگر میں سرد و گرم عالم چشیدہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ معمولی معمولی بغاوتیں کیسے خوفناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ حضور بھی اس کی پروا نہیں کرتے۔ اور میں نے تو کچھ اور بھی سُنا ہے"!

"تم تو سُنتے ہی رہتے ہو کہتے کچھ بھی نہیں۔" رجیلہ نے کہا۔

"کیا سُنا ہے بابا جوزی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت خطرناک بات!" اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا خطرناک بات۔ کہو بھی تو۔"

"میں نے سُنا ہے۔ کہ امیر کے چند حامی حضور کی جان کو نقصان پہنچانے کی ذلیل سازش کر رہے ہیں۔ اور رات کے وقت حضور کو تہ تیغ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ہے کوئی ایسا مردِ میدان؟ جب تک میرے جسم میں جان ہے۔ کوئی شخص چچا جان کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

بابا جوزی نے اپنی عادت کے مطابق عجیب و غریب مُنہ بنا کر ہونٹوں پر دائیں ہاتھ کی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "سچ ہے!"

میں گو سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مگر اُس کی اس حرکت پر بے اختیار ہنس پڑا۔ رجیلہ بھی مُسکرائی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا۔ کہ اُس کے چہرے سے سنجیدگی کے اثرات پھُوٹ رہے ہیں۔ اُس کا تبسّم بھی پھیکا اور اُداس سا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر بابا جوزی ہمیں گھُورتا ہوا چلا گیا!

"رحیلہ تم متفکر کیوں ہو گئیں۔ یہ تو معمولی سی بات ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بابا جوزی نے سُنا کچھ ہو۔ اور اُس کے سالخوردہ دماغ نے سمجھا کچھ اور ہو ـــــ بوڑھے آدمی ہر چیز کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔" میں نے رحیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا:

"نہیں میں تو فکر مند نہیں ہوں۔"

"اور فکر مند ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔"

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو ـــــ تم نے باتوں میں لگا کر مجھے اپنے پیارے پھولوں کی دیکھ بھال بھی نہ کرنے دی۔ بیچارے بزبان خاموشی مجھے بُلا رہے ہیں۔" یہ کہکر وہ پھولوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔

جب ہم باغ سے محل میں آئے تو شام کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ رحیلہ بالکل خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ اگرچہ متبسّم تھے۔ مگر اس کی خاموشی اور چہرے کے نمایاں تغیرات سے میں یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس کے دماغ میں متفکرانہ خیالات کا ہجوم بیقرار ہے۔ اس کی یہ افسردگی میرے لئے بہت اذیت رساں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ عادتِ مستمرہ کے خلاف مجھے شب بخیر کہے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ رحیلہ کا کمرہ چچا جان کے کمرے کے ساتھ ملحق تھا، مگر میرا کمرہ محل کے جنوبی جانب آخری گوشے میں تھا۔ کمرے میں پہنچکر میں کپڑے اتارے بغیر کوچ پر گر پڑا۔ میرے سر کے عین اوپر چھت کے ساتھ بڑا سا سیمیں شمعدان لٹک رہا تھا، میں اُس کی طرف دیکھنے لگا ـــــ دل و دماغ پر رحیلہ کی شکل، رحیلہ کی محبت، اور رحیلہ کے خیالات ہی چھائے ہوئے تھے۔ اسلئے اسی حالت میں میری نگاہوں کے سامنے سنہری کرنوں کے ہجوم میں ایک متبسّم چہرہ نمودار ہوا۔ جیسے جیسے وہ زیادہ قریب آتا جاتا تھا۔ زیادہ متبسّم ہوتا جاتا تھا۔ یہ میری رحیلہ کا چہرہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب اُنہیں کھولا۔ تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ شمع کی رنگین کرنیں کمرے کی ہر ایک چیز سے ہم آغوش ہو رہی تھیں میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور چند منٹ کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں۔ میں کے گھنٹے سوتا رہا۔ یکایک آنکھ کھل گئی۔ دلنواز رحیلہ کے نشہ آفریں نغموں کی شیریں صدا، جو کسی وادی میں بہتی ہوئی ندی کے سحر پرور ترنم سے مشابہ تھی۔ ہوا کے پردوں سے چھن چھن کر میرے کانوں میں آرہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا خوابگاہ محبت میں میرے حسین و رنگین خوابوں کی جوانی نغمہ زن ہے۔ بس اُٹھا اور بے اختیار محل کے صحن کی طرف چلنے

لگا۔ کیونکہ لبا اوقات چاندنی راتوں میں وہ وہیں اکیلی یا میرے ساتھ دلربا بجا کر مجھے سنایا کرتی تھی ——— مگر آج وہ اپنے کمرے کے آگے، چاند کی پھیکی روشنی میں سنگِ مرمر کی میز پر بیٹھی ہوئی "دلربا" بجا رہی تھی۔ اس کی سیمیں پیشانی پر ہلکے سرخ رنگ کا رومال بندھا ہوا یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا شفاف چشمے کی بلوریں سطح پر شفق کا عکس تھرا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک عجیب دلکش انداز کے ساتھ دلربا ہاتھ سے رکھ دی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی :-

"تمہیں رات کو بھی آرام نہیں آتا"؟

"اور تمہیں بھی رات ہی کو نغمہ سرائی کی ضرورت پیش آتی ہے"؟ میں نے مسکرا کر کہا۔

میرا خیال تھا۔ کہ وہ اپنی عادت کے مطابق حاضر جوابی سے کام لے گی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اس کا چہرہ بہت حد تک متفکر ہو گیا ہے میرے دل پر بے چینی سی چھا گئی۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔ تم فکرمند سی نظر آ رہی ہو۔ اور ماتھے پر رومال کیوں بندھا ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"سر میں معمولی سا درد ہو رہا ہے۔ اور طبیعت مضمحل ہے۔ یہاں دل بہلانا چاہتی تھی۔ کہ تم آ گئے"!

"میں تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑتا۔ بھلا میں تمہاری تفریحِ طبع میں مزاحمت کیوں کرنے لگا"؟

"یہ تو درست ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ تمہاری موجودگی بذاتِ خود میری تفریحِ طبع میں ایک بہت بڑی مزاحمت ہے"۔

"اچھا میں جاتا ہوں۔ میری موجودگی بھی اب کھٹکنے لگی"۔ میں نے غصہ آمیز لہجے میں کہا۔

"تم تو رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہو۔ ذرا سی بات تھی۔ اور تم کیا سمجھ بیٹھے۔ چشم بددور! فنِ سخن سازی میں خوب ماہر ہو" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کی افسردگی اب بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ اور یہ چیز میرے لئے بہت مسرت زا تھی۔

"تو پھر کہا ہی کیوں"؟ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یونہی ———" وہ ذرا رکی اور پھر کہنے لگی "حقیقت بیان کی تھی۔ دیکھ لو اب دلربا خاموش ہے۔ میں نے سچ کہا تھا نا"؟

"بالکل سچ ـــ!"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ کہ اُس نے دِلربا میرے آغوش میں رکھدی اور یہ کہتے ہُوئے کہ "اب تم دِل بہلاؤ" اپنے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ میں چند منٹ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ریشمیں پردوں کو ہلاتے ہُوئے کمرے کی خاموش فضا میں سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ میں نے جنوبی کھڑکی کھول دی۔ محل کے نیچے غریب آبادی نیند کی راحتوں میں کھوئی ہُوئی تھی۔ "رجیلہ کی حالت عجیب سی ہے"۔ یہ خیال بار بار میرے دماغ میں آتا۔ "شاید بابا جوزی کی باتوں نے اُسے مغموم کر دیا ہو ـــ کہیں میں نے اس کا دل تو نہیں دُکھایا؟" اس خیال کے آتے ہی میں اپنی تمام دن کی حرکات و سکنات کا تجزیہ کرنے لگا۔ انہیں خیالات میں میری آنکھ لگ گئی۔ معاً میں نے قلعے کے نیچے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے قدموں کی آواز سُنی۔ کھڑکی سے دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ چاروں طرف خاموشی اور تاریکی تھی۔ چاند سیاہ بادلوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی ستارہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے پھر سونے کا قصد کیا۔ لیکن معلوم نہیں۔ کیوں کسی موہوم خطرے کا خیال میرے دِل میں اضطراب پیدا کرنے لگا۔ چند لمحے اسی کشمکش میں گزر گئے۔ میں ایک فوری جذبے کے ماتحت اُٹھا۔ اور محل کے بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ ـــ یکایک مجھے اپنے پاس روشنی نظر آئی۔ اور اس طرف پہلی بار روشنی دیکھکر میں نے سمجھا۔ کہ میری نظروں نے دھوکا کھایا۔ مگر جب دوبارہ غور سے دیکھا۔ تو وہم حقیقت سے بدل گیا۔ رجیلہ ایک چھوٹا سا لمپ ایک ہاتھ میں لئے اور دوسرے میں پستول پکڑے محل کے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے دیکھکر وہ ٹھٹک گئی:

"رجیلہ! کدھر چلیں"؟ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خاموش رہو ـــ خاموش"۔ اُس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:

"کیا ہے؟ اور تمہارے ہاتھ ـــ!"

"کچھ بھی نہیں میرا وہم ہے"! اُس نے میرے الفاظ کاٹتے ہُوئے کہا:

"میں نے سوتے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنی ہے ـــ اور ـــ وہ کون آ رہا ہے"! دروازے سے دس بارہ گز کے فاصلے پر ایک سایہ حرکت کرتا ہُوا نظر آ رہا تھا:

"رجیلہ! پستول مجھے دے دو ـــ اور میرے پیچھے ہو جاؤ"

"نہیں نعیم! رحیلہ نے دلیرانہ جواب دیا: "اسے آنے دو"۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟

"نعیم! تم خاموشی کے ساتھ یہیں کھڑے رہو۔ یہ میری التجا ہے۔ میرے پاس پستول ہے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ دیکھو۔ عورت اپنے چند لفظوں سے ایک دشمن کا دل کیونکر فتح کر سکتی ہے" یہ کہہ کر وہ تیزی کیساتھ آگے بڑھنے لگی۔ وہ سایہ اب ایک سیاہ پوش انسان کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور چاند کی مدھم روشنی میں مجھے ایک وجیہہ نوجوان چہرہ نظر آرہا تھا۔ رحیلہ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھکر وہ ٹھٹک گیا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا۔ تیزی سے وہاں پہنچا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ اس کی گردن دبوچ لوں۔ کہ رحیلہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سامنے کھڑے ہوئے مبہوت وحیران نوجوان سے کہا:۔

"سوئے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا انتہائی بزدلی ہے۔ آپ کی صورت سے تو بزدلی ظاہر نہیں ہوتی"۔

یہ سنتے ہی وہ شخص ایک لمحہ ٹھہرے بغیر "مجھے معاف کر دو بانو" کہتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رحیلہ ہنس پڑی۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر محل کی دیوار کے نیچے دیکھنے لگا۔ دیوار پر کمند لگی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی ——!

میں نے مڑ کر دیکھا۔ رحیلہ میری طرف آرہی تھی۔ اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھدیا" وہ چلا گیا۔ بہادر دشمن معلوم ہوتا تھا۔ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کریگا"!

"بدبخت جوزی کی بات سچی نکلی"۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا!

"ہاں یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ابا جان پہلے ہی غمگین رہتے ہیں، یہ سن کر زیادہ غمگین ہو جائیں گے۔ چلو اب اپنے کمرے میں۔ میں بھی اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔ دیکھو یہ واقعہ کسی سے نہ کہنا۔ تم سے محبت کرنے والی رحیلہ یہ تم سے کہہ رہی ہے" یہ کہکر وہ چلنے لگی!

"تم جاؤ۔ میں یہیں رہونگا۔ پستول مجھے دے دو"۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گا" یہ کہتے ہوئے اس نے پستول میرے ہاتھ میں لے

دیا۔ اور خود جانے لگی پھر ٹھہر کر ہنسی۔ "تم اسے لے کر کرو گے ہی کیا۔ یہ تو خالی ہے ---- بالکل خالی" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں نے پستول کو دیکھا۔ واقعی وہ خالی تھا۔ بار بار مجھے رجیلہ کی جرأت و دلیری پہ تعجب ہوتا تھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد میں ایک مینار پر چڑھ گیا۔ اور اس واقعہ پر غور کرنے لگا۔ میرے دل میں خیال آتا تھا۔ کہ اس اجنبی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ رجیلہ کو دیکھتے ہی اس کی نگاہیں جھک گئیں تھیں۔ صبح تک میں وہیں بیٹھا رہا۔

صبح جب میں نے مینار سے نیچے اُترنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت بادِ صبا کے نکہت بآغوش سرد جھونکے مستانہ وار چل رہے تھے۔ اور آفتاب عالمتاب کی پہلی حسین کرن سامنے کے بلند پہاڑ کی سفید پیشانی پر بوسہ زن تھی۔ چونکہ رات کو بہت کم سویا تھا۔ اور دماغ عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ اس لئے میرے اعضا بہت مضمحل تھے۔ ایک اجنبی کا آنا۔ پھر واپس چلے جانا۔ میرا محل کے نیچے چند گھوڑوں کو سرپٹ دوڑتے ہوئے دیکھنا۔ یہ تھے واقعات جو میرے حافظہ کے پردے پر یکے بعد دیگرے مدھم نقوش کی صورت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ مینار سے نیچے آکر میں نے چاہا۔ کہ سیدھا اپنی محبوبہ دلنواز کے پاس جاؤں۔ لیکن اچانک چچا جان کا ایک معتمدِ خاص ملا۔ جس کے ساتھ میں چچا جان کی خدمت میں جا پہنچا۔

"کیوں بیٹا! کیا بات ہے۔ تمہاری آنکھیں سُرخ ہیں۔ رات نیند نہیں آئی کیا؟" انہوں نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!"

"کیوں؟" انہوں نے پھر مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا کرتے رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یونہی نیند نہیں آئی۔ اور تمام رات عجیب بھیانک خواب دیکھتا رہا۔"

"بھیانک خواب!" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خوب تمہیں بھی بھیانک خواب ستانے لگے!"

میں خاموش رہا۔ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پھر کہا:-

"اب مطلب کی بات کرنا چاہیئے۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ امیر بیدار بخت نے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے۔ اُس کی سرکوبی نہایت ناگزیر امر ہے۔ اس لئے تم سپاہیوں کے چند دستے لیکر جاؤ۔ اور اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر آؤ۔"

چچا جان کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ کہ میں نے جلدی سے "بہت اچھا" کہا۔ اور واپس جانے لگا۔ انہوں نے پھر مجھے بلایا۔
اور میں اس دن شام تک سلطنت کے کاروبار میں مصروف رہا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ رات کے واقعات ہر لمحہ میری آنکھوں کے آگے پھرتے رہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ انسان جسقدر ایک چیز کو فراموش کرنا چاہے۔ اتنی ہی وہ حافظے میں ابھرتی جاتی ہے۔ میں کوشش کر رہا تھا۔ کہ تمام واقعات جو میری آنکھوں نے رات کے وقت دیکھے تھے۔ بھلا دوں۔ کیونکہ انہیں بار بار یاد کرنے سے دماغ میں ایک طرح کی الجھن، ایک قسم کی کشمکش جاری ہو جاتی تھی۔
"وہ اجنبی کون تھا؟" رہ رہ کر یہ سوال میرے دماغ میں آتا۔ "تاریکی میں میری نگاہیں اس کے چہرے پر پڑی تھیں۔ اور اس کا وجیہہ چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ اسکی صورت جب میری آنکھوں کے سامنے آتی۔ مجھے عجیب قسم کی روحانی اذیت کا احساس ہوتا۔ آہ میری مصیبتوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ میری دنیائے مسرت کی فضاؤں میں مصیبت کی تاریکیاں اتر رہی تھیں۔
تقریباً شام کے چھ بجے میں سلطنت کے ضروری کاموں سے نجات پا کر رحیلہ سے ملنے کے لئے باغ فردوس منظر کی طرف جا رہا تھا۔ میرے دل کی گہرائیوں میں عجیب قسم کے جذبات بیقرار تھے۔ اور دماغ میں ناقابل بیان خیالات بیتاب۔
چند لمحوں کے بعد میں باغ میں پہنچ گیا۔ پودوں میں سے رحیلہ کی شیریں آواز آ رہی تھی۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا۔ وہ سفید لباس میں ملبوس مسکراتی ہوئی باغ کے عقب کی سیاہ جھاڑیوں سے اس طرح باہر آئی۔ جس طرح کالی پلکوں سے آنسو کا شفاف قطرہ نکل کر گر پڑتا ہے۔ اس کے لبوں پر تبسم کی لہریں چھائی ہوئی تھیں۔ میرے دل سے تمام کشمکش دور ہو گئی۔ گویا اس کے تبسم کی لہریں چراغِ مسرت کی کرنیں تھیں جس نے میرے دل کی فضاؤں سے اضطراب کی تاریکیاں مٹا دی تھیں۔ وہ میرے سامنے سنگِ مرمر کی میز پر بیٹھ گئی۔

"رات تو تم نے کمال ہی کر دیا رحیلہ!" میں نے کہا۔ "مجھے خیال بھی نہ تھا کہ تم اتنی بہادر، اتنی نڈر ہو، اور تمہیں معلوم کیونکر ہوا۔ کہ وہ آ رہا ہے؟"

"بے کماؤں کے لئے ذرا سی بات بھی بہت بڑا تمغۂ کمال بن جاتی ہے۔ بھلا میں نڈر کیوں نہ ہوں۔ میری رگوں میں ان بہادر افغانوں کا خونِ مقدس دوڑ رہا ہے جنہوں نے چمکتی ہوئی تلواروں کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اور جن کے بچوں کو کڑکتی ہوئی بجلیاں لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ میں کمرے سے یونہی باہر نکلی اور میری نظروں نے دور ایک سایہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا ——— میں سمجھ گئی۔ کہ کوئی بات ہے۔"

"گفتگو خوب پُر شکوہ ہے"۔ مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ فقرے کہاں سے رٹتے ہیں تم نے؟"

"تم تو ہر چیز کا مذاق اُڑاتے ہو۔ لو بھلا اس کا بھی مذاق اُڑاؤ"۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک نکہت آلود لفافہ میرے ہاتھوں میں دیا۔ اس میں لکھا تھا:۔

محترمہ ——— !

رات آپ نے مجھے بہادری کا ایک سبق دے کر میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے کھول دیں۔ اس کے لئے مَیں آپ کا انتہائی طور پر شکر گذار ہوں۔ کیا آپ کی کرم فرمائیاں میرے حقیر جذبات تشکر کو قبول فرمائیں گی۔ آج سے مَیں آپ کا ادنیٰ غلام ہوں"۔

آپ کا ادنیٰ خادم

"رشدی"

ان سطروں کے پڑھنے کے بعد مَیں خود کو پہلے کی طرح مضطرب محسوس کر رہا تھا۔

"جلدی سے اِسے اپنا رقیب سمجھ لو"۔ رجیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں ملا کیونکر؟" مَیں نے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خط کس طرح ملا کرتے ہیں! ایک شخص باباجوڑی کو دے گیا"۔

مَیں خاموش ہو گیا۔

"متفکر کیوں ہو گئے؟" رجیلہ نے پوچھا۔

"تم اس خبیث رشدی کو کیا سمجھتی ہو؟"

اُس نے اِس سوال پر مجھے متعجبانہ دیکھا۔ "دُوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان اَور کیا، کیا مطلب ہے تمہارا؟؟"

"یُونہی"۔

"بڑے وہم پرست ہو تم بھی۔ تم جس عورت سے محبّت کرتے ہو۔ چاہتے ہو کہ تمہارے سوا وُہ بیچاری کسی اور کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائے۔ اَور سوائے تمہارے باقی تمام دُنیا سے کنارہ کش ہو جائے ——— اچھا اب باتیں

نہ بناؤ۔ مجھے اپنے نعیم کے واسطے ہار گوندھنے دو۔"
میں ہنس پڑا، اور وہ پھول گوندھنے لگی؛

اس وقت میرا دل مسرت سے لبریز تھا۔ لیکن جس طرح شفاف پانی سے بھرے ہوئے چشمے کی تہ میں کہیں کہیں گدلا پن ہوتا ہے۔ اس طرح میری خوشیوں کے عقب میں اضطراب کی لہریں بھی دوڑ رہی تھیں۔

باب سوم

رقیب کی تیمارداری

شکایت اُسکے تغافل کی اسقدر نکروں کہیں وُہ پھر نہ مجھے مِل کے شرمسار کرے

سورج کو غروب ہوئے چند منٹ گزر چکے تھے۔ مغربی آسمان نے اپنے چہرے پر خونچکاں نقاب اوڑھ لیا تھا، یا بام گردوں سے فطرت کی حسینہ آتشیں رخسار کائنات کو دیکھ رہی تھی۔ ہماری گاڑی ساحل دریا پر ہوا کے دامن کو چیرتی ہوئی، پہیتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے فضا میں سمع خراش شور پیدا کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ رجیلہ میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بابا جوزی اپنی سیاحت کے دلچسپ واقعات مبالغہ آمیز پیرائے میں بیان کر رہا تھا۔ میں اس کے قصوں کو محض لغو سمجھتا۔ مگر رجیلہ اُن میں دلچسپی محسوس کرتی تھی۔ اور اب بھی وہ ہمہ تن گوش ہو کر جوزی کے الفاظ سُن رہی تھی۔ میری باتوں کا جواب دیتے وقت اُس کے چہرے پر خفگی کے اثرات پیدا ہو جاتے۔ اور وہ جلدی سے جواب دے کر پھر بوڑھے کے واقعاتِ زندگی سُننے لگتی۔ اب اسکی تمام باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اور وہ گاڑی کی آرام دہ گدّی پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا۔ اور شام کے مناظر کی تعریف کرنے لگا۔ رجیلہ نے بھی کھڑکی سے سر باہر نکالا۔ پیاری پیاری مرغابیاں، چمکیلے پر پھیلائے ہوئے اُڑ رہی تھیں۔ ملاحوں کے معصوم گیت فضا میں گونج رہے تھے، چار پانچ منٹ تک ہم خاموشی کے ساتھ نظاروں کے دیکھنے میں مصروف رہے۔

اسی اثنا میں ہماری گاڑی دریا کے پل کے پاس پہنچ گئی۔ پل کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا۔ جونہی میں نے اُسے

دیکھا۔ مجھے محسوس ہُوا۔ کہ اس کی شکل آشنا معلوم ہوتی ہے۔ رحیلہ نے بھی اُسے دیکھا۔ اس طرح جس طرح ایک اجنبی دُوسرے اجنبی کو دیکھتا ہے۔ ہماری گاڑی پل پر سے گزرنے ہی لگی تھی۔ کہ وُہ جلدی سے ہماری گاڑی کے قریب آیا۔ اور کہنے لگا:۔

"پل کا آخری حصّہ شکستہ ہے۔ آپ اپنی گاڑی واپس لے جائیں"۔

مَیں نے گاڑی کا رُخ بدلا۔ اور اس شخص کا شکریہ ادا کیے بغیر گاڑی کو آگے بڑھانے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر معلوم نہیں زبان پر کیوں مُہرِ خاموشی لگ گئی۔ گاڑی بہت تیز چل رہی تھی۔ رحیلہ نے متعجبانہ مجھے دیکھا:

"اتنی تیزی کی کیا ضرورت؟"

مَیں کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔ رحیلہ نے دوبارہ پُوچھا:

"یُونہی"! میں نے جواب دیا:

"یونہی کیا"؟ اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات تمہاری حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ اُس شخص کا شکریہ بھی تم نے ادا نہیں کیا۔ وُہ دل میں کیا کہتا ہوگا۔ کہ کن مغرور انسانوں سے نیکی کی"! یہ کہکر وُہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ اس کے قہقہوں کی آواز سن کر بوڑھے جوزی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور خواہ مخواہ اپنے لمبے لمبے دانتوں کی نمائش کرنے لگا:

"تم کیوں ہنستے ہو بابا جوزی"! رحیلہ نے پوچھا!

"مَیں نے عجیب خواب دیکھا ہے۔ خدا کی قسم بہت عجیب"!

"کیا خواب دیکھا ہے"۔ رحیلہ نے پوچھا!

"مَیں نے دیکھا۔ کہ ہماری گاڑی ایک ٹُوٹے ہوئے پُل پر سے گزرنے لگی ہے۔ سامنے کے پہاڑ کی جنوبی جانب سے ایک بڑا سا سیاہ دیو آتا ہے۔ اور ہماری گاڑی کو کندھوں پر اُٹھا کر، دریا کی دوسری طرف لیجاتا ہے"۔

"واہ بابا جوزی! اجنبی کی باتیں سُنکر کہتے ہو۔ کہ مَیں نے خواب دیکھا ہے"۔ وُہ ذرا ٹھہری۔ اور پھر کہنے

تھی: "دُنیا میں عجیب عجیب قسم کے انسان آباد ہیں"۔

چند منٹ کے بعد ہم "قصرِ سفید" کے دروازے پر پہنچ گئے۔ رحیلہ چچاجان کے پاس چلی گئی۔ اور میں اپنے کمرے میں پہنچ کر کوچ پر لیٹ گیا۔ پُراسرار اجنبی کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اس نے کتنی مفتونیت بھری نظروں سے رحیلہ کو دیکھا تھا۔ آخر وہ پل پر کھڑا ہی کیوں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ وہاں کھڑا ہوا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک مجھے کل رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ کیا یہ دریا کے پل والا اجنبی وہی اجنبی تو نہیں۔ جو رات چچاجان کے قتل کی نیت سے محل میں آیا تھا ــــــ؟؟ انہیں اضطراب افزا خیالات کو دماغ میں لئے ہوئے میں سو گیا۔ صبح طبیعت بہت خراب تھی۔ اس لئے کمرے میں پڑا رہا۔ اور ایک دلچسپ ناول پڑھتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب بابا جوزی میرے کمرے میں آیا:

"کیا بات ہے سرکار آج اس وقت تک آپ کمرے میں پڑے رہے۔ صبح آپ ہمارے ساتھ سیر کو بھی نہیں گئے؟"

"رحیلہ سیر کو گئی تھی؟" میں نے پوچھا:

"جی ہاں۔ اور راستے میں ہمارے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ کہ پل پر سے ایک شخص تیزی کے ساتھ گاڑی کے آگے سے گزرنے لگا۔ میں نے سرکار بہتیری کوشش کی۔ کہ گھوڑے ٹھہر جائیں۔ مگر اُس بیچارے کی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ گھوڑوں سے ٹکرا کر ایک پتھر کے اُوپر گر پڑا۔ بیچارے کے کافی زخم آئے تھے۔ اور بیہوش تھا۔ میں نے اور رحیلہ نے اُسے گاڑی میں لٹا دیا۔ اور یہاں لے آئے۔ ڈاکٹر نے اُس کے زخموں پر پٹیاں باندھ دی ہیں۔ اور اب اُسے ہوش ہے"۔

یہ سُن کر میں نے جلدی سے کپڑے بدلے۔ اور جوزی کو ساتھ لئے ہوئے اجنبی کے کمرے کی طرف چلنے لگا معلوم نہیں میرا دل کیوں دھڑک رہا تھا۔ جونہی میری نظریں اس شخص پر پڑیں۔ جو پلنگ کے اُوپر لیٹا ہوا تھا غصہ، اضطراب کے جذبات میرے دل و دماغ پر چھا گئے۔ یہ وہی شخص تھا۔ جسے کل پل کے قریب میری نگاہوں نے دیکھا تھا۔ اور شاید پرسوں رات چچاجان کے قتل کی نیت سے محل میں آیا تھا ــــــ رحیلہ اس کے پاس بیٹھی ہمدردانہ نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اجنبی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا:

"بیچارے کو بہت چوٹیں آئی ہیں۔ جوزی گاڑی روک نہ سکا۔ مرہم پٹی کر دی ہے۔ اب نیم بے ہوشی کی حالت

ہیں ہے"۔ رحیلہ نے کہا!

مَیں خاموشی سے اجنبی کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا۔ اجنبی نے آنکھیں کھولیں، اور متحیرانہ میری جانب دیکھا۔ پھر رحیلہ کو ـــــ مگر اب اُس کی آنکھوں میں حیرت کی بجائے ممنونیت اور محبت تھی۔ اُس کے لبوں پر تبسم ظاہر ہُوا:
"محترمہ! اُس نے کمزور آواز میں کہنا شروع کیا۔" مَیں آپ کا بہت ممنونِ احسان ہُوں۔ کہ آپ نے میری جان بچائی"۔

"کوئی بات نہیں" رحیلہ نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہُوئے اور الماری میں سے دوا کی شیشی نکالتے ہُوئے کہا۔ "آپ مہربانی فرما کر خاموش رہیں۔ اِس طرح آپ بہترین شکریہ ادا کر سکتے ہیں، ہاں اب دوا پی لیجئے"۔

رحیلہ گلاس میں دوا ڈال کر اُس کے پاس گئی۔ مگر وُہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مَیں نے یہ انسانی ہمدردی کا تقاضا سمجھا، کہ اس کی تیمارداری کروں۔ آخر اُس نے مجھے کیا تکلیف پہنچائی تھی۔ کیونکر یقین کروں، کہ یہ وُہی اجنبی ہے۔ جو اس رات چچا جان کے قتل کی نیت سے محل میں آیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے دِل سے غصہ و نفرت کے جذبات جو اُسکی طرف سے تھے۔ بہت حد تک دُور ہو گئے۔ مَیں نے جوزی کو ڈاکٹر کے لانے کے لئے کہا۔ اور خود اُس کے چہرے پر جُھکا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے ممنونیت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میں نے اشارے سے اُسے خاموش کر دیا ــــ!

رحیلہ بہت جانفشانی کے ساتھ ناصر (یہ اجنبی کا نام تھا) کی تیمارداری کرنے لگی۔ اور میں بھی۔ کیونکہ یہ انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ وُہ میرے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتا تھا۔ جب میں اس کے کمرے میں جاتا۔ ناصر بخندہ پیشانی مجھ سے ملتا۔ ایک ہفتہ تک وُہ صاحبِ فراش رہا۔ اب زخم قریباً مُندمل ہو چکے تھے۔ صرف نقاہت باقی تھی۔ وُہ بھی کم ہو رہی تھی۔ چند دن کے بعد اُسے بالکل صحت ہو گئی۔ ہفتہ کی صبح کو میں بستر سے اُٹھا۔ سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ اور سینے میں بھی جلن سی تھی۔ مَیں کمرے سے نکل کر آہستہ آہستہ باغ کی طرف چلنے لگا۔ بادِ نسیم کے سرد جھونکوں نے رُوح میں تازگی پیدا کر دی۔ اور میرا درد بہت حد تک کم ہو گیا۔ یکایک میرے کانوں میں رحیلہ کے قہقہوں کی آواز آئی۔ مَیں نے دیکھا۔ کہ پاس ہی چند قدم کے فاصلے پر رحیلہ اور ناصر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور بار بار جوزی ہاتھوں کو حرکت دے دے کر کچھ کہہ رہا ہے۔ غالباً وُہ اپنے واقعاتِ زندگی سُنا رہا تھا۔ اس وقت میری عجیب حالت

تھی۔ اُنہوں نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں درختوں کے ایک کنج میں تھا۔ میں آگے بڑھا۔ اور اُن کے قریب ہی ایک جھنڈ میں کھڑا ہو کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ بابا جوزی اپنے سیاحت کے کارنامے سُنا رہا تھا۔ اور رحیلہ اُنہیں حسبِ عادت، بہت دلچسپی سے سُن رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اُن کے پاس پہنچا۔ رحیلہ نے مُسکرا کر مجھے دیکھا۔ اور کہا:۔

"نعیم! تم کمرے میں تھے؟ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ مگر کوئی آواز نہ آئی"۔

"میرے سر میں درد تھا"۔

"سر میں درد کیوں نہ ہوتا ——— ؟ تم ہمارے ساتھ سیر کرنے جو نہیں گئے"۔ رحیلہ نے بھولے پن سے کہا۔

"اب کیا حال ہے"؟ ناصر نے پُوچھا۔

"اب تو آرام محسوس ہوتا ہے"۔

"سرکار! ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ جبھی تو یہ تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ کئی بار کہا۔ کہ اتنا کام نہ کیا کیجئے"۔ بابا جوزی نے بزرگانہ و مشفقانہ لہجے میں کہا۔ اور ———

"اور اپنا کام بابا جوزی سے کروا لیا کیجئے"۔ رحیلہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"یہ میں نے کب کہا"؟ بابا جوزی نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہُوئے کہا۔

"تو اور کیا"؟

دو تین لمحے خاموشی طاری رہی۔ ناصر اُٹھا۔ اور یہ کہہ کر کہ "میں ایک ضروری کام کے لئے جاتا ہوں"۔ چلا گیا۔ بابا جوزی بھی کسی کام کی غرض سے چلا گیا۔ اب میں اور رحیلہ رہ گئے۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ رحیلہ سے کیا کہوں۔ اور کیا نہ کہوں۔ وفورِ جذبات سے میرا سینہ متشنج تھا۔ میں اِسی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ رحیلہ بولی: "تمہیں ایک نہایت جانفزا خوشخبری سناؤں"؟

"میرا دل خون ہو رہا ہے۔ اور تمہیں خوشخبریوں کی پڑی ہُوئی ہے"۔ میں نے غصے سے کہا۔

"کیا کہا"؟ رحیلہ نے مبہوت و ششدر نظروں سے مجھے دیکھا۔ اُسے گمان تک بھی نہیں تھا۔ کہ ایسے الفاظ میری زبان سے نکل سکتے ہیں۔

"اگر مجھ سے طبیعت سیر ہو چکی ہے۔ تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ یہ دِل آزار رویہ مجھے پسند نہیں"۔

"کون سا رویہ"؟

"ہر وقت ناصر کے ساتھ رہنا"۔

یہ سنکر وُہ خاموش ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ آہ! آنسوؤں کے وُہ شفاف قطرے اُسکی لانبی سیاہ پلکوں پر شام کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے درختوں کے اُوپر سفید بادلوں کے ہجوم کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عورت کے آنسوؤں میں کتنی طاقت ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہؤا۔ کہ میرے غم و غصہ کی کثافتیں اِن چند آنسوؤں میں بہہ گئی ہیں۔

"تم رونے کیوں لگیں رجیلہ"!

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں"؟

کتنے بھولے پن کا انداز تھا۔ مَیں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور کہنا شروع کیا:۔

"رجیلہ میں تمہاری عزت پر کبھی حملہ نہیں کر سکتا ـــ"!

"کیا یہ محبت کا تقاضا ہے۔ کہ کسی کے شیشۂ دِل کو اِس بیدردی سے چُور چُور کر دیا جائے"؟ اس نے گلوگیر آواز میں کہا:

"تم حقیقت بتا دو"۔

"کیسی حقیقت"؟

"ناصر ـــ"!

"کیا ناصر"! اب اُسکی آواز میں خفگی بھی تھی۔ "ہماری گاڑی نے اُسے بُری طرح زخمی کیا! کیا ہمارا فرض نہیں تھا۔ کہ اس کی تیمارداری کرتے۔ یہ انسانی فرض تھا۔ مَیں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے"۔ اُس کی آواز سے صمیمیتِ قلبی مترشح تھی۔ اور اُس کے آنسو تھے۔ کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

"مجھے افسوس ہے۔ کہ تمہارا دِل دُکھایا۔ اب میرے دِل سے تمام شبہات نکل چکے ہیں"۔ اور واقعی طمانیتِ

باطلہ کا ہجوم میرے دل سے دُور ہو چکا تھا۔ رحیلہ تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی:

"اب ناصر کہاں گیا ہے"؟ میں نے پُوچھا:

"وُہ کہہ رہا تھا۔ کہ اب مجھے یہاں سے رخصت ہونا چاہیئے۔ شام کو یہاں سے چلا جائے گا۔ شاید چلا بھی گیا ہو ——"

"اچھا اب وُہ خوشخبری سُناؤ۔ مگر ٹھہرو۔ پہلے مُسکرا لو۔"

"نہیں میں ایسے دل آزار بدگمان کو کوئی خوشخبری سُننے کا اہل نہیں سمجھتی"۔ اس نے مُسکرا کر کہا۔ اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے تھے۔ اور لبوں پر تبسّم کی مدھم سی لہریں۔ آہ۔ وُہ کیا منظر تھا۔ رحیلہ اسوقت کتنی پیاری دکھائی دیتی تھی:

"شرط پُوری ہو گئی۔ اب خوشخبری سناؤ"

"میں نے کوئی شرط ورط پوری نہیں کی"۔ رحیلہ نے مُسکرا کر کہا:

"ایک دفعہ کی بجائے تم دو دفعہ مسکرائیں۔ کیا اب بھی شرط پُوری نہیں ہوئی"؟

"خیر ——" وُہ ذرا رُکی۔ رُومال سے اپنے آنسو پونچھے۔ پھر کہنے لگی۔ "اباجان نے اجازت دے دی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کہ تم پھُولوں کے دو تین اَور باغ لگوا لو"؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"اگر اس طرح الفاظ کاٹو گے۔ تو میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی"؟

"میں نے یہی سمجھا"

"تم تو ہر وقت غلط سمجھتے ہو۔ تمہارا کیا ہے۔ اب سُنو۔ اباجان نے اجازت دیدی ہے۔ کہ میں اور جوزی بابا، چچا غیاث کے ساتھ امسر جا سکتے ہیں۔ وہ کل صبح کو جا رہے ہیں۔ ہم بھی اُن کے ساتھ جائیں گے۔ اور سُنو ہمارے ساتھ ایک اَور شخص بھی ہو گا ——"

"وُہ کون ——؟" میں نے پُوچھا:

"جانے دو۔ وُہ بڑا وہمی انسان ہے۔ میں تو اب اُس سے ڈرنے لگی ہوں"

"سمجھ لیا، چچا جان نے اس کی بھی اجازت دے دی ہے؟"

"کہہ تو دیا۔ وُہ خوبصورت سا آدمی بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

غیاث میرا اور رحیلہ کا چچا تھا، جو مصر میں رہتا تھا۔ اِن دنوں ہمارے ہاں آیا ہوا تھا۔ تین ہفتے رہنے کے بعد اب شام کو وُہ جا رہا تھا۔ مجھے اور رحیلہ کو مصر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور ہم نے کئی بار چچا جان سے کہا بھی کہ ہمیں چچا غیاث کے ہاں چند دنوں کے لئے بھیج دیں، مگر وُہ انکار ہی کرتے رہے۔ اس لئے چچا غیاث کو ہم نے خط لکھا۔ کہ ہمیں لینے کے واسطے آئیں۔ یہ سُن کر کہ چچا جان ہمیں چچا غیاث کے ساتھ مصر بھیج رہے ہیں مجھے بیحد مسرت ہوئی۔ ہم ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھے سفر کی تیاریوں کے متعلق غور کرتے رہے۔ اس کے بعد محل میں آ گئے۔۔۔!

بابِ چہارم

مصر کو روانگی

اب دیکھئے کیا حال ہمارا ہو سحر تک ‌ ‌ ‌ بھڑکی ہوئی اِک آگ سی ہے دل سے جگر تک

تمام دن میں اور رحیلہ سفر کی تیاریوں اور چچا غیاث سے مصر کے حالات پوچھنے میں مشغول رہے ۔۔۔ اور رات کو اپنے کمرے میں جا کر کوچ پر لیٹتے ہوئے میں مصر کے ازمنۂ ماضیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے لگا۔ میری نگاہیں کتاب کی سطروں پر جمی تھیں۔ اور خیالات مصر کے رومانوی مناظر سے ہم آغوش ۔۔۔ رات کے حصۂ آخریں میں خلافِ توقع میری آنکھ لگ گئی۔ اور میرے خیالات دریائے نیل کی خنک موجوں سے ہمکنار ہو گئے۔ صبح جب آفتاب قصرِ سفید کے سامنے ، بلند پہاڑ کے پیچھے سے اُبھر رہا تھا، ہم مصر کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں کوئی خلافِ معمول واقعہ پیش نہ آیا۔ میری دُنیا۔ آہ میری دُنیا، جسے چند دن کے بعد آتشکدۂ غم، گریہ زار، ماتم بننا تھا۔ اس وقت فردوسِ مسرت اور جنتِ راحت بنی ہوئی تھی۔ جہاز افق کی جانب بادبان پھیلائے، سمندر کی نیلگوں سطح پر ہچکولے کھاتا

ہوا بڑھ رہا تھا۔ اور میرا دل زریں مستقبل کی خوابناک فضاؤں کے آغوش میں محوِ پرواز۔۔۔! اگر انسان کی نگاہیں ہر اُس واقعہ کو دیکھ لیتیں۔ جو ابھی مستقبل کے غار کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے، اور عنقریب تباہیوں اور بربادیوں کا ہجوم دامن میں لئے اس کی زندگی پر حملہ کریگا۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا۔ کہ اُس کے قہقہوں کے عقب میں کتنے دردناک آنسو اس کے منتظر ہیں، اگر اُسے اس حقیقت کی خبر ہوتی۔ کہ اسکی امیدوں اور اس کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کے واسطے کتنی ہولناک نا اُمیدیوں اور نامرادیوں کے آہنی پنجے تیار ہو رہے ہیں، آہ اگر اسے اس کا پتہ ہوتا۔ کہ ہر قہقہۂ مسرت ایک نالۂ خونیں، ایک پارۂ آہ اپنے ساتھ لائے گا۔ تو یہ بدنصیب ہستی ایک لمحے کے واسطے بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ یہ ہماری خوش آئند امیدیں ہیں۔ جو ہمارا ہاتھ تھامے، مستقبل کے سہانے خواب دکھاتے، زندگی کے تنگ و تاریک راستے پر لئے جا رہی ہیں۔ چند دن کے بعد ہم دریائے نیل کی سیر کر رہے تھے، دریائے نیل جس کی لہروں نے ہزارہا مخلوقِ خدا کی گردنیں قہار و جبار خداؤں کی عظمتوں کے سامنے جھکتے ہوئے اور خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے مغرور انسانوں کی ذلیل زندگیوں کو موت کے پنجے میں سسکتے ہوئے دیکھا ہے۔ دریائے نیل جس کے قطرے قطرے میں افسانہائے عشق و محبت دفن ہیں۔ اپنے تمام اقتدار و عظمت کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے بہ رہا تھا۔ میری نگاہِ تصور نے وادیٔ مصر کی حسین ساحرہ کو دیکھا۔ کہ بصد طنطنہ و طمطراق دلیر سپاہیوں کے درمیان سنہری رتھ پہ بیٹھی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ یکایک تصور نے ایک اور پردہ اٹھایا۔ میں نے دیکھا۔ کہ یہی حسین شہزادی جس نے روما کی قسمت کو بدل دینے والے دو جلیل القدر جرنیلوں کی قسمت کو چشم زدن میں بدل دیا تھا۔ اپنے آپ کو ایک زہریلے سانپ سے ڈسوا رہی ہے۔۔۔ اُف یہ منظر کتنا دردناک تھا، میں انہی خیالات میں مستغرق تھا۔ کہ رجیلہ نے میرے شانوں پہ ہاتھ رکھدیا۔ اور کہا:۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"میری نظروں میں اس وقت انطونی و قلوبطرا کے دردناک واقعاتِ عشق پھر رہے ہیں۔"

"خوب تمہیں بہت دور ہی کی سوجھتی ہے۔" یہ کہکر اُس نے چچا غیاث سے کہا۔ "چچا جان! میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب گھر چلیں۔"

"چلو۔ نعیم کو بھی بھوک لگی ہوگی، کیوں نعیم؟" مگر میں خاموش رہا!

ہم چچا غیاث کے گھر پہنچے۔ یہ ایک وسیع مکان تھا جس کے پہلو میں ایک مختصر سا باغ تھا۔ کھانا کھا کر ہم وہیں جا پہنچے۔ اور چچا غیاث ہمیں گزشتہ واقعات سنانے لگے۔ ان کی آواز میں کافی دلکشی و شیرینی تھی۔ اور جو واقعات وہ سنا رہے تھے۔ از حد دلچسپ تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ تو چلے گئے۔ اور چچی جان تشریف لے آئیں۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے پاس سے آ رہی تھیں۔ وہ بیحد متواضع اور منکسر المزاج عورت تھیں اور ان کی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ اب رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ اس لئے ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں ایک تو تھکا ہوا تھا۔ دوسرے فکر بھی کوئی نہیں تھی، اس لئے خوب نیند آئی۔ ابھی سو ہی رہا تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو رحیلہ اور بابا جوزی مسکراتے ہوئے آئے:

"تمہیں یہاں اس لئے تو نہیں لایا گیا۔ کہ صبح کے نو بجے تک پاؤں پھیلائے سوتے رہو۔" رحیلہ نے شرارۃً کہنا شروع کیا۔ "زیادہ نیند اچھی نہیں جسم میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے۔ آئندہ صبح سویرے اٹھا کرو ——!" اس نصیحت پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"میں سو تو نہیں رہا تھا۔" میں نے کہا:

"تم سو تو نہیں رہے تھے۔ اسی لئے ہم دروازے پر پانچ منٹ تک دستک دیتے رہے۔ اگر تم سوئے ہوتے۔ تو خدا جانے کتنے گھنٹے صرف ہو جاتے۔"

چچا غیاث بھی وہیں آ گئے۔ چند منٹ باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد وہ دفتر چلے گئے۔ اور ہم اپنی سیر کا پروگرام مرتب کرتے رہے۔ رحیلہ مصر تھی۔ کہ اسی وقت اہرام مصر کے دیکھنے کو جانا چاہیئے۔ اس کے برعکس میری رائے تھی کہ وہاں چاندنی رات میں جانا چاہیئے۔ کیونکہ چاندنی رات میں اس کے نظارے کا عجیب لطف ہوگا۔ بابا جوزی نے رحیلہ ہی کی تائید کی، بالآخر یہ طے پایا۔ کہ رات ہی کے وقت جانا چاہیئے خوش قسمتی سے اس دن مہینے کی تیرہ تاریخ تھی۔ تمام دن ہم ادھر ادھر تاریخی مقامات دیکھتے رہے۔ رات کو وہاں گئے، چاندنی میں عظیم الہیاۃ مجسمے کھڑے تھے۔ آسمان پر بڑا سا چاند چمک رہا تھا۔ میں رحیلہ اور بابا جوزی ایک مجسمے کے پاس ٹہل رہے تھے۔ کہ یکایک ہمارے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ایک انسانی صورت نمودار ہوئی۔ "یہ کون ہے"؟ میری زبان سے نکلا۔

"مجھے کیا معلوم"۔ رحیلہ نے بے پروائی سے کہا۔ اُس نے اس طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر پہچان لیا ——— یہ سوائے ناصر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا۔ اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"برادرِ محترم! میری خوش قسمتی تھی۔ کہ آپ سے مل سکا"

رحیلہ نے متحیرانہ اُسے دیکھا۔ اور کہا:-

"ناصر صاحب! آپ یہاں کیسے آئے"؟

"یونہی۔ سیر کے واسطے۔ اور آپ بھی غالباً سیر ہی کے لئے آئے ہیں"۔ اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا!

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک منٹ یونہی گزر گیا۔ میں اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مُسکرا مُسکرا کر مجھے ——— ! معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ کہ رحیلہ نے قفلِ خاموشی توڑتے ہوئے کہا:-

"ناصر صاحب! آپ یہاں کسی رشتہ دار کے ہاں فروکش ہونگے"؟

"جی ہاں! ایک دُور کے رشتہ دار کے یہاں۔ اور آپ نعیم صاحب! کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں"؟؟

"یہاں ہمارے ایک چچا ہیں، اُن کے مکان پر ہیں"!

"آپ اگر بُرا نہ منائیں۔ تو کل صبح میرے ہاں ضرور آیئے۔ آپ منظور کر لیں۔ تو میں آپ کو لینے آجاؤں۔ اپنا پتہ بتا دیجئے"!

"آپ کیوں اتنی تکلیف کرتے ہیں"! میں نے کہا!

"یہ تکلیف میرے لئے عین مسرت ہو گی۔ آپ نے، بالخصوص مس رحیلہ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہوا ہے"۔

میں نے اُسے حوعاؤ کر ہا گھر کا پتہ بتایا۔ اور وہ چند باتیں کر کے چلا گیا۔ اور ہم بھی اپنے گھر واپس آگئے۔

دوسرے دن ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ کہ ناصر آموجود ہوا۔ اور ہمیں ساتھ لے کر ایک عالیشان مکان میں پہنچا۔ مکان کے اردگرد باغات تھے۔ جن کی دیواروں پر انگوروں کی لمبی لمبی بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ ناصر کے علاوہ وہاں ایک عورت بھی تھی۔ دو گھنٹے ہم وہاں رہے۔ ناصر نے ہماری بہت خاطر مدارات کی۔ شجاع آباد کے بڑے سے بڑے امیر

آدمیوں نے بھی ہماری اتنی تواضع نہیں کی تھی۔ جتنی ناصر نے کی ـــ!

دوسرے دن وُہ ہمارے ہاں پھر آیا۔ اور پھر تو بلا ناغہ ہی آتا رہا۔ دن گزرتے جاتے تھے۔ اور ناصر کے چچا غیاث کے ہاں تعلقات بڑھتے جاتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ بعض اوقات وُہ راتیں بھی ہمارے ہاں ہی گزارنے لگا:

ہمیں مصر آئے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ ناصر نے چچا غیاث کی نظروں میں بہت وقعت حاصل کر لی تھی۔ اور رحیلہ تو اس کی عدم موجودگی میں بیقرار سی نظر آتی۔ اور جب میں اس کی بیقراری کی وجہ پوچھتا۔ تو جواب دیتی۔ کہ ناصر کی پُر لطف گفتگو سے اِس وقت محروم ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ناصر کی باتوں میں ساحرانہ کشش تھی۔ اور اُس کا لہجہ اتنا شیریں ہوتا تھا۔ کہ ہر اجنبی قدرتی طور پر اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ شکل و صورت بھی نہایت اچھی تھی۔ علمیت بھی امتیازی۔ اور ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر یہ کہ وُہ موسیقی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اس کی آواز بیحد سریلی اور دلکش تھی جب کبھی وُہ میری نظروں کے سامنے آتا۔ تو غم و غصہ کی لہریں میرے دل و دماغ میں دوڑنے لگتیں۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں تنہا اپنی موجودہ اضطراب افزا حالت پر غور کر رہا تھا۔ کہ رحیلہ آئی۔ اور میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

"آج کل تم اُداس نظر آتے ہو؟" یہ کہکر قدرے وقفے کے بعد وُہ بولی "کیا کرتے رہتے ہو؟"

"اور تم کیا کرتی رہتی ہو؟" میں نے اس کی جانب نظر اٹھائے بغیر کہا:

"کیا کرتی ہوں"؟

"اپنے دل سے پُوچھو!"

"تمہیں کہو!"

"رحیلہ!" میں نے غضبناک آواز میں کہنا شروع کیا۔ "حالات بہت متغیر ہو چکے ہیں۔ مجھے جس نے تم سے اتنی محبت کی، اتنی محبت کر رہا ہے، تم دھوکا دے رہی ہو۔ میں تمہیں اب ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اور ناصر کی موجودگی تمہیں ہر وقت پسند ہے ـــ"

اُس نے کانپ کر میری طرف دیکھا:۔

"نعیم! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ بھی نہیں سمجھی"۔

"میں کہتا ہوں۔ کہ ناصر سے ملنا تو کجا اب اس کا نام بھی میرے سامنے نہ لینا"۔

"کیوں؟ میں اُسے بھائی سمجھتی ہوں نعیم! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنی خوفناک نظروں سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو"؟

"میں نے جو کچھ کہدیا ہے وہی ہو گا"۔

رحیلہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اشکوں کے بڑے بڑے قطرے اس کی لانبی لانبی پلکوں سے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ چند لمحے بالکل خاموشی طاری رہی،

"رحیلہ! تم اُسے بھائی سمجھتی ہو۔ یہ ممکن ہے۔ مگر اس کا مجھے کیونکر یقین آئے۔ کہ وُہ بھی تمہیں بہن سمجھتا ہے، تم بھولی بھالی ہو، زمانے کی چالوں سے ناواقف، مگر رحیلہ! تم روتی جا رہی ہو۔ کیا اب تمہیں مجھ سے محبّت نہیں رہی"؟

"نہیں نعیم"! اُس نے گلوگیر آواز میں کہنا شروع کیا: "مجھے تم سے پہلے کی طرح محبّت ہے، میں تمہاری ہوں، اور تمہاری ہی رہوں گی ـــ آہ تم میرا دل کیوں توڑ دیتے ہو"!

میرا دل نرم ہو گیا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ مگر اُس کے آنسو تھے۔ کہ برابر بہہ رہے تھے!

"تم روتی کیوں جاتی ہو"؟

"نہیں، میں تو نہیں رو رہی"؟

"تو اَور کون رو رہا ہے"؟

"یونہی آنسو ٹپک رہے ہیں۔ لو اب میں نہیں روتی"۔

آہ یہ وہی رحیلہ تھی۔ جو بات بات پر ظرافت کے پھول کھلایا کرتی تھی۔ اور وہی رحیلہ تھی۔ جس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ عورت کس قدر کمزور فطرت ہے ـــ چند لمحے ہم وہاں بیٹھے رہے۔ اور اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب وُہ جانے لگی۔ تو میں نے کہا:۔

"نہیں اب گھر جانا چاہئیے، یہاں زیادہ عرصہ ٹھہرنا مناسب نہیں"!

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"!

ہم شام ہی کو رخصت ہو جائینگے۔"

بابِ پنجم!

آرزوؤں کا خون

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل　　چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں!

اس دن تو چچا غیاث نے ہمیں جانے کی اجازت نہ دی۔ البتہ دوسرے دن شام کے وقت ہم مصر سے روانہ ہو گئے۔ اور ناصر کو اس کے متعلق خبر تک بھی نہ ہوئی۔ میں نے چچا غیاث سے کہدیا تھا۔ کہ جب وہ آئے۔ تو کہدیجئے کہ ہم چلے گئے ہیں۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ جب ہم قصرِ سعید میں پہنچے۔ تو چچا جان نے رحیلہ سے مل کر بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ انہیں مجھ سے انتہا درجے کی محبت تھی۔ کچھ اس لئے کہ میرے والدین فوت ہو گئے تھے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ میں اُن کا بہت فرمانبردار تھا۔ محل میں آئے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ ہو گیا۔ کہ ایک شام ——— ایک منحوس شام کو میں رحیلہ کے کمرے میں گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ میں سمجھا۔ کہ باغ میں ہو گی۔ اس لئے سیدھا باغ کا رُخ کیا۔ میں محبت کے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ کہ میری نظروں نے ناصر کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور جو ملتجیانہ انداز میں رحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ ——— رحیلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا ——— اقرارِ محبت ——— کیا یہ اقرارِ محبت تھا ———؟ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دُنیا ہیبت ناک تاریکیوں میں گم ہوتی نظر آئی۔ میں نے دوبارہ انہیں دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ اور سیدھا کمرے میں پہنچا۔ قلم اُٹھایا اور رحیلہ کے نام خط لکھا:-

میں آج جا رہا ہوں۔ کہاں؟ یہ نہیں کہہ سکتا۔ اطمینان رکھو آئندہ تم میری منحوس شکل کبھی نہ دیکھو گی۔ تمہاری محبت ہی میرے لئے سب کچھ تھی۔ اور جب یہ چیز مجھ سے چھن گئی۔ تو پھر میرا اس دُنیا میں رہنے سے کیا فائدہ؟ میری آمد کی اب توقع نہ رکھنا۔ تمہارے راستے سے ہٹ

رہا ہوں:- بد قسمت :-

"نعیم"

یہ کاغذ ملفوف کر کے میں نے نوکر کو دیا۔ کہ جلدی رجیلہ کو پہنچا دو۔ اور خود کمرے سے نکل گیا، پورے پانچ مہینے ہندوستان کے ممالک میں پھرتا رہا۔ میرا بے چین دل مجھے اس وسیع دُنیا کے کونے کونے میں لے گیا۔ دل کو سمجھاتا تھا کہ رجیلہ دغاباز ہے، فریب کار ہے، بے وفا ہے۔ مگر معلوم نہیں کوئی طاقت میرے دل میں ان خیالات کی تردید کر رہی تھی۔ میرا ضمیر بعض اوقات مجھے ملامت کرتا کہ میں نے اس پر ظلم کیا ہے۔ پانچواں مہینہ قریب الاختتام تھا۔ کہ میں نے خواب میں رجیلہ کی چیخوں کی آواز سُنی۔ میں اسی وقت اُٹھا اور ایک فوری جذبے کے ماتحت شجاع آباد کا رُخ کیا۔ جس وقت میں 'قصرِ سفید' میں پہنچا۔ سورج نہیں نکلا تھا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ تاکہ کم از کم منہ ہاتھ تو دھولوں۔ تھکاوٹ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ یکایک میری نگاہ میز پر پڑی۔ ایک کونے میں ایک لفافہ پڑا تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ لفافے کی رنگت و حالت سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ عرصے سے میز پر پڑا ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے چاک کیا۔ اور پڑھنے لگا۔ اس میں عبارت تھی :-

خوش قسمت دوست!

معاف کرو کہ میں تم سے دغا کرتا رہا۔ آہ! میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اور دل محبت سے مجبور! میں نے رجیلہ سے محبت کی، اور اب بھی محبت کرتا ہوں، مگر میری محبت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل میں نے اُسے رات کے وقت قصرِ سفید میں دیکھا، جب میں تمہارے چچا کے قتل کی نیت سے آیا تھا۔ رجیلہ کی جُرأت و بیباکی نے میرا دل موہ لیا۔ اس کے بعد میں پل پر ملا۔ اور دوسرے دن بھی پل ہی پر ملا۔ میں رجیلہ کی گاڑی سے جان بوجھ کر زخمی ہوا تھا۔ تاکہ اُس سے ملنے کا، یا کم از کم اس کی نظروں میں آجانے ہی کا موقعہ مل جائے۔ مجھے موقعہ ملا۔ رجیلہ نے بہت ہمدردی .... اور بہت جانفشانی سے میری تیمارداری کی۔ اس کے بعد جب میں نے سُنا۔ کہ تم مصر جا رہے ہو۔ تو میں بھی وہیں پہنچا۔ آہ! وہاں رجیلہ کے لئے میرے دل میں محبت اور بڑھ گئی، میں نے کئی بار چاہا۔ کہ اظہارِ محبت کروں۔ مگر ڈرتا

رہا۔ میں نے ایک لفظ بھی اس قسم کا زبان سے نہ نکالا۔ اگرچہ وہاں مجھے بہت مواقع حاصل تھے۔ جب تم یہاں آگئے، اور میں بھی۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ رحیلہ کے بغیر میں انتہائی طور پر بیقرار ہوں۔ اس لئے آج تمہاری عدم موجودگی میں میں نے یہاں آ کر اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ میری امیدیں تمام خاک میں مل گئیں۔ کیونکہ وہ مجھے صرف بھائی سمجھتی تھی، اُس نے کہا۔ کہ میں نعیم ہی کی ہوں۔ اور دم واپسیں تک نعیم ہی کی رہونگی۔ یہ سُن کر میں نے کہا۔ کہ کم از کم مجھے اپنی صورت کے دیکھنے سے تو محروم نہیں کرو گی۔ اُس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ آخر میں مَیں نے پوچھا۔ کیا میں چلا جاؤں۔ آہ! اُس نے اس پر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ اور میری تمام آرزوں کا خون ہو گیا۔ میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گا!
میرے دوست مجھے معاف کر دو۔ میں مصر جا رہا ہوں۔ کیونکہ وہاں زندگی کے کئی پُر مسرت لمحے رحیلہ کی صحبت میں گزارے تھے۔ انہیں لمحوں کی یاد میری زندگی ہے ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں　　　انہیں کی یاد میری زندگی ہے

کاش تم میری خطا کو معاف کر دو۔ دوست! میں تمہاری خوش قسمتی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں تم یہ معلوم کر کے بھی حیران ہو گے۔ کہ مَیں کون ہوں، میں تم سے بمنت التماس کرتا ہوں۔ کہ یہ راز تمہیں تک رہے"

تمہارا قابلِ رحم دوست

ناصر یعنی ثروت خاں"

تاریخ پر نظر پڑی۔ تو وہاں اسی دن کی تاریخ لکھی تھی۔ جس دن میں "قصرِ سفید" سے چلا گیا تھا۔ اور جس دن میں نے ناصر اور رحیلہ کو باغ میں دیکھا تھا۔ اصلی واقعات آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ایک منٹ تک تو میں حیران و ششدر کھڑا رہا۔ رحیلہ پر میں نے ظلم کیا تھا ــــ اور یہ ناصر ــــ رشدی، اُف امیر بیدار بخت کا بیٹا تھا ــــ؟ میں کمرے کے دروازے سے نکلنا چاہتا تھا۔ کہ بابا جوزی مغموم سر جھکائے ادھر سے گزرا۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا۔ غصہ و نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا ــــ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:-

"اب کیوں آئے ہو۔ رحیلہ کی جان تو لے لی —!"

"رحیلہ کو کیا ہُوا؟"

"رحیلہ قریبِ مرگ ہے۔ میری مالکہ — میری پیاری بچّی دنیا سے رخصت ہو رہی ہے"۔

"وُہ ہے کہاں۔ مجھے جلدی اُس کے پاس لے چلو!"

"اپنے کمرے میں"۔

میں تیزی سے اس کے کمرے میں پہنچا۔ قریبِ مرگ رحیلہ کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ اس کے پاؤں پر گر پڑا!

"رحیلہ میں نے تم پر سخت ظلم کیا ہے۔ مجھے معاف کر دو!"

"نعیم اُٹھو!" اُس نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں دُنیا سے جا رہی ہوں۔ غم نہ کرو، جو ہُوا سو ہُوا"۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلونگا"۔

"نہیں نعیم! اگر تم نے خودکشی کی۔ تو میری روح کو سخت تکلیف پہنچے گی، نعیم! پیارے نعیم! الوداع —" یہ کہہ کر اس کی آواز رُک گئی — آہ! ہمیشہ کے لئے رُک گئی۔ میری باوفا محبوبہ مجھے اِس غمکدۂ دُنیا میں چھوڑ کر چل بسی!

اس کے بعد میں ایک ہفتہ تک بیمار رہا۔ سخت جان تھا، بچ رہا۔ آہ میں نے رحیلہ کی جان لی تھی۔ میری تحریر پڑھکر وُہ گھل گھل کر دُنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور میں — بدنصیب، بدقسمت انسان زندہ رہا!

آج رحیلہ کو دُنیا سے گزرے ہوئے پورے سات سال گزر چکے ہیں۔ میں ہر روز اپنی موت کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ آج وُہ دعائیں معلوم ہوتا ہے قبول ہو گئی ہیں، میرا جگر پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ شاید چند لمحے اَور زندہ رہوں گا۔ میری رحیلہ! تیرا بدنصیب عاشق تیرے پاس آرہا ہے!

سہ اشد! دیکھا کتنی دردانگیز داستانِ محبت ہے — بدنصیب نعیم، ابھی تک پشیمانی کے آنسو بہا رہا ہے۔ کیونکہ اُس کے مرقد سے ایک پودا نکل آیا ہے۔ جس کی شاخیں رحیلہ کے مزار پر جھکی ہوئی ہیں

صبح کے وقت شبنم آلود شاخیں ہوا کے تھپیڑوں سے لرز لرز کر اوس کے قطرے گراتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ نعیم کے آنسو ہیں۔ جنہیں وُہ رجیلہ کے قدموں پر نچھاور کر رہا ہے"۔
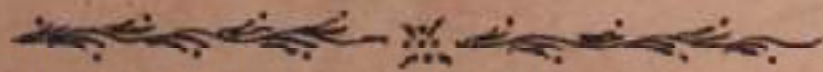
"صحرانورد"

صحرانورد کا دوسرا خط

پیارے دوست ——————!

میرا پہلا خط اور افسانہ امید ہے تم نے بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہوگا۔ اب حسب وعدہ دوسرا افسانہ بھیج رہا ہوں۔ پیارے دوست! اس دلدوز، دلخراش اور دلسوز افسانے نے جو کیفیاتِ الم اور تاثراتِ درد میرے دل و دماغ میں پیدا کئے ہیں۔ اُن کے اظہار سے میری زبان عاجز ہے، اور قلم یکسر قاصر! میں جب اس افسانۂ خونچکاں پر غور کرتا ہوں۔ تو ایک ایسی غم نصیب، اور بدقسمت ہستی کی تصویر میری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ جو ہر وقت اپنی آرزوں اور تمناؤں کی پائمالی پر ماتم کر رہی ہے، میرے کان صحرا کی وسعتوں میں اس کی درد سے بھری ہوئی چیخوں، اس کی خونِ جگر میں نہائی ہوئی آہوں۔ اور اُس کے خونابۂ دل سے سینچے ہوئے نالوں کی بے قرار اور قلب شگاف آوازیں سننے لگتے ہیں۔ یہ ہستی کون ہے؟ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔ مگر اس سے پیشتر میں تمہارا تعارف اپنے پیارے ساتھی آغا بہرام سے کراتا ہوں۔

آغا بہرام سے ملاقات اتفاقی بات تھی، اور اب وہ حقیقی معنوں میں میرا ساتھی ہے۔ آج سے ایک ہفتہ پیشتر میں صحرا نوردی کرتے کرتے پہاڑوں کے عقب میں ایک مختصر سی آبادی میں جا پہنچا۔ تھکا ماندہ تو تھا ہی۔ اس لئے ایک چھوٹے سے مکان میں صاحب خانہ کی اجازت سے لیٹ گیا۔ شام کے وقت جب میں سو کر اُٹھا۔ اور اپنے مہربان میزبان کو اپنے حالات زندگی اور اپنے مشاغل مخصوصہ بتائے۔ تو وہ بیحد مسرور ہُوا۔ اور مجھے ایک بوڑھے آدمی کے پاس لے گیا۔ جو میری طرح سیاحت کا بہت شائق تھا۔ یہ بوڑھا آدمی اس قدر دلچسپ اور شگفتہ مزاج نکلا۔ کہ میں اُس کی صحبت میں چند گھنٹے بسر کرنے کے بعد، اس کا مدّاح ہو گیا۔ اور ہر وقت اس کے ساتھ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ اور اب میرے پیارے راشد! یہ شخص میرا دوست، میرا ساتھی، اور میرا رہنما ہے۔ باور کرو، آغا بہرام جیسا دلچسپ

انسان ہیں نے تمام زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہ کبھی کبھی اجبکہ ہم دن بھر کی سیاحت سے تھک کر چور ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کے تحیّر زا واقعات سناتا ہے۔ اور پھر ایسے رنگین و دلآویز لہجے میں کہ میں تمام دن کی تکلیف بھول جاتا ہوں۔
اس کی داستانیں تمہیں سُناؤں گا۔ اس کا وعدہ کرتا ہوں۔ یقین ہے۔ تم انہیں میری طرح بہت پسند کرو گے۔
پرسوں صبح کے وقت جبکہ سورج کی ابتدائی کرنیں بلند درختوں کی پیشانی پر بوسہ زن تھیں۔ اور ہوا کی لہروں میں خوش الحان پرندوں کے معصوم زمزموں کا سیلاب بہ رہا تھا۔ ہماری نگاہوں نے دُور صبح کے دھندلکے میں ایک شکستہ قلعہ نما عمارت دیکھی۔ اس کے عین اُوپر ظلمت پوش مشرقی آسمان کی جبیں پر صبح کی روشنی یوں لرز رہی تھی۔ گویا ماضی کی تاریکی کے کثیف پردوں میں، کوئی گزشتہ سہانی یاد لوحِ حافظہ پر مرتسم ہے۔ میرے بوڑھے رفیق نے اس طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے دلکش انداز بیان میں کہنے لگا:۔
"اس سامنے کی عمارت میں رات تو کجا، دن کے وقت بھی کوئی جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ افواہ ہے۔ کہ یہاں رات کے وقت کوئی بدنصیب ہستی چیختی چلاتی رہتی ہے۔ معلوم نہیں یہ بدنصیب ہستی کون ہے۔ اور کس دکھ میں مبتلا ہے۔ پہلے یہاں اس عمارت کے قریب کچھ آبادی تھی۔ اچانک ایک زلزلہ آیا۔ اور تمام مکان گر پڑے۔ اس عمارت کو بھی ضعف پہنچا۔ میں کئی بار اس کے قریب سے گزرا۔ لیکن اندر کبھی نہیں گیا۔ سُنا ہے، ایک قافلہ رات کے وقت اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ کہ رونے کی آواز آئی۔ قافلے میں سے ایک آدمی اندر گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب اس کے ساتھی اندر پہنچے۔ تو اس کی نعش کو فرش پر پڑا ہوا پایا۔ اُس کے چہرے پر دہشت و خوف کے آثار موجود تھے۔ اس واقعے کے بعد کسی نے اندر جانے کی ہمت نہیں کی۔"
اب عمارت ہمارے قریب آگئی تھی۔ کسی زمانے میں بہت رفیع الشان ہوگی۔ مگر اب تو امتداد زمانہ کی دست درازیوں نے اس کا بہت سا حصہ گرا دیا تھا۔ اُس کے چاروں طرف جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اور عمارت کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا چشمہ بہ رہا تھا۔ ہم ڈرڈر کر جھجک جھجک کر عمارت میں گئے۔ سب سے پہلے ایک بہت بڑا صحن تھا جس میں دو نہریں بہ رہی تھیں۔ اور جن کا پانی بالکل سوکھ چکا تھا۔ فواروں کا کچھ کچھ نشان باقی تھا۔ جا بجا سُوکھے ہوئے پودے تھے۔ عمارت کے آخری گوشے میں ایک کمرہ تھا۔ یہ تھا اُس طلسمی عمارت کے اندرونی حصے کا نقشہ! ہم وہاں گھاس پر بیٹھ گئے۔ اور آغا بہرام، اپنی جوانی کا ایک دلچسپ واقعہ سنانے لگا۔

دو تین گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد ہم نے اس عمارت سے کچھ فاصلے پر اپنا خیمہ لگایا۔ شکار کیا۔ اور رات وہیں بسر کرنے کی ٹھان لی۔ شام کے وقت جبکہ تاریکی کے بادل فضائے صحرا پر منڈلانے لگے تھے۔ میں اپنے خیمے میں لیٹ گیا۔ اور خیمے کی کھڑکی میں سے شام کی ظلمت میں تیرتے ہوئے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ہوا کے آغوش میں سورج کی زرد زرد کرنوں سے ہلکی ہلکی سنہری جھالریں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی ۔۔۔! عجیب خاموشی!! میرا ساتھی سو چکا تھا۔ وہ بوڑھا ہے۔ سفر کی تکان اس کے قویٰ کو بہت جلد مضمحل کر دیتی ہے۔ اور اس وقت وہ خواب خرگوش میں محو تھا۔ کافی دیر لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر سوتا رہا جب میری آنکھ کھلی۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ہر شے پر طلسمی جمود طاری تھا۔ میرے دل میں ایک مبہم سی خواہش پیدا ہوئی۔ "اس عمارت میں کوئی روتا ہے؟ کیوں؟ معلوم نہیں۔ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟" اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں پھرنے لگے۔ میں ایک جذبۂ بے اختیار کے زیرِ اثر اٹھ بیٹھا۔ میرے قدم اس عمارت کی طرف اٹھنے لگے۔ چاندنی کی پھیکی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر وہ عمارت معلوم نہیں۔ کتنی خونچکاں داستانیں، کتنے درد انگیز افسانے اور کتنے تحیر زا راز اپنے سینے میں چھپائے کھڑی تھی۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف ایک گھنی جھاڑی میں گلِ سرخ یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا ایک حبشی غلام ہاتھوں میں چراغ لئے اپنے آقا کے تعمیلِ ارشاد میں کھڑا ہے۔ یہ اس پر اسرار مکان کی کشش تھی۔ جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یا میرا جذبۂ تجسس تھا۔ جو مجھے اس کے اندر جانے پر مجبور کر رہا تھا ان میں سے کونسی بات تھی؟ میں نہیں کہہ سکتا! مختصر یہ کہ اس وقت خوف میرے دل سے اتر چکا تھا۔ اور میں اسکے اندر جا کر ایک روش پر چل رہا تھا۔ میرے پہلو میں فواروں کی ایک مسلسل قطار تھی۔ اونچے اونچے خوفناک اور ہیبت آفریں درختوں کی شاخوں میں سے چاندنی کی روشنی چھن چھن کر فواروں، پودوں اور فرش پر گر رہی تھی۔ فضا میں خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی سوکھے ہوئے پتوں کے گرنے سے ہوا میں معمولی سا ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ اور بس! یہ سوچے بغیر کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں آگے بڑھ رہا تھا ۔۔۔ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ صحن کے وسط میں جا پہنچا۔ سامنے کے کمرے کے ذرے ذرے سے مغمومیت، اداسی اور افسردگی ٹپک رہی تھی۔ چند پودے ہلے۔ اور ایک دردناک، الم زدہ آواز فضا میں گونجی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ کوئی مضطربانہ پودوں کو ہلاتا، سوکھے پتوں پر پاؤں رکھتا، ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔ پھر وہی آواز! درد انگیز، خونیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی زخمی آواز! چند لمحے میں وہیں

کھڑا رہا۔

"معلوم نہیں۔ یہ کون ہستی ہے۔ جو سینے کے زخم کو پروں سے چھپائے ہوئے پرندے کی طرح بیقرار و مضطرب ہے؟ شاید مَیں اِس کے دُکھ دُور کر سکوں"؟ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا۔ مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی! ہوا کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ اچانک ایک پودے کی شاخیں زمین پر جھک گئیں۔ اور ایک سایہ، میری نظروں کے سامنے حرکت کرتا ہوا کمرے میں غائب ہو گیا۔ میرے قدم بھی بے اختیارانہ اس کی طرف اُٹھنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں کمرے کے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُف میرے اللہ! اس وقت جو منظر میرے سامنے تھا۔ وُہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کمرے کے روشندانوں سے چاند کی کرنیں آ رہی تھیں۔ اور روشنی میں ایک خوبصورت عورت، سیاہ لباس میں ملبوس، ایک چبوترے کے کونے پر اپنی ٹھوڑی رکھے زار و قطار رو رہی تھی:

پیارے دوست! میرا دل یہ دیکھ کر ہمدردانہ غم کی لہروں میں تیرنے لگا۔ مَیں رُک نہ سکا۔ آگے بڑھا۔ وُہ حسین و جمیل عورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ مَیں نے اس چبوترے پر ہاتھ رکھ دیا:

"خدا کے لئے یہاں بوجھ مت ڈالو۔ میرے محبوب کو تکلیف ہو گی"! اُس نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں میری طرف پھر اُٹھائیں۔ آہ! وُہ قابلِ رحم آنکھیں!

میرے لبوں سے کوشش کرنے کے باوجود کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ اس نظارے سے میرے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی:

"نوجوان اجنبی! تم کون ہو؟ — تمہاری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ اس دنیا میں میری دُکھوں سے بھری حالت پر کوئی آنسو بہانے والا موجود ہے"؟

"محترم خاتون! تم کیوں اِتنی دُکھی ہو"؟ میری زبان سے نکلا!

"مَیں دُکھی ہُوں — بہت دُکھی ہوں مگر دُنیا کو اس سے کیا"؟ وُہ ذرا ٹھہری۔ "نوجوان! میری داستانِ غم سُنو گے؟ تم پہلے شخص ہو۔ جو مدّت کے بعد یہاں آئے ہو۔ اور پھر بغیر کسی خوف کے مجھ سے گفتگو کر رہے ہو۔ مَیں تمہیں اپنی داستانِ غم ضرور سُناؤنگی"!

اس پُراسرار ہستی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور میرے ساتھ لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گئی۔ چاند کی کرنیں روشندانوں

سے نکل نکل کر اس کے مغموم اور افسردہ چہرے پر گر رہی تھیں۔ اُس نے اپنی گہری، خوبصورت آنکھیں جن میں آنسوؤں کے شفاف قطرے لرز رہے تھے۔ میری طرف اُٹھائیں اور ایک دُکھی ہوئی، مضمحل آواز میں کہنے لگی:۔

دخترِ صحرا کا افسانۂ غم!

(۱)

"اجنبی نوجوان! میرا نام 'نرگس' ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ اپنے آپ کو خانہ بدوشوں کے گروہ میں پایا۔ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا۔ میری والدہ کہتی تھی۔ کہ وہ میری شیر خوارگی کے عالم میں فوت ہو گیا تھا۔ شام سے لیکر صبح تک اور صبح سے لیکر شام تک، ہر وقت، ہر گھڑی، ہر لمحہ، ہر طرف پھیلے ہوئے صحرا میں رہ کر، خود رو پھولوں کے ساتھ کھیلنا۔ ریت کے گھروندے بنانا۔ خوش الحان طائروں کی ہمنوائی کرنا، اپنے قبیلے کے ساتھ گانا، رقص کرنا، یہ تھے میرے مسرت آفریں مشاغل جنہیں میں عمر کی پندرھویں منزل تک بخوبی انجام دیتی رہی۔ میری زندگی اکیسر ایک نغمۂ مسرت تھی۔ جو نکہت آلود فضا میں رقص کر رہا ہو۔

میں ہر فکر و غم سے آزاد تھی، میں دخترِ صحرا تھی۔ اور صحرا کی ہر ایک چیز اور ہر ایک ذرّہ میرے لئے اپنے اندر بہت جاذبیت اور دلکشی رکھتا تھا۔ درد، دُکھ کو میں جانتی ہی نہ تھی! —— یہ خوفناک لفظ میں نے کبھی سُنے ہی نہ تھے۔ اسی اثنا میں ہمارے قبیلے میں ایک بوڑھی عورت آئی۔ اور ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے لگی۔ قبیلے کا ہر ایک فرد اسکی عزت کرتا تھا۔ اور اس کے ہر ایک حکم کے آگے اپنا سرِ تسلیم جھکا دیتا تھا۔ میں اس سے بہت ڈرتی تھی۔ اُف وہ اسکی، بھیانک سفید بھوؤں کے نیچے ہر وقت حرکت کرتی ہوئی، آگ کے انگاروں کی طرح آنکھیں، وہ اس کے چہرے پر، ہاتھ پیر، جسم کے ہر ایک حصے پر، درخت سے لپٹے ہوئے سانپوں کی مانند دکھائی دینے والی جھریاں، اور پھر اس کی گرجتی ہوئی خوفناک آواز!!! اب بھی میں ان کا تصوّر کرتی ہوں۔ تو کانپ جاتی ہوں۔ اس کا نام حشیشو تھا۔ اور ہم اُسے خالہ جی کہتے تھے۔ اس کے پاس ایک سیاہ موٹی سی بلّی بھی تھی۔ جسے وہ یا تو کندھے پر اُٹھائے رکھتی یا گود میں بٹھائے رہتی۔ میں اس کے پاس نہیں جاتی تھی —— جانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے کوئی اس کے پاس لے جاتا۔ تو خاموش بیٹھی رہتی جب وہ ہمارے خیمے میں آتی۔ میں ڈر کر، تیزی سے بھاگ جاتی۔ اور جب تک وہ اندر رہتی۔ میں آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ جب کوئی قافلہ ہمارے پاس سے گذرتا۔ وہ بہت خوش ہوتی۔ قافلے والے اس کے پاس آتے۔ اور وہ ان کے ہاتھ دیکھکر ان کی قسمت کے واقعات بتاتی۔ وہ میرا ہاتھ بھی دیکھا کرتی۔ اور جو وہ کہتی میں اسے اچھی طرح نہ سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ خوف کے مارے میرے حواس ٹھکانے نہ ہوتے تھے۔ لیکن یہ الفاظ ضرور سن لیتی تھی :-

"تو بدقسمت ہے لڑکی!"

یہ سن کر مجھے بہت رنج ہوتا۔ اور جب اس کے پاس سے اُٹھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، تمام رنج دور ہو جاتا۔ اس کا خیمہ ہمارے خیموں سے الگ تھلگ ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ رات کے وقت اپنی خوفناک آواز میں کچھ کہتی میں کانپ کر، اپنا منہ کپڑے میں چھپا لیتی۔ ایک شام کو وہ ہمارے خیمے میں آئی۔ اور آتے ہی میرا نام لیا۔ میں ڈرتے ڈرتے، کانپتے کانپتے اس کے پاس گئی۔ اس نے مجھے پیار کیا۔ اور میرے چچا جوشی سے کہا :-

"آج کوئی واقعہ ہوگا۔" یہ کہکر وہ چلی گئی۔ وہ رات بہت خوفناک تھی۔ میں بار بار ڈر ڈر کر کانپ کر، اپنا منہ کپڑے میں چھپا لیتی تھی۔ خانہ بدوشوں میں ڈرنا بیحد شرمناک امر سمجھا جاتا تھا، اور میں تو اب جوان ہوگئی تھی۔ تاہم میں ڈر رہی تھی۔ ہوائے تیز جھونکے درختوں کی ٹہنیوں اور ہمارے خیموں سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے۔ یہ شور لحظہ بہ لحظہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور میرا خوف بھی اس کے ساتھ ترقی پذیر! بوڑھی حشیشو کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "معلوم نہیں آج کیا واقعہ پیش آئے۔ شاید کوئی بڑا درخت ہمارے خیموں پر گرے"۔ اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں پھرنے لگے۔ میرے پہلو میں میری ماں سوئی ہوئی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر گر رہی تھی۔ بوڑھی حشیشو کی لرزہ خیز آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ میں نے خیمے میں سے دیکھا۔ حشیشو کالی بلی کو کندھے پر اٹھائے، چاقو سے ایک درخت کی شاخ کاٹ رہی تھی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنا منہ چھپا لیا۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد خیمے کے دروازے پر حشیشو کی آواز سنائی دی۔ "جوشی!" کوئی جواب نہ دیا گیا۔ آواز پھر آئی۔ اب کے تو وہ ایک قدم خیمے کے اندر آ گئی۔ چچا گھبرا کر اٹھ بیٹھا :

"دیکھو! ایک مسافر راستہ بھول کر یہاں آ گیا ہے۔ سمجھ گئے؟"

جوشی طوعاً کرہاً اٹھا۔ اور حشیشو کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ آیا۔ میں اسے دیکھکر اٹھ بیٹھی :

"کیا بات ہے چچا؟" میں نے پُوچھا:

"ایک مسافر یہاں آ گیا ہے۔"

"پھر؟" یہ کہتے ہُوئے مجھے ڈر سا لگا۔ یہ ظالم لوگ مسافروں کو لُوٹ لیا کرتے تھے!

"مَیں اُسے دوسرے خیمے میں چھوڑ آیا ہوں۔ اب سو رہا ہوگا کمبخت نے مجھے تکلیف دی۔" یہ کہتے ہوئے وُہ لیٹ گیا۔ اور چند لمحوں کے بعد اُس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ مَیں مسافر کے متعلق سوچنے لگی۔ بیچارے کا سب کچھ چھین لیا جائے گا۔" میرے دل میں اس کے آنے پر افسوس پیدا ہوا۔ صبح کے وقت جب ہم اُٹھے اور چلنے کا ارادہ کیا۔ تو اس مسافر کو بھی جگایا گیا۔ وُہ ایک خوبصورت —— بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کی پیاری پیاری صورت مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ ہم نے اپنا سامان اونٹوں پر لادا۔ اور چلنے لگے۔ وُہ مسافر بھی گھوڑے کی لگام پکڑے، ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں چاہتی تھی۔ کہ اس کے ساتھ گفتگو کروں۔ مگر نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ وُہ مجھ سے بہت دُور تھا، اس نے مجھے کئی بار دیکھا، اس کے دیکھنے سے مجھے بہت —— لطف آتا تھا۔ میں حیران تھی۔ کہ وُہ کیوں نہیں چلا جاتا۔ اگرچہ میرا دل چاہتا تھا —— بجید چاہتا تھا۔ کہ وُہ نہ جائے۔ راستے میں ہم حسبِ معمول دو تین جگہ ٹھہرے۔ جب آفتاب غروب ہو گیا۔ اور ہم نے شب بسری کے لئے خیمے لگائے۔ تو مجھے اس سے باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ اسکی آواز میں مٹھاس تھی۔ اور مجھے اس سے پیشتر اتنا حظ، اتنی مسرت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی اس کی باتیں سن کر ہوئی رات کے وقت وُہ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ تمام رات میرے دل پر بے چینی طاری رہی صبح ہوتے ہی وُہ مجھے ملا۔ اور اپنی پیاری پیاری باتیں سنانے لگا۔ مَیں نے محبّت کا لفظ کبھی نہیں سنا تھا۔ مَیں نہیں جانتی تھی۔ کہ محبت کیا ہوتی ہے اور جب ایک دن سب سے علیحدہ ہو کر اُس نے مجھ سے کہا۔ "مجھے تم سے محبّت ہو گئی ہے۔" تو میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ محبّت کے لفظ اور تشریح سے میں نا آشنا تھی۔ ورنہ مجھے اس سے محبت تھی —— مجنونانہ محبت!! وُہ بتانے لگا۔ کہ محبت کیا ہوتی ہے میں سب کچھ سُنتی تھی۔ اور خاموش تھی۔ خاموش رہنے میں ہی مجھے لطف محسوس ہوتا تھا۔ آخر اس نے مجھ سے کہا:-

"نرگس! آخر کب تک یونہی رہیں گے۔ بہتر ہے۔ کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

"کہاں چلے جائیں نادر؟" میں نے پوچھا۔ "نادر" اس مسافر کا نام تھا۔

"میرے گھر میں" تاکہ ہم اِن وحشیوں کے پنجے سے نکل کر مسرت بھری زندگی بسر کر سکیں"۔

"لیکن وُہ مجھے جانے نہیں دینگے"!

"ہم انہیں کہیں گے ہی کیوں؟ رات کے وقت میں تمہیں گھوڑے پر بٹھا کرلے جاؤں گا"۔

"میں ڈرتی ہُوں نادر"!

"کیوں ڈرتی ہو میری نرگس! میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اور تمہارے آرام و آسائش کیواسطے اپنا سب کچھ قربان کر دُوں گا"۔

"معلوم نہیں مجھے ڈر کیوں لگتا ہے"۔

"تم اس لئے ڈرتی ہو۔ کہ تم ان میں موجود ہو"۔

"اُور اگر یہ وہاں بھی پہنچ گئے تو"؟

"نہیں، یہ وہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو میری نرگس"! اور یہ کہتے ہوئے اس نے شدت محبت سے میرا ہاتھ دبایا!

اجنبی نوجوان! اس رات میں نادر کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھی تھی۔ اُور ہمارا گھوڑا رات کی تاریکی میں صحرا کی مسافت طے کر رہا تھا"۔

(۲)

پُراسرار عورت نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ آسمان پر چاند، سیاہ بادل کے دامن میں سے اِس طرح نکل رہا تھا گویا ایک ہیبت ناک اژدہا، موتی اُگل رہا ہے۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ فضا میں بدنصیب عورت کی مغموم غمگین ہوتی ماتمی آواز گونج رہی تھی ——!

"میں نادر کے ساتھ ایک شاندار مکان میں پہنچی۔ یہ مکان ایک خاموش اُور سنسان جگہ پر تھا۔ ارد گرد مختصر سی آبادی تھی۔ وہاں ہر ایک چیز خوبصورت، دل آویز اُور دلکش تھی۔ صحن میں اونچی اونچی دیواروں کے ساتھ لٹکے ہوئے انگوروں کے خوشے ابھے ہوئے کمرے، اُن کا حیرت انگیز سامان، ریشمیں مخملیں پردے اُور غالیچے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں ایک رنگین خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں ہر ایک چیز کو دیکھتی۔ ہر ایک چیز کے متعلق اپنے محبوب نادر سے پوچھتی۔ اُور وُہ

مُسکراتے ہُوئے، میٹھی آواز میں جواب دیتا!

میں اُس وقت خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین ہستی سمجھتی تھی۔ اور یہ حقیقت بھی تھی مجھے سب کچھ حاصل تھا۔ دولت جاہ و حشم۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خوبصورت نوجوان مرد کی محبت! مرد کی محبت جو عورت کی نظروں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ میں اپنی صحرائی زندگی کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ کبھی کبھی، جب میں تنہا ہوتی۔ دھند اور تاریکی کے کثیف پردے چیرتے ہوئے مجھے دو بڑے بڑے خوفناک ناخن نظر آتے۔ اور پھر اس کے بعد، جھریوں سے بھرا ہُوا، ایک چہرہ دکھائی دیتا۔ یہ چہرہ حشیشو کا ہوتا۔ میں ڈر کر دوڑتی ہوئی اپنے محبوب کے پہلو میں جا بیٹھتی!

"کیا ہے میری جان!" وہ گھبرا کر پوچھتا۔ مگر میں خاموش رہتی۔

نادر کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی والدہ زندہ تھی۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اُس کی مادرانہ شفقت نے میرے دل سے اپنی ماں کی یاد بھی بھلا دی تھی۔ ایک رات کے ابتدائی حصے میں، میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہُوئی، بربط بجا رہی تھی۔ اسوقت میں بیحد خوش تھی، کیونکہ صبح کو دنیا کی سب سے بڑی مسرت کا آفتاب میری زندگی کے افق پر طلوع ہونے والا تھا یعنی میں نادر کی زوجیت میں آنے والی تھی۔ میری گود میں میرا پیارا کبوتر بیٹھا ہُوا تھا۔ آنے والی خوشی کا تصور، نشے کی موجیں بن کر میری رگ رگ میں طاری تھا۔ میں نے بربط کو ایک طرف رکھدیا۔ کبوتر میری گود سے اُڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑی۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گر رہے تھے۔ کبوتر انگوروں کے ایک خوشے پر بیٹھا تھا۔ میں اُس پر ہاتھ رکھنے ہی والی تھی۔ کہ سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہُوا نظر آیا۔ میں جب سے اس مکان میں پہنچی تھی۔ کسی قسم کا خوف میرے دل میں نہیں تھا۔ مگر اس وقت ایک مبہم خوف مجھ پر مسلط تھا۔ یہ سایہ میری طرف بڑھتا ہُوا آ رہا تھا۔ یکایک وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ اُف اجنبی نوجوان! وہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر میرے منہ سے چیخ نکل گئی! ظالم حشیشو! اپنی سیاہ بلّی کو شانے پر اُٹھائے خوفناک، کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی!

"مردود لڑکی! تو مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتی ہے"! یہ کہہ کر وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ میں مبہوت و ششدر کھڑی تھی۔ اس ظالم نجومیہ نے میرا گلا دبا لیا۔ میں نے چند اور وحشیوں کو جن میں چچا جوشی بھی تھا۔ اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے پھر اپنے آپ کو اسی صحرا

میں پاپا میرے پاس حشمتو اپنی بلی کو چھڑی سے مار رہی تھی۔ اور وہ خوفناک آوازیں نکال رہی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھکر اس نے اپنی سرخ زبان بھدے سیاہ ہونٹوں پر پھیری۔ اور کڑکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی:۔

"خبیث روح! اگر اب تم نے اس قسم کی حرکت کی۔ تو یاد رکھ کچا چبا ڈالوں گی۔ اور جو تجھے لے گیا تھا۔ اس کی بھی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاؤں گی۔ مجھے تو جانتی نہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا۔ میرے لئے پھر وہی دردناک اور درد انگیز زندگی تھی۔ نادر کی ملاقات، اس کے ساتھ ایک عالیشان مکان میں جانا، اس کی محبت۔ یہ سب کچھ مجھے ایک سہانے خواب کی طرح محسوس ہونے لگا۔ میں سوچنے لگی۔ کہ مجھے اس طرح کھو کر بچارے نادر کا کیا حال ہوگا۔ فرط غم سے وہ کہیں دیوانہ نہ ہو جائے۔ وہ مجھے ڈھونڈتے یہاں ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ کیونکہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے۔ اور میں نے پھر خود کو نادر کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھا ہوا محسوس کیا۔ اس نے مجھے تھاما ہوا ہے۔ گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ یہاں تک کہ مکان قریب آجاتا ہے۔ میں انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی۔ کہ ایک ہمدردانہ آواز میرے کانوں میں آئی:

"نرگس!"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میری ماں پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی:

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تجھے ان لوگوں نے پھر ستایا ہے؟"

میں نے اسے دیکھا۔ معلوم نہیں میری آنکھوں میں کیا اثر تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ان وحشیوں میں صرف یہی ایک ہستی تھی۔ جو میری غمگسار اور ہمدرد تھی:

"غم نہ کر نرگس! تجھے غمگین دیکھکر میرا دل پھٹا جاتا ہے۔" اور وہ مجھے پیار کے لہجے میں ادھر ادھر کی باتیں سنانے لگی۔ میں نے اسے تمام واقعہ سنایا۔ اور بتایا۔ کہ میں ان کے ساتھ ایک لمحے کے واسطے بھی رہنا نہیں چاہتی اس نے تمام واقعہ سن کر غمگین آواز میں کہا:۔

"میں جانتی ہوں۔ تجھے دکھ پہنچا ہے۔ اور اب تجھے اس سے بھی بڑھ کر دکھ پہنچنے والا ہے۔"

"کیونکر ماں ؟"

"بیٹی! میں تجھے ایک راز بتاتی ہوں"۔

ہمارے پاس کوئی نہ تھا۔ دُور میرے قبیلے کے لوگ وحشیانہ ناچ ناچ رہے تھے۔ اور ان کی کرخت آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ میری ماں میرے قریب تر ہو گئی۔ اور سرگوشی کے لہجے میں کہنے لگی:۔

"نرگس! میں تیری ماں نہیں ہوں۔ اور نہ کوئی یہاں تیرا باپ تھا۔ تو جب شیر خوار بچہ تھی۔ تو یہ ظالم لوگ تجھے کہیں سے اُٹھا کر لے آئے تھے۔ اور میں نے تجھے پالا پوسا۔ تیرے آنے سے پیشتر میرا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ میرے کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے مجھے تجھ سے مادرانہ محبت ہو گئی"۔

یہ سُن کر میرے دل کو جس قدر تکلیف پہنچی۔ اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتی ہوں۔

"اب یہ ظالم لوگ تجھے کسی شہر میں لے جا کر بیچ دیں گے"۔

"مجھے بیچ دیں گے؟"

میری مصنوعی ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وُہ اس قسم کے کئی ظلم کر چکے ہیں۔ یہ ظلم ان کے واسطے کوئی نئی بات نہیں۔ میری بیٹی! اگرچہ میں تمہاری حقیقی ماں نہیں ہوں۔ تاہم مجھے تم سے وُہی محبت ہے۔ جو ایک ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ میں نے تمہیں بیٹی کی طرح پالا ہے۔ میری ہر وقت یہ خواہش ہے۔ کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور ان ظالموں سے دُور رہو۔ بیٹی! یہ راز اپنے سینے میں رکھنا۔ اگر ان وحشیوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا۔ کہ میں نے تمام حقیقت تمہیں بتا دی ہے۔ تو وُہ مجھے مار ڈالیں گے"۔ وہ یہ کہہ رہی تھی۔ کہ وُہ وحشی وہاں آ گئے۔ اور میری ماں اُٹھ کر چلی گئی ——!

(۳)

سیاہ پوش عورت نے اپنی سفید لانبی اور خوبصورت اُنگلیوں سے اپنی شفاف پیشانی کو چھوا۔ اس کے سیاہ بالوں کی لٹوں نے اس کے کانوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:۔

"دوسرے دن صبح کے وقت، جبکہ میں خیمے میں لیٹی ہوئی اپنے محبوب کی یاد میں محو تھی۔ خوفناک حبشیوں اپنی لمبی چھڑی ٹیکتی ہوئی بجوشی کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی:

"لڑکی اُٹھ ہمارے ساتھ چل"! اُس نے کہا:

میں نے انکار کرنا چاہا۔ لیکن میرے لبوں سے الفاظ نہ نکل سکے۔ جس طرح سانپ کی ڈراؤنی آنکھوں کے سامنے پرندہ بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ اس طرح میں اس کے آگے ساکت و صامت تھی آہ میری اس وقت کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی۔ چند لمحے مجھے بغور دیکھ کر، گویا میری آنکھوں سے میرے دِلی جذبات پڑھ رہی ہے۔ اور یہ معلوم کر کے کہ میں اس کے آہنیں پنجے میں جکڑ گئی ہوں۔ وُہ زہر خندہ ہنسی ہنسکر، جوشی کے ساتھ باہر چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی۔ جو میرے ساتھ ہونے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ جہاں وُہ مجھے لے جا رہے تھے۔ پھر بھی میں اُن کے ساتھ چلنے پر، اُن کے ظالمانہ احکام کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دینے پر خود کو مجبور پاتی تھی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد وُہ مجھے لے جا رہے تھے۔ ایک اُونٹ کے کجاوے میں میں اَور وُہ ڈائن بیٹھی تھیں۔ اور دوسرے میں جوشی بعض اوقات ڈر کے مارے مجھے سانس بھی سینے میں رُکتا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔ صبح کے وقت ہم ایک شہر میں پہنچ گئے۔ ایک فراخ میدان میں، لوگوں کے ہجوم میں کئی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ اُن کے چہروں سے غم کے آثار بدرجۂ اتم ہویدا تھے۔ اس بوڑھی ڈائن نے مجھے بھی پکڑ کر ان مغموم صورت لڑکیوں کے پاس جا کھڑا کیا۔ اَور خود ایک طرف بیٹھ گئی۔ ہجوم کی بیباک مُستہزی نظریں مجھ پر گڑ رہی تھیں۔ میں حیران تھی۔ کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑتا۔ اُس کے حُسن کی تعریف کرتا۔ ہجوم میں سے آوازیں اُٹھتیں۔ اَور کچھ دیر کے بعد کوئی آدمی اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہُوا۔ ایک خوبصورت مرد، جس کے کپڑے بہت نفیس تھے۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ میں خوش تھی۔ کہ ظالم حشیشو کے پنجے سے نجات پائی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد جبکہ میں ایک عالیشان مکان میں پہنچی۔ میری تمام خوشی خاک میں مِل گئی۔ میں اگرچہ حشیشو اَور وحشی خانہ بدوشوں کے پنجے سے آزاد تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی اپنے محبوب سے دُور تھی، صحرا میں وُہ مجھے ڈھونڈ سکتا تھا لیکن وہاں یہ بھی ناممکن تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھے۔ اَور زار و قطار رونے لگی۔ رونے سے میرے دل کو کچھ تسلی ہُوئی۔ میں جس کمرے میں تھی۔ وہاں دو عورتیں میرے لئے کھانا لے کر آئیں۔ اَور کھانا دے کر چلی گئیں۔ پھر اُنہیں سے ایک عورت میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے بتایا۔ کہ وُہ خادمہ ہے۔ اَور میری خدمت کرنے پر مامور ہوئی ہے۔ اُس نے میری خدمت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ تاہم میں محسوس کرتی تھی۔ کہ وُہ مجھ سے نفرت کرتی

ہے۔ آہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تیسرے دِن شام کے وقت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور کھڑکی سے دریا کا نظارہ کر رہی تھی۔ کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آہستہ آہستہ دروازہ کھلا۔ اور وہی شخص جو مجھے خرید کر لایا تھا۔ متبسم نظروں سے دیکھتا ہوا میری طرف آیا۔ اُس نے آکر پیار سے میرے شانوں پر ہاتھ رکھا:۔

"تمہارا نام نرگس ہے نا ——؟"

مَیں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو نرگس! تم اداس کیوں نظر آ رہی ہو۔ کیا تکلیف ہے، مجھے بتاؤ"!

کافی عرصے کے بعد میں نے یہ پہلا ہمدردانہ فقرہ سنا۔ میرا دل بھر آیا۔ اور مَیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی:

"تم رونے لگیں نرگس! یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تمہاری ہر تکلیف دُور کرنے کے واسطے تیار ہوں"

میں خاموش رہی، جب دِل دُکھی ہو۔ تو دِل پر اختیار نہیں ہوتا:

"تم تو برابر رو رہی ہو۔ تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے"!

میں اب بھی خاموش تھی!

"دیکھو میں تمہیں ہر طرح کا آرام دُونگا۔ دیکھو نا" اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی۔ تو تمہیں خرید کر لاتا ہی کیوں؟ اوہ شاید تمہیں اس بات کا شکوہ ہے۔ کہ مَیں تین دِن کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔ پیاری نرگس! یقین کرو۔ مَیں مجبور تھا۔ ورنہ تم سے کبھی علیحدہ نہ ہوتا۔"

وہ اس طرح باتیں کرتا جاتا تھا۔ میں کچھ سمجھتی تھی۔ اور کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس وقت مجھے اپنے پیارے نادر کا خیال ستا رہا تھا۔ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے محبت کر سکتی ہے، صرف ایک مرد سے۔ جب پہلو میں دِل ایک ہے۔ تو پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اس ایک دل میں دو ہستیاں سمائیں!

"آخر تم بولتی کیوں نہیں؟" اُس نے متعجبانہ کہا!

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں"۔ میں نے رُک رُک کر کہا!

"شکریہ کس بات کا"
"آپ کی مہربانی کا"
"اپنی محبوبہ سے مہربانی کرنا، شکریے کی بات نہیں"
میں اُسے غلط فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن کہتی کس زبان سے ؛ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ ہر روز وہاں آتا۔ چند گھنٹے میرے پاس بیٹھتا اور میں جب گردن اٹھا کر سامنے دیکھتی۔ تو کھڑکی کے پاس مجھے ایک سایہ نظر آتا۔ یہ کون ہو سکتا ہے" میں گھنٹوں اس کے متعلق سوچتی رہتی۔ ایک چاندنی رات کو میں اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اور مکان کے صحن میں پھرنے لگی۔ اچانک ایک طرف ایک کالی بلی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے حشیشو یاد آ گئی۔ میں ڈر کر واپس لوٹنے ہی کو تھی۔ کہ میرے کانوں میں آواز آئی :-
"نرگس!"
مڑ کر دیکھتی ہوں۔ تو وہی کالی ڈائن سامنے ہے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اُس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھا :-
"نرگس! تمہیں میرے ہر حکم کی پابندی کرنا ہے۔ سمجھ گئی! ورنہ کچا چبا ڈالوں گی! کل اس وقت مجھے یہیں ملنا۔ اور جو کچھ میں کہوں گی، وُہی کرنا —— کل اس وقت، اسی جگہ!"
یہ کہکر وہ چلی گئی! تمام رات اس ظالم کا چہرہ میرے سامنے رہا۔ اور دن کے وقت بھی یہی واقعہ دماغ پر مسلط! رات کو میں نے سونے کی بہت کوشش کی۔ مگر نیند کہاں ؟ مجھے اس ظالم عورت کا وعدہ یاد آ گیا۔ اُٹھی اور کمرے سے باہر نکل کر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے۔ کہ حشیشو میرے سامنے آموجود ہوئی!
"تم آ گئیں، یہ بہت اچھا کیا۔ اور اب جو میں کہتی ہوں۔ وُہی کرو" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے کپڑوں میں ہاتھ ڈال کر، ایک پُڑیا نکالی۔ اور اُسے میرے ہاتھ میں دے دیا :-
"اس پُڑیا کے سفوف کو صراحی میں ڈال دو۔ کل جب وہ شخص آئے۔ تو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا۔ اور صراحی سے اُسے جام بھر کر دینا۔ خبردار خود اس صراحی میں سے کچھ نہ پینا۔ سمجھ لیا۔ یہ تمہیں ضرور کرنا ہے۔ اگر اس

میں ناکام رہیں۔ تو تمہاری بوٹیاں کر کے جانوروں کے آگے پھینک دوں گی۔ اور جس نامراد مرد کے ساتھ تم چلی گئی تھیں۔ اس کا بھی یہی حال کر دونگی ۔۔۔!"

اُس نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ اور چلی گئی۔ میں وہ پڑیا ہاتھ لئے کمرے میں آ گئی۔ صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ زہر تھا میں نے اُسے پھینک دینا چاہا۔ کہ اچانک میرے سامنے دیوار پر اس ظالم ڈائن کا گھورتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میرا ہاتھ رک گیا میں زہر کو پھینک نہ سکی۔ اُسے پھینکنے کی بجائے میں نے اُسے صراحی میں ڈال دیا ۔۔۔ نیک اجنبی! اب بھی اس واقعے کا تصور کرتی ہوں۔ تو کانپ جاتی ہوں۔

آہ! میں کتنا بڑا ظلم کر رہی تھی ۔۔۔ وہ شخص میرے پاس آیا۔ میں نے اس کی چند باتوں کا جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور بار بار فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر میرے ہاتھوں کو دباتا تھا۔ میں نے جام بھر کر اُسے دیدیا!

"تم تو آج بہت مہربان نظر آتی ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے جام پکڑا۔ شربت کے حلق سے اترتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا!

"میرے سر میں درد ہونے لگا ہے"

میری زبان حلق میں سوکھ گئی!

"اُف یہ درد ترقی کرتا جاتا ہے۔ سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس شربت میں کیا تھا؟"

میں کیا جواب دیتی۔ لحظہ بہ لحظہ اس کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔

"ظالم عورت! یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے زہر دیدیا ۔۔۔" وہ فرش پر گر پڑا۔ اور تڑپنے لگا!

یکلخت کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک خوبصورت عورت بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے مرتے ہوئے شخص کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ خادمائیں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ اور زار و قطار رونے لگیں۔ اس شخص کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا!

"ظالم عورت! یہ تونے مجھ پر کیا ظلم کیا!" اس عورت نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ "میں نے یہ ظلم برداشت کر لیا۔ کہ میرا پیارا خاوند تجھ سے ملے۔ مگر تو نے ۔۔۔ آہ یہ تونے کیا کیا۔ میں تجھے کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ کوئی سزا دینا نہیں چاہتی۔ صرف اتنا کہتی ہوں۔ کہ تیرا محبوب بھی تیرے ہی ہاتھوں سے زہر

کا جام پی کر مرے۔ اور جس طرح تو نے میرے دل کو دکھایا ہے۔ تیرا دل بھی دُکھے۔ اب میری نظروں سے دُور ہوجا۔"

میں کمرے سے باہر نکلی۔ خبیث حشیشو میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور ایک طرف لے جانے لگی ——!"

—— ۴ ——

ہوا کے تیز اور تند جھونکے، شور مچاتی ہوئی خوفناک آندھی کی صورت اختیار کر کے اونچے اونچے درختوں سے دیوانوں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ زرد رُو چاند ایک سفید ابر پارے کے نیچے کفن میں لپٹی ہوئی ایک نعش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ پُر اسرار عورت جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے شفاف قطرے لرز رہے تھے۔ مغموم اور دُکھی آواز میں داستان غم سنا رہی تھی۔ اس کی آواز مجھے ستائی ہوئی، بدقسمت روحوں کی چیخوں کے ہجوم میں سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نازک ہونٹ جن پر آنسوؤں کے قطرے دھبوں کی صورت میں جم گئے تھے۔ حرکت میں تھے۔ اور مجھ سے کہہ رہی تھی:۔

"نیک اجنبی! اس واقعے کے بعد میری زندگی کا سخت دردناک دَور شروع ہوا۔ ظالم حشیشو پھر مجھے صحرا میں لے آئی۔ میرے دل پر مایوسیوں کی ظلمت طاری رہتی تھی۔ مگر اس اندھیرے میں امید کی ایک شعاع بھی چمک رہی تھی۔ اور وہ میرے محبوب کا خیال تھا۔ ان وحشیوں میں میرا کوئی ہمدرد، کوئی غمگسار نہیں تھا۔ میری ماں (اگرچہ وہ میری ماں نہیں تھی۔ لیکن میں اُسے ماں ہی سمجھتی تھی) بھی کہیں گئی ہوئی تھی۔ اُن ظالموں نے مجھے حکم دے رکھا تھا۔ کہ میں ہرگز خیمے سے باہر نہ نکلوں۔ حشیشو ہر وقت اپنی خوفناک نگاہوں سے مجھے گھورتی رہتی تھی۔ ایک دن، اچانک میری ماں آگئی۔ اور خوش قسمتی سے وہ میری محافظ مقرر ہوئی۔ حشیشو، دن میں دو تین بار مجھے دیکھنے آتی تھی۔ میں نے تمام واقعہ جو میرے ساتھ گزرا تھا۔ اس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سُن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے:

"میری بدقسمت بیٹی! بیوہ عورت کی بد دُعا سخت خوفناک ہوتی ہے۔ آہ ان ظالموں نے تمہیں کس مصیبت میں ڈال دیا"

"لیکن ماں! میرا اس میں کیا قصور تھا؟"

"قصور —— کوئی قصور نہیں۔ لیکن اس نے بد دعا تو تم کو دی تھی:۔"

میں کچھ نہ کہہ سکی۔ رونے لگی۔ آنسو ضبط کرنا چاہتی تھی۔ مگر ضبط نہ کر سکتی تھی؛

"نہ رو میری بیٹی! مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جاتا۔"

"اب میرے ساتھ یہ لوگ کیا کریں گے؟" مَیں نے اُس سے روتے ہوئے پوچھا۔

"جو پہلے کیا ہے۔"

"مجھے پھر بیچ دیں گے؟"

"ہاں بیٹی! اسی لئے اس شخص کو زہر دیا گیا تھا۔ اور اسی لئے یہ مردود تجھے وہاں سے لائی۔"

مَیں یہ سُن کر لرز اٹھی ــــ کانپ گئی۔

"اب میرا کیا حشر ہو گا ماں؟"

اُس نے مایوسانہ مجھے دیکھا۔ اور خاموش رہی۔

"اب میں کروں کیا؟ میرا دل یہاں رہنے کو بالکل نہیں چاہتا۔ مَیں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔"

"بیٹی صبر کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ ہر وقت، ہر حال میں تمہاری مدد کروں گی۔ مجھے ان ظالموں کی پروا نہیں چند دن کے بعد تو یہاں نہیں ہو گی۔"

"وہ کیونکر؟"

"تم دیکھو گی۔ اب سو جاؤ۔ تمہاری آنکھیں سرخ ہیں۔"

"سوؤں کیونکر، ماں! مجھے تو نیند نہیں آتی۔"

"سونے کی کوشش کرو۔ دیکھو یہ تمہاری ماں کہہ رہی ہے۔ تمام لوگ سوئے ہوئے ہیں تم بھی سو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اُس کی شفقت آمیز گفتگو، اور ہمدردانہ سلوک نے میرے دل سے بہت حد تک غم دُور کر دیا۔ مَیں لیٹ گئی کئی راتوں کے بعد اس وقت کچھ آرام محسوس کر رہی تھی۔ "نادر کے پاس جاتے ہی میں اسے اپنے پاس بلا لوں گی۔ میرے ساتھ حقیقی ماں کی طرح سلوک کر رہی ہے۔" یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ یکا یک مجھے محسوس ہوا۔ کہ کوئی مجھے جگا رہا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ میری پیاری ماں میرے سر پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی:-

"نرگس اٹھو!

"کیوں ماں"؟

"نادر باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جلدی چلو"۔

ہم آہستہ آہستہ خیمے سے باہر نکلے۔ میری ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہم دبے پاؤں چلنے لگے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے ہونگے۔ کہ مجھے ایک گھوڑا نظر آیا۔ اور اچانک نادر ایک طرف سے آکر بیتابانہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"نادر وقت کو دیکھو" میری ماں نے کہا۔ وُہ کچھ منفعل سا ہو گیا۔ اُس نے مجھے گھوڑے پر بٹھایا۔ اور پھر خود بیٹھ گیا۔

"ماں! میں تمہیں بلاؤں گی تو تم آجاؤ گی نا؟" میں نے کہا۔

میری ماں نے مسکرا کر اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اور تیز رَو گھوڑا برق رفتاری سے چلنے لگا۔ صبح کو بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کہ ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ جب ہم مکان کے بائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہے تھے تو میرا دل فرطِ مسرت سے اچھل رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو پھر دنیا کی خوش قسمت ہستی تصور کرنے لگی۔ آہ مجھے ان دردناک واقعات کا علم نہ تھا۔ جو مستقبل کے آغوش میں پرورش پا رہے تھے۔

"تم نے میری پروا نہ کی۔ مگر میرا دل ہر وقت تمہارے خیال ہی میں ڈوبا رہتا تھا۔" میں نے شکایۃً اپنے محبوب سے کہا۔

"نہیں میری جان! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب سے تم یہاں سے گئیں۔ میں ہر روز صحرا میں جاتا تھا۔ تمہیں خانہ بدوشوں نے نہیں بتایا۔ میں ان سے تمہارے متعلق دریافت کرتا تھا۔ وُہ اُلٹے میری جان کے لاگو ہو گئے تھے۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی۔ کہ میری جان بچ گئی۔ ورنہ اُنہوں نے مجھے قتل کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔"

"تم کتنے پیارے ہو نادر اور پھر کس قدر نیک!"

یہ سُنکر وُہ مسکرایا۔ اور زور سے میرے ہاتھ کو دبایا۔ اسی اثناء میں نادر کی والدہ بھی وہیں آگئی۔ میں نے تمام سرگزشت اُسے سنائی۔

"آہ یہ تم نے کیا کیا بیٹی! خدا تم پر رحم کرے۔ بیوہ عورت کی بددعا سے خدا بچائے" نادر کی والدہ نے کہا۔

یہ سُن کر میں رونے لگی۔ نادر نے تسلی انگیز لہجے میں کہا۔

"اماں! تم نے نرگس کو ڈرا دیا۔ کوئی فکر نہ کرو نرگس! اماں جان بوڑھی ہیں۔ اور بوڑھی عورتیں وہمی ہوتی ہیں۔"

"نہیں بیٹی فکر نہ کرو۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ وہ نجومیہ میرے پاس ہو۔ تو میں اس کا منہ نوچ لوں۔"

"تو اماں، تم یہ مقدس فرض انجام دینے کے واسطے وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔" نادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں بھی مسکرا پڑی۔ دوسرے دن ہماری شادی ہو گئی۔ گزشتہ واقعات مجھے بالکل فراموش ہو گئے۔ ایک دن شام کے وقت، میں اپنے مکان سے باہر نکل رہی تھی۔ کہ وہی بوڑھی ڈائن میرے پاس آ کھڑی ہوئی:۔

"مردود! تو نے پھر وہی حرکت کی۔ دیکھ اب میں تیرا کیا حال کرتی ہوں۔"

میں خاموش کھڑی رہی۔

"تپتی ہوئی سلاخیں تیرے بدن سے لگاؤں گی۔" اس نے کالی بلی کو ایک شانے سے اٹھا کر، دوسرے شانے پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"کیا سوچ رہی ہے چل میرے ساتھ!"

اجنبی انسان! محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔ نادر کی محبت نے میرے دل کو بہت مضبوط کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تو تھی۔ لیکن اتنی نہیں جس قدر پہلے اسے دیکھ کر ہو جاتی تھی۔ اس نے میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں پیچھے ہٹ گئی:

"اچھا یہ بات ہے!"

"میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

"تو نہیں جائیگی۔ دیکھتی ہوں بجوشی!" میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ دور سے اپنے خاوند کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اور وہ ڈائن اور جوشی کہیں غائب ہو گئے۔

"کیا ہے میری جان! تمہارا رنگ کیوں پیلا پڑ گیا ہے۔ اوہ تم کانپ بھی رہی ہو۔" نادر نے، میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ڈر تو نہیں گئی تھیں؟"

"نہیں!"

"ڈر نہیں گئی تھیں اور پھر بھی کانپ رہی ہو۔ وہ بڑھیا پھر تو نہیں آئی تھی؟"

"وہ آئے نہ آئے۔ اب مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکتی۔"

"پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میرے محبوب نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور مکان میں لے گیا۔ "تمہارا بدن گرم ہے۔ اس لئے لیٹ جاؤ۔ میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے۔ کہ تنہا باہر نہ جایا کرو۔ آئندہ احتیاط کرنا۔" یہ کہکر وہ کہیں چلا گیا۔

میں اپنے محبوب کے کہنے کے مطابق تنہا باہر نہیں جاتی تھی۔ جب کبھی باہر جاتی۔ میرا خادم میرے ساتھ ہوتا تھا۔ اور ویسے بھی اب جشیشو کا بہت کم خوف میرے دل میں رہ گیا تھا۔ وہ مجھے کبھی کبھی دور سے دکھائی دیتی۔ مگر میں اسے دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ کئی بار وہ میرے قریب سے گزری۔ اور میں نے خوف کا ذرہ بھر احساس نہ کیا اور وہ دانت پیس کر آگے چلی گئی۔ ایک شام میں تنہا باغ میں لکڑی کے تختے پر بیٹھی تھی۔ جشیشو میرے پاس ٹھہر گئی۔ میں اسے دیکھکر اُٹھنے ہی لگی تھی۔ کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بچی! میں تجھے اب لے جانا نہیں چاہتی۔ میں تجھے خوش دیکھکر خوش ہو رہی ہوں۔"

میں نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں تیری بہتری چاہتی ہوں۔" وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "تجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت ٹوٹ رہی ہے۔ ایک عورت نے تیرے خاوند کے دل پر قبضہ کر لیا ہے۔"

یہ سُنکر میں چونک اُٹھی۔

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں میری بچی! مجھے معلوم ہے۔ تو اس پر یقین نہیں کرے گی۔ مگر میں تجھے سب کچھ دکھا دوں گی۔"

ایک عورت نے میرے محبوب کے دل پر قبضہ کر لیا ہے ——! یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ میرے دل میں خیال آیا۔ کہ اسے جھڑک دوں۔ میں نے اس بات کا ارادہ ہی کیا تھا۔ کہ اُس نے کہنا شروع کیا ——

"جب تم اپنے خاوند کو ایک عورت کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دیکھو گی۔ تو تمہیں یقین آ جائے گا۔ بچی! میں نے تیری بہتری کے واسطے یہ کہا ہے۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔ تجھے مصیبت میں دیکھوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو

سکتا۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے پہلی بار اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

اُس نے اپنی چھڑی کی نوک تختے پر رکھی۔" میں یہ کہہ رہی ہوں۔ کہ تیرا خاوند تجھے چھوڑ کر ایک دوسری عورت کو چاہ رہا ہے۔ مَیں تجھے یہ دکھا سکتی ہوں۔"

۵

سیاہ پوش عورت کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں نے اپنے سینے میں درد کی لہریں اُٹھتی ہوئی محسوس کیں۔ میرے اِرد گرد ہر ایک چیز پر مغموميت طاری تھی۔ اس نے اپنے سیاہ دامن سے آنسو پونچھے اور کہنے لگی :۔

"اے نوجوان! میری صبحِ مسرت پر غم کے بادل چھا چکے تھے۔ اُس وقت میں نے بوڑھی نجومیہ کی زہرآلود باتوں کا خیال نہ کیا۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ میرے دل کی گہرائیوں میں ایک مبہم خوف پرورش پا رہا ہے میں اپنے آپ کو سمجھاتی۔ وُہ بوڑھی ڈائن میری مسرتوں کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ اِس لئے اس قسم کی باتیں کرتی ہے۔ میرے پیارے خاوند کے دل پر کوئی عورت قبضہ نہیں کر سکتی۔ اس طرح کی باتیں دل سے کر کے میں خود کو تسلی دیتی تھی۔

ایک منحوس شام کو میں، ابھی مکان سے نیچے نہیں اُتری تھی۔ کہ حشیشو مجھے ملی۔ وُہ ہانپ رہی تھی۔

"بچی! آؤ میرے ساتھ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ تمہارا خاوند تمہاری محبت میں کس طرح خیانت کر رہا ہے۔"

میرا خاوند، تجارت کے سلسلے میں، حسبِ معمول کہیں باہر گیا ہُوا تھا۔ یہ سُنکر غصّے سے میرا بُرا حال ہُوا۔

"چڑیل! ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔" میں نے کہا۔

"بچی! میں تیری بہتری کے واسطے کہتی ہوں۔ تو چل کر خود دیکھ سکتی ہے۔ اگر میں جھوٹی ہوئی۔ تو کبھی مجھ پر یقین نہ کرنا۔ ایک دفعہ میرے ساتھ چل کر دیکھ لے۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ایک جذبہ تھا۔ جو مجھے کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ ایک طاقت تھی جو مجھے بے اختیار قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ تھوڑی دُور چل کر میری آنکھوں نے ایک نہایت رُوح فرسا منظر دیکھا۔ میرے خاوند کے شانوں پر ہاتھ رکھے ایک سیاہ پوش عورت چل رہی تھی۔ میری طرف اُن کی پشت تھی۔ میرے سر سے

پاؤں تک آگ لگ گئی۔ میں اُن کے پاس جانا چاہتی تھی۔ کہ حشیشو نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا:۔

"ایسا نہیں ہو سکتا بچی"!

وُہ مجھے مکان تک لائی اَور خود چلی گئی۔ چند گھنٹوں کے بعد میرا خاوند بھی آگیا۔ اور وفورِ محبت سے مجھ سے، لپٹ گیا۔ میں یہ سب کچھ بناوٹ اَور تصنع پر محمول کرنے لگی! ابھی میری نظروں نے اسے ایک غیر عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اَور اب وُہ جھوٹے مسموم بوسوں سے مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ میری محبت کو دھوکا دے رہا ہے۔ میرے دل میں یہ خیال آیا۔ اور اس سے کہنے کو تھی۔ کہ پھر رُک گئی۔ وُہ چلا گیا۔ اَور دوسرے دن پھر وُہی دلخراش منظر میں نے دیکھا۔ حشیشو نے میرا ہاتھ پکڑا اَور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگی:۔

"مَیں تجھے اِس مصیبت سے خلاصی دلا سکتی ہوں"!

"کیونکر"؟

"ایک بالکل سہل علاج ہے"۔ یہ کہکر اس نے اسی قسم کی ایک پڑیا جو اس نے مجھے پہلے دی تھی، میرے ہاتھ میں رکھدی"۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گی۔ جہاں وُہ بیٹھے ہوئے ہیں تم اُن کی نظر بچا کر یہ پڑیا صراحی میں ڈال دینا۔ وُہ عورت ضرور پانی مانگے گی۔ اس وقت اُسے خود گلاس بھر کر دینا۔ اَور ـــ بچی! میں نہیں دیکھ سکتی۔ کہ تو اس مصیبت میں گرفتار رہے۔ یہ عورت تیری خوشیوں کو ذبح کر رہی ہے۔ اِس زہریلی ناگن کو اپنے راستے سے ہٹا دو، میری بچی! تیری مسرتیں ہمیشہ رہیں گی"۔

یہ کہہ کر وُہ چلی گئی۔ مَیں نے اس پڑیا کو سینے کے پاس چھپا لیا۔ اجنبی نوجوان! میں اس وقت اندھی ہو گئی تھی۔ رقیبانہ جوش نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ دوسرے دن صبح کے وقت وُہ ظالم نجومیہ میرے پاس آئی۔

"اُٹھ بچی! اپنی خوشیوں کی حفاظت کر۔ وُہ دونوں بیٹھے ہوئے ہیں"۔

میں زخمی ناگن کی طرح بیقرار ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ وُہ بوڑھی ڈائن مجھے اس مکان میں لے آئی"۔ اس نے اس کمرے کی طرف جس میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اشارہ کیا۔ تَیں بے تابانہ یہاں چلی آئی۔ میرے خاوند کا چہرہ اس وقت میری طرف تھا۔ اور وُہ عورت دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ میرے خاوند نے جب مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا اثر پیدا نہ ہُوا۔ برخلاف اس کے وُہ مسکرایا۔ یہ دیکھ کر میرا دل جل کر کباب ہو گیا۔ میرا خاوند اس سے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں صبر کرنا چاہیے۔

میں تمہارے واسطے سب کچھ کرونگا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ میں نے پڑیا کو کھول کر صراحی میں۔ جو میرے پاس رکھی تھی۔ ڈال دیا!

اجنبی نوجوان! زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جس میں ذرا سی غلطی کرنے سے انسان اپنی تمام زندگی تباہ کر لیتا ہے۔ میں بھی اس وقت غلطی کر رہی تھی۔ اپنی زندگی تباہ کر رہی تھی۔ اس عورت نے صراحی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے گلاس بھرا۔ اور اسے اس کی جانب بڑھایا۔ یکایک مجھے پیچھے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ظالم نجومیہ ہنستی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ جب میں مڑی۔ تو مجھ پر بجلیاں ٹوٹ گئیں۔ میرا محبوب زہر کا گلاس پی رہا تھا۔ میں نے ہاتھ مارا گلاس گر پڑا۔ لیکن جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا تھا۔ زہر اس کے حلق سے اتر چکا تھا۔ میں تباہ ہو چکی تھی۔ اس کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ اچانک وہ عورت تیزی سے اٹھی۔ اور زور سے قہقہہ لگا کر اور مجھے دیکھ کر کہنے لگی:۔

"میں نے انتقام لے لیا۔ بدنصیب عورت! مجھے پہچان"!

اجنبی انسان! میرے سامنے وہی عورت کھڑی تھی۔ جس کے خاوند کو میں نے زہر دیا تھا۔ اور جس نے مجھے بد دعا دی تھی۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اور چلی گئی۔ میں سب کچھ سمجھ گئی۔ ان دونوں کی سازش کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے تڑپتے ہوئے خاوند کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا!

"میری جان! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے —— یہ عورت ایک مسافر تھی —— اور مجھ سے مدد طلب کر رہی تھی —— میری نرگس —! میری نرگس —! یہ کہتے ہوئے میرے محبوب نے آخری سانس لیا۔ اور اب میرے سامنے میرے محبوب کی بجائے ایک جسدِ بے روح تھا"

بدنصیب عورت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے!

"یہ ہے میری داستانِ غم۔ ظالم حشیشو نے مجھ سے یہ ظالمانہ فعل اس لئے کرایا تھا۔ کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی —— اپنے خاوند کو مردہ دیکھکر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں حشیشو پر ٹوٹ پڑی۔ اور اس کی دونو آنکھیں نکال دیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے نوکروں کی مدد سے اپنے پیارے خاوند کی نعش کو دفن کر دیا۔

"اجنبی نوجوان! یہ ہے میرے محبوب کی آرام گاہ! میں ہر رات پشیمانی کے آنسو یہاں بہانے آتی ہوں۔ یہ کہکر اس

نے اپنا سر اپنے محبوب کی تربت پر رکھ دیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ میں بھی آنسو ضبط نہ کر سکا:
"اوہ! تم رو رہے ہو محمود!"
میں نے سر اٹھایا۔ بہرام حیرتناک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔
"یہ تم نے کیا کیا۔ تمام رات یہیں پڑے رہے۔"
"نرگس!"
"کون نرگس؟" آغا بہرام نے ہنسکر کہا۔ "شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔"
"آہ! مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔"
پیارے راشد! یہ تمام واقعات میں نے اس پُراسرار عمارت کے آخری کمرے میں سوتے میں دیکھے تھے۔ یہ ایک خواب تھا۔ مگر کس قدر غمناک، کس درجہ درد انگیز! اس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو۔
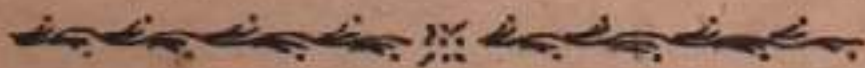
صحرانورد کا تیسرا خط

محترم دوست!

آج تمہارے دُور اُفتادہ، صحرا نورد دوست کو، تمہاری شورش افزا دُنیا کے دلچسپ مناظر کو چھوڑے ہُوئے پُورے تین سال گزر گئے ہیں، ان تین سال میں، میری نگاہوں نے ہیبت آفریں صحراؤں، ہولناک پہاڑوں، مٹی اور ریت کے مہیب تودوں، گنجان اور بلند درختوں کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان لرزہ خیز مناظر سے محبت ہو گئی ہے۔ اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ نئے سے نئے، متحیّر کُن سے متحیّر کُن، واقعات سامنے آتے جاتے ہیں۔ دوست! میں ایک ایسی دلآویز و رومانیت انگیز دنیا میں سانس لے رہا ہوں جس کی دلچسپیاں تمہارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں!

صبح جب میری آنکھ کُھلتی ہے۔ آفتاب کی شعاعِ اوّلیں، میرے لئے ایک رومانِ تازہ، اپنے آغوشِ نور میں لے کر آتی ہے۔ اور جب دن بیت جاتا ہے۔ تو رات کی تاریکی، عجیب و غریب، پُراسرار واقعات کی دُنیا دامن میں لئے، ظاہر ہوتی ہے۔ یوں سمجھو، صحرا ایک طویل کتاب ہے۔ جس کے ہر صفحے پر بے شمار رومان، بکھرے پڑے ہیں۔ میری نظریں بھونرے کی مانند، جو ہر پتی کا رس چُوستا ہے۔ اور اس پر بھی اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی، نئے نئے رُومانوں کو پڑھ رہی ہیں۔

تم میرے خطوں کو، میرے افسانوں کو کتنی دلچسپی سے پڑھتے ہو۔ یہ میں نہیں جانتا۔ مگر مجھے یقین ہے۔ کہ میرا ہر ایک افسانہ تمہارے حسّاس دل پر وُہی اثرات طاری کرتا ہوگا۔ جو اب تک میرے دل پر مرتسم ہیں۔ اور معلوم نہیں کب تک مرتسم رہینگے!

چند دن سے میں افریقہ کے صحرا کی سیر میں مصروف ہوں، اپنے رفیقِ سفر آغا بہرام کے ساتھ، قدرت کی دلآویز نیرنگیوں، دلکش نظاروں میں گھرا ہوا ہوں۔ اور یہاں اتنی دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔ کہ اِس کے عوض شہر کی زندگی جاوداں بھی نہ لُوں۔ تم میرے اس بیان کو محض شاعرانہ مبالغہ سمجھو گے ——— مگر دوست! دُنیا کی ہر نئی چیز انسان کے ذہنِ نارسا کے لئے مبالغہ ہی ہوتی ہے۔ کاش تم میری مسرتوں کا اندازہ کر سکتے۔

آج مَیں تمہارے سامنے ایک ایسا رومان پیش کر رہا ہوں۔ جو میرے پچھلے رومانوں سے بہر لحاظ بہتر، دلچسپ و دلآویز ہے۔ میں اسے خود متعدد بار پڑھ چکا ہوں۔ اور ہر بار اِسے پہلے سے زیادہ دلچسپ محسوس کیا ہے۔ امید ہے۔ کہ تم بھی اسے بہت پسند کرو گے:

آج سے چھ دن پیشتر، نصف دن گذرے۔ جبکہ آفتاب نصف النہار پر نہایت تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اور اس کی حدت معمور شعاؤں کا جال صحرا کی وسعتوں میں پھیلا ہوا تھا۔ میں اور آغا بہرام ایک درخت کے نیچے سستا رہے تھے۔ یکایک ذراتِ ریگ کا ہجوم اُٹھ اُٹھ کر، سمع خراش شور پیدا کرتا ہوا۔ آسمان کے نیچے تاریک و کثیف بادلوں کی صورت میں منڈلانے لگا۔ پگھلتے ہوئے برف کے ٹکڑے کی طرح مٹی کے بڑے بڑے تودے، تیز و تند جھونکوں میں، تحلیل ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ فضا میں اجسامِ خبیثہ کے لشکر دوڑ رہے ہیں۔ اور عنقریب کائنات تباہ ہو جائے گی۔ بادِ سموم کے تھپیڑے درختوں سے ٹکرا کر اس طرح شور پیدا کر رہے تھے۔ گویا بیشمار اندھے ایک تاریک کنوئیں میں گر پڑے ہیں۔ اور اپنی جان کے خوف سے بے اختیار ہو کر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ جس درخت کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ اس کے پاس ہی ایک غار تھا۔ ہم بعجلت اُس غار میں چلے گئے۔ صحرا میں جب بادِ سموم چلتی ہے۔ تو ہم کسی محفوظ جگہ چھپ جاتے ہیں۔ کیونکہ بادِ سموم کے ہلاکت بار جھونکوں کے سامنے کھڑے ہونا، یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ غار ہمارے لئے نہایت اچھی جائے پناہ ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹہ ہم وہیں بیٹھے رہے۔ اور جب میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ کہ یہ طوفانِ آتشیں تھم گیا ہے۔ تو اپنے رفیقِ محترم کو آگے چلنے کے لئے آواز دی۔ مگر اس نے مجھے اندر بُلا لیا۔ آغا بہرام کے پاس ایک اور بوڑھا شخص کھڑا تھا:

"یہ صاحب بھی ہماری طرح یہیں کھڑے تھے" آغا بہرام نے کہا۔

"آپ کو بھی سیاحت کا شوق ہے؟" ——— مَیں نے اس سے پُوچھا:

غار کے شگاف میں سے مدھم روشنی اس کے گرد آلود چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اور اس کی صورت بہت خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے گھُور کر ہم دونوں کو دیکھا۔ اور باہر نکلنے کے واسطے کہا۔ ہم تینوں باہر نکل آئے۔ اب فضا سکون پذیر تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ ہم اسی درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

"غالباً تم سیاح ہو!" اس بوڑھے نے ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!" آغا بہرام نے جواب دیا۔ "ہم صحرانورد ہیں۔ اور آپ بھی غالباً اس جنوں میں مبتلا ہیں؟"

"میں بہت صحرانوردی کر چکا ہوں" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اب چند سال سے اِس صحرا میں رہتا ہوں۔ دن بھر جنگل میں گھومتا رہتا ہوں۔ شکار کرتا ہوں۔ اور رات کے وقت اس غار میں سو رہتا ہوں۔ مَیں بھی ایک دن جوان تھا۔ اور جوانوں کی طرح گھوما کرتا تھا۔ مگر اب میری زندگی کا چراغ بجھ رہا ہے......... ٹانگوں میں زیادہ چلنے کی ہمت نہیں ہے۔ جوان آدمی واقعی خوش قسمت ہوتے ہیں!"

"تو آپ تنہا اس غار میں رہتے ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہاں! کیا حرج ہے؟" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"یہ میں نے اِس لئے پوچھا۔ کہ بڑھاپے میں ایک ہمدم کی سخت ضرورت ہوتی ہے"

"ہمدم!" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے کئی ہمدم ہیں"

یہ شخص چند گھنٹوں کے بعد ہم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگا۔ اس کا لب و لہجہ کرخت تھا۔ مگر عربی شستہ بولتا تھا۔ اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ اور جب اسے یقین ہو گیا۔ کہ وُہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ تو اس نے غار میں سے ایک سنگِ مرمر کا ڈبّہ لا کر میرے ہاتھوں میں دیا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔

"یہ کیا ہے بزرگ انسان؟" میں نے پُوچھا۔

"اِن......" اس نے کمزور نحیف آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اِن اوراق میں تین ہستیوں کی سرگزشتیں درج ہیں۔ جنہوں نے محبت کی۔ جو محبت کی گئیں۔ اور جنہوں نے آخر محبت ہی کے ہاتھوں...... موت کا شربت پیا۔"

اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور اُس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ان میں سے ایک تو مجھے لکھی لکھائی ملی۔ اور مَیں نے پھر اُسے اپنے الفاظ میں لکھا۔ یہ سرگزشت "مصر کی ملکہ" کی ہے۔ اور باقی دو سرگزشتوں کو میں نے دوسروں کی زبانی سُنا۔ اور پھر انہیں لکھ لیا۔ .... یہاں میری زندگی کی تنہا دلچسپی انہی افسانوں سے وابستہ تھی۔ اب چونکہ میں موت کے دروازے پر پہنچ .... گیا ہوں۔ اس لئے یہ اوراق .... تمہیں دیتا ہوں۔ تم انہیں بیحد دلچسپ پاؤ گے .... آہ، چٹانوں پر بیٹھ کر، ان افسانوں کو پڑھنے سے مجھے بے حد لطف حاصل ہوتا تھا۔ .... افسوس وُہ زمانہ گزر گیا!"

ایک دن اَور زندہ رہ کر یہ نیک دل بوڑھا دُنیا سے سفر کر گیا۔ مَیں نے افسانوں کو پڑھا۔ یہ کتنے دلچسپ ہیں؟ کتنے دلآویز؟؟ اس کا اندازہ تم خود لگا سکو گے!

آج، پیارے دوست! مَیں پہلا رومان یعنی "ملکۂ مصر" تمہاری زبان میں لکھکر تمہیں بھیج رہا ہوں۔ مَیں نے اس کے پیرایۂ بیان کو بہت حد تک بدل دیا ہے۔ مگر واقعات وُہی ہیں۔

یہ داستان "آگیطی" ملکۂ مصر کی ہمدم' وانیس اَور محل کی سب سے بڑی خادمہ کی زبانی ہے۔ آگیطی نے واقعات معبد رع کے ایک محافظ کو سنائے۔ اس نے یہ واقعات کسی اَور کو سنائے۔ آخر کار ایک عورت نے انہیں لکھ لیا۔ اَور اس طرح یہ داستان محفوظ رہی۔ یہ چیزیں مجھے مرحوم بوڑھے نے بتائی تھیں۔ مَیں عنقریب دوسرے 'رومان' بھی تمہاری خدمت میں بھیجونگا۔ تم سے ملنے، تم سے باتیں کرنے کا بیحد خواہشمند تمہارا دُورافتادہ دوست!

"صحرا نورد"

آغازِ داستان

(۱)

"اے معبدِ رع کے محافظ! چونکہ تم میرے عزیز ہو۔ اَور میرے دل میں تمہاری عزت ہے۔ اس لئے مَیں (آگیطی) تمہاری درخواست کو رد کرنا نہیں چاہتی۔ مَیں تمہاری آرزو کے مطابق، تمہیں وُہ تمام تحیر افزا واقعات سناؤں گی جو چند سال سے مجھے پیش آ رہے ہیں۔"

تم جانتے ہو۔ مصر و یونان میں ہمیشہ عداوت رہی ہے۔ فرعون رعمسیس دوم کے زمانۂ حکومت میں مصری سپاہیوں نے یونان پر حملہ کیا۔ اور بے شمار یونانیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ قیدی بنا کر مصر میں لے آئے۔ اور ان میں سے بیشتر تعداد کو سخت بے رحمی سے قتل کروا ڈالا۔ بہت سے یونانی چھپ گئے۔ اور اس طرح ان کی جان بچ گئی۔ اسی اثنا میں فرعون فوت ہو گیا۔ اس کی نعش عمل حنوط کے لئے محل کے آخری تہ خانے میں پہنچائی گئی۔ رات کو میں یہ دیکھنے کے لئے کہ تہ خانے کے ارد گرد خفیہ راستوں پر پہرہ دار اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یا نہیں۔ تہ خانے کی طرف چلنے لگی۔ کئی پہرہ دار سو چکے تھے۔ میں نے خاموشی کے ساتھ تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلے میری نظر فرعون کے تابوت پر پڑی۔ تابوت کے ارد گرد سیاہ چراغ جل رہے تھے۔ عود و عنبر کی خوشبو سے کمرے کی فضائیں معمور تھیں۔ فرعون کا سر تابوت سے باہر تھا۔ میں نے جھک کر اس کے سر کو دیکھا۔ اور عقیدت مندانہ جذبات سے میرا سینہ لبریز ہو گیا۔ میں نعش پر جھک گئی۔ یکایک میرے کانوں میں مدھم سی آواز آئی۔ اس بات سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہاں داخل ہونے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے متحیرانہ ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کے آخری کونے میں دو سائے نظر آ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر ان کے پاس پہنچی۔ اس وقت جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا۔ اسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مدھم روشنی میں مجھے ایک عورت اور ایک لڑکی نظر آئی۔ میں دیوار سے لگ کر ان کے پاس کھڑی ہو گئی۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے میں ان کے چہروں کو بخوبی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تاہم میں محسوس کرتی تھی۔ کہ وہ یونانی عورتیں ہیں۔ ان کے چہروں سے غم و مایوسی ٹپک رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے جو لڑکی کی ماں معلوم ہوتی تھی۔ اپنے ہاتھ میں سنگِ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پکڑی ہوئی تھی۔ دونوں خاموش کھڑی تھیں۔ اس وقت میرے سامنے عجیب پُر اسرار منظر تھا۔ کمرے میں خوف انگیز و خوف آور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے سانسوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑی تھی۔ وہاں کامل تاریکی تھی۔ اس لئے وہ مجھے بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر ان کے ارد گرد مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فرعون کے تابوت کی طرف ان کی پشت تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے لمبی آہ بھری۔ اور لڑکی کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر مغمومانہ آواز میں کہنے لگی۔

"اوردیا! میری بچی! اگر ہم کچھ دیر اور یہاں رہے۔ تو مصری جلاد ہمیں قتل کروا ڈالیں گے!"

"تو بھاگ جائیں ماں!" لڑکی نے بھولے پن سے کہا:

"کہاں بھاگ جائیں ..... ؟ جہاں جائیں گے۔ مصری جلاد ہمیں پکڑ لیں گے۔ اوّل تو محل سے نکلنا ہی امرِ محال ہے۔ وہ عنقریب یہاں آئیں گے۔ اُو ..... خدائے زیوس کی ان پر لعنت ہو!"

میں سمجھ گئی۔ کہ یہ یونانی عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماں ہے۔ اور دوسری لڑکی۔ وہ اپنی جان بچانے کیلئے یہاں چھپی ہیں۔ اپنی موجودگی اُن پر ظاہر کرنے سے پیشتر میں نے اُن کی گفتگو کو سُننا مناسب خیال کیا۔

"تو اب کیا کرنا چاہیے ماں"؟ لڑکی نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ..... مصری جلاد ابھی آکر ہمیں قتل کر ڈالیں گے"!

"نہیں ماں!" لڑکی خوف سے کانپنے لگی۔ اس کی ماں نے اس کے بازوؤں کو پکڑ لیا۔

"خاموش!" ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا:۔

"زہر کھاکر مرنا ذلیل مصریوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے بیٹی"!

"مجھے موت سے ڈر آتا ہے ماں"!

"مگر ہم کسی حالت میں بھی موت سے نہیں ڈرتے۔ خدائے زیوس کی قسم! ہم مصریوں کے ہاتھوں ذلیل موت کبھی بھی قبول نہیں کرینگے"۔ اب اُس کی آواز میں قدرے جوش پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے صندوقچی میں سے کچھ نکالا۔ اور جلدی سے اسے مُنہ میں ڈال لیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو لڑکی کی طرف بڑھایا:

"یہ کیا ہے ماں"؟

"زہر"!

"زہر"؟ ماں! ..... مجھے موت سے ڈر آتا ہے ـــــ ماں"!

"ذلیل موت سے یہ موت بہتر ہے"۔

"ماں ـــ! ماں!!"

لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں بے اختیاری کے عالم میں آگے بڑھی۔ اور اس کی ماں کے ہاتھ کو پیچھے ہٹا دیا۔ لڑکی دم بخود ہو گئی۔ ماں لڑکھڑانے لگی۔ صندوقچی اس کے ہاتھوں سے نکل کر سیاہ پردے پر جا گری:

"خدائے زیوس کی بجھ پر لعنت ہو! لعنت ہو!" یہ کہتے ہوئے عورت نے لڑکی کی گردن کے گرد ہاتھ حمائل کر دیے زہر اس کی رگوں میں پوری طرح اثر کر چکا تھا ــــ اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔

"ظالم، خونخوار!" یہ کہہ کر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ میں نے لڑکی کو پکڑا۔ اور تابوت کے پاس روشنی میں اسے لے آئی۔ اس کے چہرے سے خوف کے اثرات ہویدا تھے۔ اور وہ دم بخود تھی۔

"ڈرو مت بیٹی! تجھے کوئی مصری قتل نہیں کر سکتا۔"

لڑکی کانپنے لگی۔

"کانپ کیوں رہی ہے بیٹی؟ مجھے اپنی ماں سمجھو...... تم میری بیٹی ہو...... میری بیٹی!" میں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب خوف بہت حد تک اس کے دل سے نکل چکا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"یو...... یوروپا!"

"یوروپا! میری بیٹی یوروپا!"

یوروپا نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ایسا پیارا چہرہ میں نے تمام مصر میں نہیں دیکھا تھا۔

"تو میرے پاس رہے گی، میری بیٹی یوروپا؟"

"مصری جلاد مجھے قتل کر ڈالیں گے۔"

"نہیں بیٹی، ایسا نہیں ہو گا۔ میرے کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں تجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گی۔"

"مجھے مصریوں سے ڈر آتا ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ کانپنے لگی۔

"مصری بہت مہربان ہوتے ہیں، یوروپا! تو میرے پاس نہایت آرام سے رہے گی۔ میں تجھے آرام سے محل میں رکھوں گی۔ محل کی تمام خادمائیں تیری عزت کریں گی۔"

"مصری بے رحم نہیں ہوتے؟"

"بالکل نہیں! بھلا وہ تیرے جیسی پیاری لڑکی کے ساتھ کیونکر بے رحمانہ سلوک روا رکھ سکتے ہیں؟"

"میری ماں نے تو کہا تھا۔ کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے!"

"تیری ماں کو سخت غلطی ہوئی تھی۔ اس نے تیرے دل میں بھی مصریوں کی طرف سے خوف پیدا کر دیا۔ چلو۔ اب چلیں۔"

"کہاں؟"

"میرے کمرے میں! ڈرو مت! دیکھو میں تمہاری ماں ہوں۔"

"یوروپا" جھجکی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور آہستہ آہستہ ہم باہر نکل آئے۔ محل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تمام راہ ڈرتی رہی۔ میرا بیٹا چند دن سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لئے کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں یوروپا کا ہاتھ پکڑے، کمرے میں داخل ہوئی۔ اُسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور آپ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اُسے تسلیاں دینے لگی۔۔۔!

——— (۲) ———

کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی:۔

میرے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس لئے میں "یوروپا" کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھنے لگی۔ یوروپا پچھلے واقعات کو بہت حد تک فراموش کر چکی تھی۔ مگر ابھی تک وُہ وہی سہمی ہوئی، خوفزدہ، غمگین صورت لڑکی تھی جسے میں نے تہ خانے میں دیکھا تھا۔

میں نے اسے محل کے عقب میں، ایک مکان لے دیا تھا جس میں وُہ رہتی تھی۔ اور میں بھی زیادہ وقت وہیں گزارتی تھی۔ باوجودیکہ اسے وہاں رہتے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ تاہم وُہ مصریوں سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ چونکہ معبد رع میں گئے ہوئے مجھے عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے جب ایک دن میں "یوروپا" کے پاس پہنچی۔ میں نے خدائے رع کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ اور "یوروپا" کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ بہت ڈری۔ اور خوفزدہ لہجے میں کہنے لگی:۔

"مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے، ماں!"

"خوف"؟ ابھی تک تمہیں ہر چیز سے خوف محسوس ہوتا ہے؟"

"مصری بہت خونخوار ہوتے ہیں!"

"مصری تو میں بھی ہوں"۔

"یوروپا" نے عجب انداز سے میری طرف دیکھا۔

"مگر ماں! تم تو بہت مہربان ہو!"

"تم جیسی بھولی بھالی، پیاری لڑکی پر کون مہربان نہ ہوگا؟ چلو اب چلیں! خدائے رع کے معبد کا کاہن اعظم تمہارے متعلق پیشین گوئی بھی کریگا۔"

آسمان پر تاریک و کثیف بادل چھائے ہوئے تھے، ہوا میں برودت پیدا ہو گئی تھی۔ ہم دونوں خاموشی کیساتھ مکان سے نیچے اُترے۔ اور معبد الاقصرٰ کی طرف چلنے لگے۔ تمام راہ یوروپا ڈرتی، کانپتی ہوئی میرے ساتھ چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد ہم معبد کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یوروپا خوف سے کانپنے لگی۔ وُہ معبد کے اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اور بار بار مجھ سے لپٹ جاتی تھی!

"بیٹی! ڈرو مت! دیکھو، تمہاری ماں تمہارے پاس کھڑی ہے۔"

"میں نے سُنا ہے۔ یہاں قربانیاں کی جاتی ہیں!"

"مگر تمہیں کیا یوروپا، کاہن اعظم بہت مہربان ہے ...... مت ڈرو بیٹی!"

یہ سنکر اُسے کچھ تسلی ہوئی۔ اور وُہ مجھ سے علیحدہ ہو کر چلنے لگی۔ ہم پہلے کمرے میں پہنچے۔ یوروپا بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور خوف کی ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا کمرے کے ایک کونے میں ایک مُعمّر شخص، جس کی شکل انتہائی طور پر خوفناک تھی۔ گھور گھور کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں کئی مرتبہ معبد میں گئی تھی۔ مگر یہ بوڑھا میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ چند لمحات کے بعد ہم خدائے رع کی بارگاہ میں تھے۔ کاہن اور کاہنات خوش آہنگ آوازمیں گیت گا رہی تھیں، معبد کی فضاؤں میں خوشبو کی لہریں تیر رہی تھیں۔ گیت جاری تھا ——!

"تو بیدار ہو۔ اے نیکوکار۔ اے خدائے رع! اے آسمان کے دونوں کناروں کے مالک! اے روشنی دینے والے خداوند! اے خدائے رع!! تو بلند آسمانوں کی سیر کرنے والا ہے۔ تیرے دُشمن تباہ ہوں۔ اے خدائے رع! فرعون کی عمر دراز کر! اس کے پیٹ کو روٹی اور اس کے حلق کو پانی پہنچا۔ اس کے بالوں کے واسطے عطر عنایت کر۔ تمام راہیں تیری روشنی سے معمور ہیں! تو وُہ مقدس خ ات ہے جس کے پروں سے بجلی پیدا ہوئی۔ تو وُہ شیر ببر ہے۔ جس کی گرج سے دشمن کانپ جاتے ہیں۔ تو وُہ قفقس ہے۔ جو مختلف رنگ رکھتا ہے!

'آسُودہ ہو۔ اے خداوندوں کے باپوں کے باپ! اے موجودات پیدا کرنے والے۔ اے سب چیزوں کے بنانے والے۔ اے معبودوں کے سردار!!"

اب آواز رُک گئی۔ تمام کاہن اور کاہنات چلی گئیں۔ کاہنِ اعظم ابھی تک سر جھکائے خدائے رع کے سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے یوروپا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھی۔ کاہنِ اعظم نے سر اُٹھایا۔ اور مُڑ کر ہماری طرف دیکھا:-

"خدائے رع تم پر رحم کرے آگیبطی"! اس نے کہا:

"خدائے رع کی عظمت بلند ہو۔ یہ میری بیٹی ہے"۔ مَیں نے یوروپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے متعلق پیشین گوئی کیجئے"!

اُس نے گھُور کر یوروپا کی طرف دیکھا۔ یوروپا نے خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ کاہنِ اعظم سر کے بل خدائے رع کے سامنے گر پڑا۔ اور اُس کی عظمت کا گیت گانے لگا۔ ایک طرف سے گرجتی ہوئی آواز پیدا ہوئی۔ مَیں سجدے میں گر پڑی۔ اور جب اُٹھی۔ تو مَیں نے دیکھا۔ کہ یوروپا بھی سجدے میں ہے۔ مَیں نے اُسے اٹھایا۔ کاہنِ اعظم اُٹھا اور بلند آواز میں کہنے لگا:-

"خدائے رع کے جلال کی قسم، اس کے سر پر تاج ہو گا ---!

یہ سُن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی:

کاہنِ اعظم کہے جا رہا تھا:-

یہ مِصری نہیں، یونانی لڑکی ہے"

مَیں ڈر گئی۔ کاہنِ اعظم پھر سجدے میں گر پڑا۔ یوروپا مجھ سے لپٹ گئی۔ ناگاہ میری نظر ایک کونے پر پڑی۔ وُہی بوڑھا جسے ہم نے معبد میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، یوروپا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ --- مَیں نے یوروپا کا بازو پکڑا اور ہم معبد سے نکلنے لگے۔ تمام راہ ہم خاموش رہے۔ مکان پر پہنچ کر میں اس واقعے پر غور کرنے لگی ---!

کتنا پر اسرار، کتنا عجیب وغریب واقعہ تھا؟

"یوروپا کے سر پر تاج ہو گا"۔ یہ بات رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ انہی خیالات کو

دماغ میں لئے میں سو گئی۔ خواب میں دیکھا۔ کہ یورو پا بالکل بدل گئی ہے۔ اُس کے سر پر نہایت خوبصورت چمکتا ہوا تاج نظر آ رہا ہے۔ وُہ سنہری کرسی پر بیٹھی ہے۔ فرعون آتا ہے۔ اور اسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ یکایک میری آنکھ کھل گئی:

یوروپا میرے پہلو میں سو رہی تھی۔ سوتے میں اس کا چہرہ نہایت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا:

"ماں!" اُس نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وُہ خوفناک چہرے والا بوڑھا کون تھا۔ جس نے معبد میں گھور کر مجھے دیکھا تھا؟"

"وُہ خوفناک بوڑھا؟ کوئی ہو گا ہمیں کیا؟"

"خدائے رع کا کاہن ہو گا!" یہ کہہ کر وُہ اٹھ بیٹھی۔ اور میں اس کا دل بہلانے کے واسطے اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات سنانے لگی ———!

(۳)

ایک پُر اسرار واقعہ!

متذکرہ بالا واقعہ کے بعد یوروپا پہلے سے بھی زیادہ گُم سُم، خاموش اور افسردہ رہنے لگی، اس رات کے واقعے کو جب میں سوچتی۔ ایک مبہم سا جذبہ خوف میرے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو جاتا۔ میں نے کئی بار اس موضوع پر یوروپا سے گفتگو کرنا چاہی۔ مگر وہ ہر بار ایک لفظ نکالے بغیر مایوسانہ نظروں سے مجھے دیکھ کر خاموش ہو جاتی۔ کاہن اعظم کی پیشین گوئی کو وہ اس کی ستم ظریفی پر محمول کرتی تھی:

تختِ حکومت پر فرعون (منفتا) بیٹھ چکا تھا۔ وُہ ایک خوش رُو، وجیہہ نوجوان تھا۔ نہ صرف وجیہہ بلکہ نیک طینت بھی ———!

اس شام کو جس کا میں ذکر کرنے لگی ہوں۔ یوروپا قدرے بشاش تھی۔ وُہ مکان کے پیچھے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ میں کمرے کی کھڑکی سے دور اُفق کو جہاں سنہری بادل لہرا رہے تھے۔ دیکھ رہی تھی۔ مکانوں سے دھوئیں کے کثیف بادل اُٹھ اُٹھ کر چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تبدیل ہو ہو کر فضائے بسیط میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے۔ معبدِ رع سے سنکھوں اور گیتوں کی خوش آہنگ آواز آ رہی تھی۔ میں ان حسین و جمیل مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ اسی اثنا میں دو میری نگاہوں نے اُسی خوفناک بوڑھے کو دیکھا۔ جسے معبدِ رع میں، میں اور یوروپا دو بار دیکھ چکی تھیں۔ وُہ ایک ٹوٹے

پر کھڑا ٹکٹکی باندھ کر ہمارے مکان کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات کے لئے میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ مگر جب میں نے اپنی حیثیت اور مرتبے پر غور کیا۔ تو تمام خیالات دور ہو گئے ——!

پورو پانچے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کو ہلاتی ہوئی، پھولوں کو توڑتی ہوئی ٹہل رہی تھی:۔

تھکاوٹ محسوس کر کے میں کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تو میرا دماغ مختلف خیالات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ نگاہوں کے سامنے عجیب و غریب مناظر آئے۔ کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ میرے جسمانی اضمحلال اور دماغی افسردگی نے جسم کو نیند کی گود کے حوالے کر دیا۔ یکلخت میری آنکھ کھل گئی۔ چراغ کی تیز روشنی میری آنکھوں میں چُبھ رہی تھی۔ میں اُٹھ بیٹھی۔ میرا دل پورو پا کو تنہا چھوڑ کر، خود سو جانے پر خود کو مطعون کرنے لگا۔ خدائے رع اُسے محفوظ رکھے۔ "کتنی پیاری لڑکی ہے"! یہ الفاظ میرے لبوں سے بے اختیار نکلے۔ اور میں نے ایک کھڑکی کے پاس آ کر اُسے آواز دی۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ آواز دی۔ اب کے بھی خاموشی طاری رہی۔ میں کھڑکی کو چھوڑ کر نیچے باغ میں آئی۔ اور اُسے ڈھونڈنے لگی۔ باغ کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر پورو پا کہیں بھی نہ تھی۔ اتنا پُر اسرار، خوف آور واقعہ مجھے تمام زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا۔ اس لئے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید اسے کسی نے پہچان لیا ہے۔ اور وہ قتل کر دی گئی ہے۔ اس خیال کے دماغ میں آتے ہی میرا دل غم و غصہ سے بھر گیا۔ میں اُسے حقیقی معنوں میں اپنی بیٹی سمجھتی تھی۔ اور اُسے کسی صورت میں بھی خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ "مگر میں نے اسے تنہا چھوڑا ہی کیوں"؟ یہ سوال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ "اگر میں اسے اس طرح نہ چھوڑتی۔ تو یہ ہولناک واقعہ کبھی بھی رونما نہ ہوتا"۔ کتنی دیر تک اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ اور میں پچھتاتی رہی۔ اسی اثنا میں بوڑھے کی شکل میری نظروں کے سامنے پھرنے لگی:۔

"ممکن ہے۔ یہ حرکت اسی کی ہو"۔ میں نے دل میں سوچا۔ "آخر وہ بار بار چھپ چھپ کر ہمیں کیوں دیکھتا تھا، اور کچھ دیر پہلے دور کھڑے ہو کر مکان کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے اس کا کیا مطلب تھا؟"؟

جیسے جیسے ان خیالات کا ہجوم میرے دماغ میں زور پکڑتا جاتا تھا۔ میری روح غم کے تلخ احساسات کی زنجیروں میں گرفتار ہوتی جاتی تھی:۔

آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں باغ سے باہر نکلی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اپنی بیکسانہ

حالت پر مجھے خود افسوس ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے چاہا۔ کہ محل میں جا کر اپنے بیٹے سے یہ واقعہ بیان کروں۔ اور اس کی مدد سے یوروپا کو ڈھونڈوں۔ مگر یہ مناسب خیال نہ کیا۔ آخر کار میں ایک طرف چلنے لگی۔ اور مجبور و خستہ ہو کر پھر باغ میں پہنچی۔ اور شدتِ ملال سے گر پڑی۔

میں لیٹی رہی اور جب اٹھی تو آسمان پر ستارے ماند پڑ چکے تھے۔ کاہنوں کے گیت فضا میں لہرا رہے تھے! اچانک ایک طرف سے یوروپا آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

"یوروپا! میری بیٹی! تو کہاں چلی گئی تھی؟"

اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے اثرات نمایاں تھے۔

"تو اتنی خوفزدہ کیوں ہے"؟ میں نے پھر پوچھا۔

"میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں ماں؟"

"تو کسی مصیبت میں نہیں پھنس سکتی یوروپا!"

"مجھے اوپر لے چلو"۔ اس نے کمزور و نحیف آواز میں کہا۔

میں نے اس کا بازو پکڑا۔ اور ہم اوپر آ گئے۔

"میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے"۔ یوروپا نے کچھ دیر ٹھہر کر کہنا شروع کیا .... مگر وہ ایکدم رُک گئی۔

"کیا واقعہ"؟

"میں کچھ بھی بتا نہیں سکتی۔ میں ان سے ڈرتی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہے۔ کہ اس واقع کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہوں"۔ وہ ذرا ٹھہری اور پھر کہنے لگی: "میں نہیں بتا سکتی ماں! آہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں!"

"یوروپا!" میں نے پیار اور شفقت سے اس کی گردن کی گرد ہاتھ حمائل کر دیئے۔ "تم مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتیں!؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو اس حالت میں تمہاری کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے!"

"لیکن انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہے۔ اور میں اُن سے ڈرتی ہوں"۔

"تمہیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے یوروپا! مجھے تمام واقعہ بتاؤ۔ تاکہ میں تمہاری تکلیفوں کو دُور کروں۔ خدائے رع کی عظمت کی قسم! جب تک تم میرے پاس ہو۔ کوئی بھی تمہیں تکلیف پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کہو بیٹی! تمام واقعہ مجھ سے کہو!"

اس پر اُس نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا:۔

"وُہی خوفناک بُوڑھا جو ہم نے معبدِ رع میں دیکھا تھا چپکے سے یہاں آیا۔ میں ڈر گئی۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ مگر میرا خیال غلط ثابت ہُوا۔ وُہ میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی کہا:۔

"میں یونانی ہوں۔ اور تم بھی یونانی، ہمیں مصری کتّوں سے جان بچانی ہے۔ اس لئے میرے ساتھ چلو"۔

"میں اس وقت کیا کر سکتی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ اور مجھے مصریوں کے مظالم کے واقعات بھی سنانے لگا۔ چلتے چلتے ہم ایک غار کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے غار کے اندر قدم رکھا۔ میں بھی ڈرتی ڈرتی اندر داخل ہُوئی۔ اندر چراغ جل رہے تھے۔ اور بے شمار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُنہوں نے اپنی گردنیں جھکا لیں۔ اور بوڑھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا ——!

"بیٹی! خدائے زیوس تجھے اپنی شفقت میں رکھے۔ میرا نام "موس" ہے۔ اور میں یونانی ہوں۔ تمہارے وطن کا باشندہ۔ یہاں جتنے آدمی ہیں۔ سب یونانی ہیں۔ تو نے دیکھا۔ کہ مصریوں نے یونانیوں پر کیا کیا مظالم کئے۔ انہیں کس بے دردی سے قتل کیا۔ کن کن ظالمانہ طریقوں پر انہیں ہلاک کر کے۔ ان کے جسموں کو جنگلی جانوروں کے آگے پھینکا گیا۔ کیسے کیسے ناقابلِ برداشت عذاب دے دے کر ہزاروں یونانیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ تو یہ سب کچھ جانتی ہے۔ اور تجھے یہ سب کچھ جاننا چاہیئے۔ ہم جان بچا کر یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں۔ کہ مصریوں سے اپنے مقتول بھائیوں کا بدلہ لیں۔ مگر یہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب ہم اپنے ملک میں بہ آرام پہنچ جائیں۔ تاکہ وہاں جا کر انتقام لینے کی کوشش کریں۔ ... ہم مصریوں سے ضرور بدلہ لیں گے۔ کیا تو وعدہ کرتی ہے۔ کہ اگر تجھے یہاں طاقت و عزّت حاصل ہوئی۔ تو ہماری حفاظت کرے گی۔ اور مصریوں سے بدلہ لے گی؛ بیٹی تو یونانی ہے۔ مصری ہمارے دشمن ہیں!"

میں خاموش رہی۔ وہ پھر بولا:۔

"میں معبد رع کے کاہن اعظم کی پیشین گوئی سن چکا ہوں۔ اگر وہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی۔ تو کیا تم یونانیوں کی مدد کرو گی؟"

اب ایک حسین نوجوان میرے سامنے آیا۔

"بیٹی! یہ یونانی فوج کا افسر تھا۔ اس کا نام 'میرون' ہے۔" عموس نے کہا:

اس نے بھی بوڑھے کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں!" میں نے آخر مجبور ہو کر کہا۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔

"خدائے زیوس کی قسم کھاؤ!" بوڑھے نے مشفقانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خدائے زیوس کی قسم کھا کر وعدہ کیا۔ اس کے بعد بوڑھے نے میرے بازو میں سے خون کے چند قطرے نکالے اور انہیں ایک چینی کی ڈبیہ میں ڈالدیا۔ پھر میرے سر کے کچھ بال نوچ لئے۔ اور انہیں بھی وہیں رکھدیا۔

"یہ تمہارے وعدہ کی علامت ہے۔ خدائے زیوس تجھے وعدہ پورا کرنے میں مدد دے۔"

اس کے بعد بوڑھا مجھے یہاں چھوڑ گیا ــــــ!

ماں! میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں؛ تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی!" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر اب ہوگا کیا ماں؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"وہ بوڑھا مجھے پھر وہاں لے جائیگا۔"

"نہیں! اب میں تجھے کبھی تنہا نہ چھوڑوں گی۔"

"مگر ماں! وہ بے شمار آدمی تھے۔"

"اگر تم مصر کی ملکہ بن جاؤ۔ تو اِن کے ساتھ کیا کرو؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"میں ان تمام کو قتل کرا دوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور وہ سو گئی۔

(۴)

شاہی محل میں

چند دن سے یوروپا بہت بیقرار رہنے لگی تھی۔ خوفناک و وحشت افزا واقعات نے پے در پے رُونما ہو کر اس کے دل پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ ایسی پیاری خوبصورت لڑکی کو خوف کے روح فرسا و زندگی کُش احساس سے لرزتے ہوئے کانپتے ہوئے دیکھ کر میرا دل بھر آتا تھا۔ میں اُسے آرام پہنچانے، اس کا غم غلط کرنے کے لئے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی۔ راتوں کو اُسے خدائے رع اور ہپ آئی بیز کے جلال و قوت کے واقعات سناتی۔ اپنی گزشتہ زندگی کے عجیب و غریب حالات سناتی۔ مگر وہ ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتی۔ اس کی بیقراری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک صبح کو جب وہ اُٹھی۔ تو اتنی بے قرار و مضطرب تھی۔ کہ میں ڈر گئی۔

"چلو بیٹی یوروپا! باہر چل کر سیر کریں۔"

"باہر؟ باہر ماں؟؟"

"کیا حرج ہے یوروپا؟؟"

کچھ دیر کے بعد ہم نیل کے کنارے پر ٹہل رہے تھے۔ مادرِ نیل کی ریگ در دہاں موجیں بار بار اُٹھ اُٹھ کر ہلکا سا ترنم پیدا کر کے ساحل پر بکھرے ہوئے کہُر اور دھند میں ملفوف جہازوں کے شکستہ ٹکڑوں، چھوٹی چھوٹی چٹانوں۔ ریت اور مٹی کے تودوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ پانی کے سینے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ملاحوں کے زمزمہ ریز گیتوں سے فضا معمور تھی۔ ایک طرف معبدِ رع کی بلند عمارت سر اُٹھائے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان کی مشرقی وسعتوں میں خدائے رع عظمت و جبروت کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہر چیز دھند کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے یوروپا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پاس ایک تودے پر ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھے اور افق پر جہاں شفق کی رنگینیاں چھائی ہوئی تھیں۔ نگاہیں گاڑے یوں بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا مصر کی ملکہ کسی سوچ میں غرق ہے

اسے دیکھتے ہی میرے کانوں میں کاہن اعظم کے الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے پیار سے یوروپا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی۔

"اب تو تو خوش معلوم ہوتی ہے، بیٹی!"

اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں۔ آہ ان میں حسرت و یاس ہی کروٹیں لے رہی تھی۔ اس چیز کے باوجود وہ نہایت حسین، نہایت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ یکایک سطح آب پر مجھے ایک زریں بجرہ دکھائی دیا۔ یہ فرعون کا بجرہ تھا۔ خدام ساحل سے لوگوں کو ہٹانے لگے۔

"ماں! یہ کس کا بجرہ ہے؟"

"فرعون کا بیٹی!"

"فرعون کا؟ ...... ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے ماں!" وہ خوفزدہ آواز میں کہنے لگی۔

"تم ڈرتی کیوں ہو یوروپا؟ فرعون سے تم کیوں ڈرتی ہو؟"

"میں یونانی ہوں"

"پھر کیا ہوا، فرعون بہت مہربان شخص ہے"۔

"وہ مجھے گرفتار تو نہیں کرے گا؟"

"کیسی بھولی بھالی باتیں کر رہی ہو۔ فرعون تو تمہیں دیکھ کر خوش ہوگا"

"مگر ماں، مجھے چھپالو"

اب بجرہ ساحل کے پاس آ گیا تھا۔ خدام نے ایک سنہری سیڑھی بجرے سے لگادی۔ اور فرعون نیچے اترنے لگا۔ وہ اسوقت نہایت وجیہہ اور شان و شوکت والا انسان معلوم ہوتا تھا۔ نیچے اتر کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یکایک اس کی نظریں یوروپا کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ یوروپا نے اسے ڈرتے ہوئے جھجکتے ہوئے دیکھا۔ فرعون برابر اسے دیکھ رہا تھا۔ یوروپا گھبرا کر مجھ سے چمٹ گئی۔ فرعون نے مجھے دیکھا۔ اور اس کے بعد خدام کے ہجوم میں واپس چلا گیا۔ یہ واقعہ اتنی جلدی پیش آیا۔ کہ فرعون کے جانے کے بعد بھی میں چند لمحے حیران و مبہوت وہیں کھڑی رہی۔ اب میں اور یوروپا اپنے مکان کی جانب چلنے لگیں۔ راستے میں نہ تو میں نے یوروپا سے کچھ کہا۔ اور نہ یوروپا نے مجھ سے۔ فرعون نے محبت بھری نظروں سے یوروپا کو دیکھا تھا۔ میں سوچنے لگی۔ کیا کاہن اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت

ہو گی؟

اس خیال کے آتے ہی میں یوروپا کے پاس گئی۔ وُہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں فرعون کے بجرے پر، جو ساحل سے قریب کھڑا تھا۔ گڑمی ہوئی تھیں۔ وُہ میری طرف مُڑی:

"وُہ فرعون ہی تھا ماں؟" اس نے کہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھ رہی تھی:

"ہاں بیٹی!"

"فرعون — فرعون!!" اس کے لبوں سے آہستگی کے ساتھ نکلا:

"کیا ہے بیٹی؟"

اس نے صرف مجھے دیکھا۔ اور خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد تمام دن وُہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اُس نے بیشتر وقت کھڑکی کے پاس گزارا۔ اور بار بار مجھ سے فرعون کے متعلق دریافت کیا۔ رات بھی یونہی گزر گئی۔ صبح کے وقت میں نے خود کو فرعون کے خاص خادموں کے نرغے میں پایا۔ وُہ مجھے فرعون کے حضور میں لے گئے۔ فرعون نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا:۔

"وُہ لڑکی کون ہے۔ جو کل تمہارے ساتھ تھی؟"

"وُہ......" مجھ سے آگے نہ بولا گیا:

"اُسے جلد لاؤ!" یہ اس کا دوسرا حکم تھا۔ اس وقت میں عجب مصیبت میں گرفتار تھی۔ میں مکان میں پہنچی۔ اور جب یوروپا سے میں نے کہا۔ کہ فرعون تمہیں بلا رہا ہے۔ تو وُہ رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اور اُسے لیکر فرعون کے حضور میں پہنچی۔ یوروپا میرے پہلو میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ یوروپا کو دیکھتے ہی فرعون کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ اس نے یوروپا کو پاس بلایا۔ اور اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ پھر مجھے اور تمام خدام کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ہم وہاں سے باہر نکل آئے:۔

(۵)

ملکۂ مصر!

جب میں، یوروپا کو فرعون کے پہلو میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم ہو رہا تھا۔

میں نے کمرے کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ اور پلنگ پر لیٹ کر ان تمام تحیّر زا واقعات پر غور کرنے لگی۔ جو میرے سامنے رُونما ہوئے تھے۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا ـــــ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک خیال کے دماغ میں آتے ہی میرے دل کی گہرائیوں میں جذبۂ مسرت انگڑائیاں لینے لگا" کاہن اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ہے۔ اور یوروپا مصر کی ملکہ ......" مگر اس کے ساتھ جب مجھے اس چیز کا احساس ہوا۔ کہ یوروپا مجھ سے چھن جائے گی۔ تو میری تمام مسرت خاک میں مل گئی۔ یوروپا کو میں کسی حالت میں بھی خود سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ میری بیٹی تھی ـــــ میں اُسے حقیقی بیٹی ہی سمجھتی تھی۔ وہ بھی مجھے اپنی ماں سمجھتی تھی۔ کیا ملکہ بن کر بھی وہ مجھے ماں ہی سمجھے گی ؟ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ کہ مصر کی ملکہ بنکر، وہ ایک معمولی عورت کو اپنی ماں سمجھے ؟ یہ خیالات برابر میرے دماغ میں آتے رہے۔ کبھی میں فکرمند ہو جاتی تھی۔ اور کبھی مسرت کی لہریں میرے دل میں تیرنے لگتیں۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا۔ اور میرا بیٹا زاعموت داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بشاشت برس رہی تھی۔ آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی تھیں:

"تم کیا کر رہی ہو ماں ؟"

"کچھ نہیں!" میں نے جواب دیا:

"آج رات کو بہت بڑا جشن ہونے والا ہے۔ فرعون نے اپنی ملکہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ اسی خوشی میں جشن ہونے والا ہے"

"فرعون کی ملکہ ...... مصر کی ملکہ ؟"

"تم جشن کی تیاریوں میں حصہ نہیں لے رہی ہو ماں ؟"

میں خاموش رہی۔ میرا بیٹا چلا گیا۔

"ملکۂ مصر ...... یوروپا ...... میری بیٹی" میں ان الفاظ کو بار بار دہرانے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ گویا مجھ سے میری حقیقی بیٹی چھن گئی ہے۔ کاش میری یوروپا میرے پاس ہی رہتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلی۔ اور جشن کی تیاریوں میں حصہ لینے کے واسطے چلی گئی۔ جتنی دیر میں وہاں رہی۔ انہی خیالات کا ہجوم میرے دماغ کو بیقرار کرتا رہا ـــــ یوروپا سے ملنے کے واسطے میں نے بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکی جب میں اپنے کمرے میں پہنچی۔ تھکاوٹ کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں کھڑکی کے پاس لیٹ گئی۔ شام کی سیاہی بتدریج

پھیل رہی تھی۔ میرے سامنے تاحدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔ جہاز فضا میں چھائے ہوئے گرد و غبار جس کی آغوش میں، سورج کی الوداعی زرد زرد کرنیں سسکیاں لے رہی تھیں، کے پردوں کو چیرتے ہوئے آہستہ آہستہ افق کی تاریکیوں میں غائب ہو رہے تھے۔ دور اونچے اونچے درخت بوڑھے آدمیوں کی مانند جو جوانی کے عشرت معمور دنوں کو یاد کر کے فرطِ غم سے سر جھکا لیتے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے سرنگوں ہو ہو کر آہیں بھر رہے تھے۔

محل کے صحن سے شور سنائی دے رہا تھا جشن شروع ہو چکا تھا۔ میں اٹھی اور محل کے صحن میں پہنچی۔ میری نگاہیں متعدد جشن دیکھ چکی تھیں۔ مگر جو شان و شوکت، آرائش و زیبائش اس موقعے پر دیکھی۔ وُہ میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ہر طرف روشنی کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ رنگین و منقش قالین بچھے تھے۔ جن پر طرح طرح کے رنگین پھول بکھرے ہوئے تھے۔ رنگین و حسین پردے لہرا رہے تھے۔ غرض کہ یہ جشن اپنی شان و تجمل کے لحاظ سے گزشتہ تمام جشنوں سے بڑھ کر تھا۔ لیکن جشن کی کوئی دلچسپی مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی —— میں اپنی یوروپا کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یوروپا میری بیٹی!

میں آگے بڑھی۔ حبشی غلام قطار اندر قطار شرابوں کے ساغر اٹھائے پھر رہے تھے۔ اور بار بار میرے سامنے آجاتے تھے۔ اس لیے میری نظریں یوروپا کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اچانک میں نے ایک طرف ایسا منظر دیکھا۔ کہ میں مبہوت و ششدر رہ گئی، یوروپا فرعون کے پہلو میں بیٹھی ہوئی مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ وُہ نہایت خوش و خرم تھی۔ خوف کا ذرہ بھر احساس اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھا!

"کیا یہ وہی یوروپا ہے۔ جو مصریوں کو دیکھ کر کانپ کانپ کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی؟ اور اس وقت وہ مصریوں کے شہنشاہ بلکہ دُنیا کے سب سے بڑے عظیم الشان بادشاہ کے پہلو میں نہایت شاداں و فرحاں بیٹھی ہوئی ہے۔" خواصیں مؤدبانہ طور پر اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا۔ اور اپنے تخت سے کچھ فاصلے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھ گئی جشن آدھی رات تک ہوتا رہا۔ فرعون بار بار فرطِ مسرت سے بیقرار ہو ہو کر یوروپا کو اپنی آغوش میں لے لیتا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ رہی تھی:

جشن کے اختتام پر یوروپا نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کو کہا —— ایک خادمہ کی طرح میں اس کے پیچھے چلنے

لگی۔ وہ محل کے سب سے زیادہ خوبصورت، شاندار کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے مجھے بھی اندر بلالیا۔ اور تمام خواصوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ہم چند لمحے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے:

"ماں! میں تیری یوروپا ہی ہوں"

"ہاں! یوروپا میری بیٹی"! میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر یہ آنسو خوشی کے تھے:

"تمہیں میری حالت پر حیرت ہوگی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

میں خاموش رہی۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا:

"خدائے رع تمہارا مرتبہ اور بلند کرے"

"تو میری ماں نہیں ہے؟" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"کیوں نہیں۔ میں تیری ماں ہوں ...... یوروپا! میں بے حد خوش ہوں۔ کہ میری بیٹی، مصر کی ملکہ ......"

"تمہیں خوشی ہے؟" اس نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا:

"بہت زیادہ۔ بھلا میری بیٹی، مصر کی ملکہ بنے۔ اور مجھے خوشی نہ ہو۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟"

اچانک اس نے دروازے کے پاس کسی چیز کو دیکھا:

"وہ کیا ہے؟" اس نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اٹھی۔ دروازے کے پاس پہنچی۔ وہاں سنگِ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اُٹھا لیا۔ اور یوروپا کے پاس آگئی۔

"یہ تو وہی ہے ــــ وہی:" یہ کہکر اس نے صندوقچی کو کھولا۔ اس میں چند ریشمی بال تھے۔ اور ان پہ خون کے چند قطرے جم گئے تھے۔ مجھے بوڑھے "طموس" کا وعدے والا واقعہ یاد آگیا۔ یہ وعدے کی علامت تھی:

"وعدے کی علامت؟" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے ...... مصر کی ملکہ کو ڈرانا چاہتے ہیں؟"

اُس نے صندوقچی کو دور پھینکدیا۔ اور میری طرف مخاطب ہوئی۔

"میں ان ذلیل کتوں کو سخت سزا دوں گی۔ میں مصر کی ملکہ بن کر مصریوں کے خلاف کیونکر رہ سکتی ہوں؟"

"درست ہے!" میں نے کہا:

"اب تم جاؤ!" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میں تمہاری یوروپا ہوں مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھو۔ ملکہ بن کر میں بدل نہیں گئی"۔

میں بہت خوش ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل کر اپنے کمرے کو چلنے لگی ——!

——— (۶) ———

یُونانیوں کا قتل

یوروپا ملکۂ مصر بن چکی تھی جب وُہ شاہی تاج پہنے، خواصوں کے ہجوم میں زرنگار کرسی پر بیٹھ کر سر کو مغرورانہ جنبش دے دیکر اپنے احکام جاری کرتی۔ تو اس وقت میں خود دھوکا کھا جاتی۔ اور یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتی۔ کہ یہ وُہ یوروپا نہیں ہے۔ جو لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی، ماں ماں کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ اس کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ وُہ اب دنیا کی سب سے زیادہ شان و شکوہ والی سب سے بڑھ کر حسین عورت تھی۔ فرعون، جس کا نام ہی سن سن کر لوگ کانپ جاتے تھے۔ اس کا بجان و دل پرستار تھا۔ اپنی خواصوں کے ساتھ وُہ مجھے خادمہ سمجھتی۔ مگر جب کبھی میں خلوت میں اس سے ملتی۔ وُہ مجھے ماں ہی کہکر پکارتی۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ ایک خادمہ کا لڑکا بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اور آتے ہی کہنے لگا:۔

"یونانی قتل کئے جا رہے ہیں!"

"یونانی؟ کہاں؟" میں نے پوچھا:

"صحن میں!"

"کیوں؟"

"ملکہ کے حکم سے"۔

میں جلدی سے اٹھی۔ صحن میں پہنچی۔ یوروپا ایک زریں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دو خواصیں اسے شتر مرغ کا پنکھا جھل رہی تھیں۔ اُس کے پاس ہی مرحوم فرعون کی نورِ نظر، مصر کی سب سے بڑی رقاصہ نفرتیتی ایک معمولی خادمہ کی طرح

کھڑی تھی۔ ان کے سامنے مصری جلاد قہقہے لگا لگا کر ایک ایک یونانی کو ـــ چبوترے پر کھڑا کر کے اس کا سر قلم کر رہے تھے۔ بے شمار سر بُلبلوں کی طرح خون میں تیر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر یونانیوں کی ایک جماعت زنجیروں میں جکڑی ہوئی کھڑی تھی۔ وہیں غموس! ...... وہی پُراسرار بوڑھا جو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ اور جو یوروپا کو لے گیا تھا۔ کھڑا نظر آرہا تھا فضا میں یونانیوں کی دردناک چیخیں، اور دردانگیز التجائیں تڑپ رہی تھیں۔ یوروپا بڑے لطف سے اس خونی منظر کو دیکھ رہی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ یوروپا کی دائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ جلاد برابر اپنا کام کر رہے تھے۔ آہ اس وقت کا منظر کتنا دردانگیز تھا۔ جب کوئی یونانی چبوترے پر کھڑا کیا جاتا۔ وہ بلند آواز سے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو جنبش دے دے کر رحم کی التجا کرتا۔ یوروپا قہقہہ لگا کر اپنے ہاتھ کو جنبش دیتی۔ اور اس کے ساتھ ہی یونانی کا سر کٹ کر خون میں تیرنے لگتا۔ غالباً سرزمین مصر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ایک عورت ایسے وحشیانہ قتل کا حکم دے رہی تھی۔ اور پھر اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ سر کٹتے گئے۔ یہاں تک کہ دو یونانی باقی رہ گئے۔ اب چبوترے پہ بوڑھے غموس کو لایا گیا۔ یوروپا نے اسے دیکھ کر نفرت انگیز قہقہہ لگایا۔ اور جلادوں کو اُسے اپنے پاس لانے کے واسطے حکم دیا۔ غموس اس کے سامنے لایا گیا۔

"کیوں یونان کے بوڑھے کتے! کیا اب بھی تجھے یونانیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟"

"ملکہ مصر......!"

یوروپا نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ کہ تو مصری حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانا چاہتا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"نہیں، ملکہ مصر!"

"نہیں......" وہ غرائی، اور پھر کہنے لگی "تجھے شدید سزا دینی چاہیے۔ مگر میں تجھ پر رحم کھاتی ہوں تجھے جہاز سے پانی میں پھینکا جائے گا۔ اور تیرا بوڑھا جسم مچھلیوں کی مزیدار خوراک بنے گا۔" وہ پھر خادموں سے مخاطب ہوئی۔ جاؤ اسے لے جاؤ۔ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

خدام اسے لے گئے۔ اس کے بعد جلاد چبوترے کی طرف ایک نہایت شکیل وجیہہ یونانی نوجوان کو لائے۔ خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھی۔ وہ چبوترے کی طرف اس طرح بڑھے چلا آرہا تھا۔ گویا ایک فتحمند ہادر اپنے مغلوب دشمن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یوروپا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اور جلادوں کو اُسے پاس لانے کا حکم

دیا۔ جلاد اسے ملکۂ مصر کے سامنے لائے۔

"تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟" یوروپا کا لہجۂ تخاطب بہت حد تک نرم تھا۔

"میرون! یونانی سپاہ کا ایک افسر!"

"تجھے اپنی موت سے ڈر نہیں آتا؟"

"نہیں!"

"تجھے زندہ رہنے کی آرزو ہے تو کہو......"

"اپنے ساتھیوں کو مرتے ہوئے دیکھ کر زندہ رہنا بزدلی سمجھتا ہوں!" اس نے ملکہ کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا!

"کیا اب بھی تیرے دل میں اپنے ساتھیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟"

"ہاں! میرے پہلو میں عورت کا دل نہیں ہے۔ جو وعدہ کر کے مکر جائے۔ اور جو شان و شوکت حاصل کر کے اپنے آپ کو، اپنی حیثیت کو اور اپنے فرض کو بھول جائے!"

"جانتے ہو، تم اس وقت کس کے سامنے کھڑے ہو؟" ملکہ نے خشمگیں لہجے میں کہا!

"میں اچھی طرح جانتا ہوں! بظاہر ملکۂ مصر اور......"

"اور ——؟"

"اور حقیقت میں ایک بزدل، پیمان شکن عورت کے سامنے!"

یوروپا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جلادوں، خواصوں اور خادماؤں پر سناٹا چھا گیا۔ اس کی آنکھوں سے غصے کے شرارے نکل رہے تھے۔ چہرہ فرطِ غضب سے سرخ ہو گیا تھا۔

"یونان کے ذلیل کتے! تمہیں اتنی جرأت......؟"

"مگر یونان کا ذلیل کتا، ایک پیمان شکن عورت سے بدرجہا بہتر ہے ——! سمجھو تم کون ہو، جس سرزمین نے مجھے پیدا کیا۔ کیا تم نے اس کی آغوش میں پرورش نہیں پائی؟"

جلادوں نے اسے پکڑ لیا۔ اور اسے گھسیٹ کر پیچھے لے جانے لگے۔

"اسے قید خانے میں لے جاؤ۔" یوروپا نے جلادوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "میں اسے دنیا کی شدید ترین سزا

دیکر ماروں گی۔ یونان کا ذلیل کتا!"

جلاد اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اس کے بعد یوروپا اٹھی، اور اپنے خاص کمرے کی طرف چلنے لگی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہاں پہنچکر اس نے تمام خواصوں کو رخصت کر دیا۔

"تمام یونانیوں کو میں نے قتل کرا دیا ہے۔ میرا یہ فعل تمہاری نظر میں درست ہے"؟

اُس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"مصر کی ملکہ بہتر سمجھتی ہے!"

"میں اس وقت تم سے پوچھ رہی ہوں" وہ مصری حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانا چاہتے تھے۔ میں یونانی ہوں مگر مصری حکومت یا مصریوں کے خلاف کوئی کارروائی ہوتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں اب مصری ہوں ...... مصر کی ملکہ"!

"مگر ...... یہ ظلم ہے کہ اتنے یونانیوں کو قتل کر وا دیا جائے۔ اور پھر اُن کا جرم بھی کوئی نہ ہو"

"ان کا جرم ....؟! ان کا کوئی جرم نہیں؟ تو کیا کہہ رہی ہے اینجیلی"؟!

یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ اور پھر اتنے تلخ لہجے میں!

"مجھے تنہا چھوڑ دو، تمہارا دماغ صحیح بات سمجھنے سے قاصر ہے"!

میں اُٹھی، اور حیران و مبہوت اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل بھر آیا۔ اور میں رونے لگی!

———(۷)———

شرط

رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی صبح کے واقعے پر غور کر رہی تھی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھی، دروازہ کھولا۔ دروازے پر یوروپا کی ایک خاص خادمہ کھڑی تھی۔ میں سمجھ گئی۔ کہ یوروپا نے بلایا ہے۔ اس لئے ایک لفظ پوچھے بغیر۔۔۔ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا۔ کہ یوروپا ایک قالین پر بیٹھی ہے۔ اور اس کے چہرے سے حسرت و مایوسی ٹپک رہی ہے۔ اس نے مجھے بلا لیا۔ اور خواص کو چلے

جانے کے لئے کہا۔

"صبح میں نے تمہیں چند ناخوشگوار فقرے کہے تھے۔ تم ان سے ناراض تو نہیں ہو گیئں؟" اس نے مجھے مایوسانہ دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ کس قدر پیاری، بھولی بھالی نظر آرہی تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر، مجھے وہی یوروپا یاد آگئی جو مصریوں کے خوف سے ہر وقت ڈرتی رہتی تھی۔۔۔ ڈر ڈر کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔

"نہیں میں تم سے ناراض نہیں ہوں، ملکۂ مصر!" میں نے جواب دیا۔

"ماں! تم مجھے ملکۂ مصر کیوں کہتی ہو؟ میں تمہاری بیٹی یوروپا ہوں، مجھے اسی نام سے پکارو!"

"یوروپا!"

"ہاں ماں!"

میں نے مادرانہ شفقت سے اس کی گردن کے گرد ہاتھ حمائل کر دیئے:

"تم غمگین کیوں ہو بیٹی؟"

"ہاں ماں! میں غمگین ہوں"! اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے "میں عجب مصیبت میں ہوں"۔

"مصیبت؟ میری یوروپا کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی؟؟"

"تم نے نہیں سنا ماں؟ اس نے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ "فرعون دربار کی ایک رقاصہ کو چاہنے لگا ہے۔ میری آنکھوں نے خود فرعون کو اس رقاصہ سے محبت انگیز باتیں کرتا اور اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے دیکھا ہے! اِس وقت بھی وہ اس کی آغوش میں ہو گی"! وہ پھر ٹھہری۔ اور آہ بھر کر کہنے لگی: میں کتنی مصیبت میں ہوں ماں؟"

اس کا چہرہ بہت غمگین ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے برابر آنسو ٹپک رہے تھے۔

"تمہارا رنج فضول ہے: فرعون تمہارے سوا کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا!"

"مگر میں نے اسے رقاصہ کے ساتھ محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے کئی خواصوں نے بھی آکر یہی کہا ہے۔

ماں! میں فرعون کے آغوش میں کسی اور کو نہیں دیکھ سکتی۔"

"خدائے رع تم پر رحم کرے، اتنا غم نہ کرو۔"

"میں عورت ہوں ماں! ایک عورت یہ کیونکر برداشت کر سکتی ہے۔ کہ اُس کا محب کسی دوسرے کو چاہے! کسی دوسرے کو اپنے آغوش میں لے!"

"غم نہ کرو بیٹی! تمہاری یہ مصیبت بہت جلد دُور ہو جائے گی!"

"یہ مصیبت دور ہو جائے گی ...... ؟؟"

وہ ذرا ٹھہری اور پھر کہنے لگی۔ اس کا لہجہ پُرجوش ہو گیا تھا۔

"میری مسرتوں سے بھری ہوئی زندگی میں غم اور دُکھ کے زہر ہلاہل کو بکھیرنے کے واسطے یہ زہریلی ناگن کہاں سے آگئی؟ صبح کے وقت وہ دربار کی ایک رقاصہ تھی۔ اور میری معمولی سی خادمہ، مگر چند گھنٹوں سے وہ میری خونخوار دشمن بن گئی ہے۔ میں اس کا سر کچل دینا چاہتی ہوں ...... اُسے تڑپتے ہوئے ۔۔۔ سسکتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں ....

ماں، بتاؤ میں کیا کروں؟؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ یوردیا! فرعون تمہارا ہے۔ اور تمہارا رہے گا۔"

اس نے مجھے حسرت بآغوش نگاہوں سے دیکھا۔ اور اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیا۔ آنسو پھر اُسکی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"تم پھر رونے لگیں بیٹی؟"

"کیا کروں؟ آہ محبت میں عورت کتنی کمزور، کتنی مجبور ہو جاتی ہے؟"

میں اس کے آنسو پونچھنے لگی، اور ساتھ ساتھ اسے تسلی بھی دینے لگی۔

"اگر فرعون رقاصہ پر مہربان ہو گیا ہے۔ تو تمہیں ہرگز غم نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ رقاصہ آخر رقاصہ ہے اور تم؟ مصر کی ملکہ! دنیا کی سب سے زیادہ عظمت و جبروت والی عورت!!"

"اگر ایسا ہوتا۔ تو فرعون مجھے کیوں چھوڑ کر ایک ذلیل رقاصہ سے محبت کرنے لگتا؟ ماں میں مصر کی ملکہ بننا نہیں چاہتی، میں فرعون کی محبت چاہتی ہوں!"

یہ فقرہ سن کر میں متحیر ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"اس وقت یہاں کون آسکتا ہے؟" یوروپا نے متحیرانہ کہا۔

دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے "نفرتتی" کھڑی تھی

میں ملکہ مصر سے ملنا چاہتی ہوں" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس سے پیشتر کہ میں اس سے کچھ کہتی۔ یوروپا نے اس کی آواز سنکر اُسے اپنے پاس بلالیا۔ اس وقت اسکی شاہانہ عظمت سخت مجروح تھی۔

"اس وقت تمہیں یہاں آنے کی کیونکر جرأت ہوئی؟" یوروپا نے اس سے پوچھا۔

"میں ایک نہایت ضروری بات ملکہ مصر سے کہنا چاہتی ہوں" اس نے جواب دیا۔

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

نفرتتی نے میری طرف دیکھا اور چپ ہو گئی ..... پھر مجھے چلا جانے کے واسطے کہا۔

نہیں "آگیبتی یہیں ٹھہرے گی۔ وہ میری ہمدرد ہے۔ اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ کہو کیا بات ہے؟"

"میں یہ کہنے آئی ہوں...... کہ فرعون رقاصہ آشتی سے محبت ...... میں نے مناسب سمجھا۔ کہ ملکۂ مصر کو یہ بات بتادوں!"

"دیکھا آگیبتی!" یوروپا نے مجھ سے مخاطب ہو کر مغمومانہ انداز میں کہا۔ "یہ بات کس کس کو معلوم نہیں؟"

میں خاموش رہی۔ یوروپا اٹھ کر کمرے میں بیقرارانہ ٹہلنے لگی!

ذلیل رقاصہ ..... زہری ناگن ..... میں اس کا سر کچل دونگی" اس قسم کے الفاظ اُس کے لبوں سے نکل رہے تھے۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ وہ پھر ہمارے پاس بیٹھ گئی!

"لیکن ملکۂ مصر! میں صرف یہی بات نہیں کہنے آئی" نفرتتی نے کہا۔ یوروپا نے اسے متعجبانہ دیکھا!

"میں۔ ملکۂ مصر! تم سے ایک چیز مانگنے آئی ہوں" نفرتتی نے کسی قدر جوش سے کہا۔

"صاف صاف کہو، نفرتتی!"

"میں تم سے ایک شخص مانگنے آئی ہوں"۔

"ایک شخص؟ کون؟" ملکۂ مصر نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

"میں ملکۂ مصر سے یونانی نوجوان 'میرون' مانگنے آئی ہوں!"

"کیا کہہ رہی ہے تو خادمہ؟"

"میں خادمہ ہوں ...... مصر کی ملکہ! مگر محبت کے راستے میں، ہم دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے۔ تم فرعون سے محبت کرتی ہو۔ اس لئے اسے کسی دوسری عورت سے محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں، مجھے میرون سے محبت ہو گئی ہے۔ اس لئے میں اُسے موت کے پنجے میں نہیں دیکھ سکتی"۔

"ایک خادمہ کے کہہ دینے پر، میں ایک گستاخ شخص کی زندگی بخش دوں ...... ؟ یہ ——— یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!"

"ملکۂ مصر! یہ بھی دیکھو، تمہیں بھی فرعون سے محبت ہے!"

"میں زیادہ گفتگو سننا نہیں چاہتی۔ جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ!"

"خدائے رع کے جلال کے لئے مجھے 'میرون' دیدو!"

"اگر تم نے زیادہ اصرار کیا۔ تو اس کے ساتھ تمہیں بھی سخت سزا دے کر ہلاک کیا جائے گا"۔

یہ سُنکر نفرتیتی کانپ اُٹھی۔

"مجھ پر رحم کرو، ملکہ!"

"میں میرون کا ایک بال بھی تمہیں نہیں دوں گی۔ میرون یونان کا ذلیل کتا!"

"ملکۂ مصر! یہ سن کر کہ فرعون ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا ہے۔ یہ دیکھ کر، کہ تمہارا محبوب ایک دوسری ہستی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے، تم کتنی بیقرار ہو گئیں ... مگر اس عورت کے دل کا اندازہ لگاؤ، جس کا محبوب موت کے پنجے میں گرفتار ہے ..... مجھ پر رحم کرو ملکہ!"

یورو با ٹہلنے لگی، نفرتیتی منت سماجت کرتی گئی۔ میں خاموشی سے باری باری ان دونوں کے چہروں کو دیکھتی رہی یکایک یوروبا کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور وہ نفرتیتی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور اُسے غور سے دیکھ کر کہنے لگی :-

"میں ایک شرط پر میرون تمہیں دے سکتی ہوں"۔

"کس شرط پر، ملکہ؟" نفرتتی نے جلدی سے کہا۔

"تم اس شرط کو پورا کرو گی؟"

"کہو ملکہ وہ کونسی شرط ہے 'میرون' کی جان بچانے کے واسطے میں سب کچھ کر سکتی ہوں"۔

"تمہیں اپنے محبوب کی جان بچانے کے واسطے ایک ہستی کا خاتمہ کرنا ہو گا!"

"ملکہ!"

"تمہیں کسی نہ کسی طرح اس ذلیل رقاصہ کو ہلاک کر دینا ہو گا..... !"

مجھے امید تھی۔ کہ یوروپا نفرتتی سے یہ شرط کہے گی!

"رقاصہ کو...... ؟ فرعون کی...... ؟؟"

"بس بس! میں آگے سننا نہیں چاہتی۔ یہ شرط پوری کرنے پر تیار ہو؟؟"

"میں یہ شرط پوری کروں گی، ملکہ!"

"جب میں رقاصہ کی نعش دیکھ لوں گی۔ تو میرون آزاد کر کے، تمہیں دے دوں گی۔ اس وقت تک وہ قید میں رہے گا"

"ملکہ مصر!"

"مجھ پر اعتبار کرو نفرتتی! کیا تم وعدہ کرتی ہو۔ کہ اس شرط کو بہت جلد پورا کرو گی؟؟"

نفرتتی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ساتھ ہی اپنے سر کے چند بال نوچ کر یوروپا کو دیئے۔ یوروپا نے بھی اپنے سر کے چند بال دیدیئے۔

"دیکھو اپنا وعدہ بھول نہ جانا۔ 'میرون' کی زندگی تمہارے وعدے کی تکمیل پر منحصر ہے"۔

"میں اپنے محبوب کی جان بچانے کے لئے یہ شرط ضرور پوری کروں گی"۔

"جاؤ، اب چلی جاؤ!" ملکہ نے کہا۔

"کل شام تک میں یہ شرط پوری کر دوں گی"۔ یہ کہکر وہ اٹھی۔ اور کمرے سے خاموشی کے ساتھ نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد یورو پا نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

"یہ عجیب واقعہ ہے" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں! محبت میں عورت کیا کچھ نہیں کرتی" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو شفاف قطرے نکلے پھر آہستہ آہستہ اسکی آنکھوں میں نیند آنے لگی۔ جب وہ سو گئی۔ تو میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

(۸)

خزانے کی تلاش

رقاصہ مسموم شراب پلا کر مار ڈالی گئی۔ یوروپا نے حسب وعدہ یونانی نوجوان میرون کو آزاد کر دیا۔ رقاصہ کی موت کے بعد یوروپا کے راستے میں کوئی بھی حائل نہ تھا۔ فرعون اسے پہلے سے بھی زیادہ چاہنے لگا۔ اور ملکہ مصر کو وہ عظمت، وہ اقتدار حاصل تھا جو آجتک کسی کو حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اپنی شان و شوکت کی نمائش کی غرض سے، وہ انتہائی طور پر فضول خرچ ہو گئی تھی شاہی خزانہ مسلسل اسکی آرائشوں اور زیبائشوں میں صرف ہو رہا تھا۔

رقاصہ کو مرے ہوئے بیس دن گزر چکے تھے۔ ان بیس دنوں میں اس نے متعدد جشن کئے جن میں ملکہ نے ہیروں اور موتیوں کو پتھر کے معمولی ٹکڑے سمجھ کر اپنے خادموں میں لٹا دیا۔ خزانے کا بہت بڑا حصہ ان الٹے تلکوں میں ختم ہو گیا۔ مگر یوروپا کی فضول خرچی برابر بڑھ رہی تھی۔ اور دولت کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے خلوت میں کہتی "میں نے سنا ہے۔ کہ یہاں کھنڈروں میں خزانہ دفن ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کہ مصری اپنے حکمرانوں کے تابوتوں میں دولت بھی رکھ دیتے ہیں۔ مجھے دولت کی سخت ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟؟"

"نہیں، ملکہ مصر! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟" وہ غصے سے کہتی۔

"کھنڈروں کا تو مجھے پتہ نہیں جانتی۔ اور تابوتوں سے ہم خزانہ کسی صورت میں بھی نہیں نکال سکتے۔ کیونکہ یہاں مردوں کے احترام کو مجروح کرنا، بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس جرم کو خدائے رع کبھی معاف نہیں کر سکتا۔" یہ سن کر وہ مجھ سے خفا ہو کر چلی جاتی۔

ایک چاندنی رات کو ہمارا جہاز مادرِ نیل کے آغوش میں آہستہ آہستہ رواں تھا۔ یورو پا زرنگار کرسی پر متمکن تھی۔ اس کے پہلو میں نہایت قیمتی، چمکتے ہوئے موتیوں کا ہجوم بکھرا پڑا تھا۔ اور اسکے سامنے بے شمار حبشی خدام، پُرامید نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یورو پا مفتخرانہ شان سے شراب کا ایک گھونٹ پیتی۔ چند موتیوں کو ہوا میں پھینکتی، حبشی انہیں حاصل کرنے کے واسطے دامن پھیلا کر اِدھر اُدھر بیقرارانہ بھاگنے لگتے۔ اور اسی کوشش میں ان میں سے چند نیچے پانی میں گر پڑتے۔ یورو پا قہقہہ لگاتی۔ اور پھر موتیوں کو پھینکتی۔ یہ ہولناک و دردانگیز منظر اس کے واسطے بہت دلچسپ کھیل تھا۔ موتیوں کی کثیر تعداد پانی میں گر رہی تھی۔ اور ان کے ساتھ متعدد حبشی بھی اپنی جانیں ضائع کر رہے تھے۔ ...... کافی دیر تک یہ کھیل جاری رہا۔ آخر جب موتی ختم ہو گئے۔ تو یورو پا کے چہرے پر خفگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اپنا دلچسپ کھیل جاری رکھنے کے واسطے اب اس کے پاس سامان نہیں تھا۔ اس نے شراب کے زریں ساغروں کو جہاز سے نیچے پھینک دیا۔ اور باقی ظروف کو بے پروایانہ پاؤں سے ٹھکراتی ہوئی خلوت میں چلی گئی۔ میں ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ مظلوم حبشی غوطے کھا کھا کر اپنی جان بچانے کے واسطے، جہاز کے تختے کو پکڑ لیتے تھے۔ ملاح ان کی حالتِ زار کو دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ اور چپوؤں سے ان کے سروں کو مار رہے تھے کہ ایک طرف سے غضب ناک آواز سنائی دی۔

"خاموش کتو!"

مَیں نے دیکھا۔ کہ یورو پا ایک طرف پردہ ہٹا کر خشمگیں نظروں سے ملاحوں اور خادموں کو دیکھ رہی ہے۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ یورو پا پھر اندر چلی گئی۔ جانے سے پیشتر اُس نے مجھے دیکھا۔ مگر بے پروائی سے۔ یہی وُہ یورو پا تھی۔ جو کبھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اور یہی یورو پا تھی جسے میری ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔

چاند ہمارے جہاز کے عین اوپر ضیا باری کر رہا تھا۔ سکوت کو، ڈوبتے ہوئے حبشیوں کی دردناک آواز زخمی کر رہی تھی۔ مَیں کافی دیر تک دریا کے مناظر کو دیکھتی اور ملاحوں کی گفتگو کو سُنتی رہی۔ وُہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اِسی دوران میں میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک میری پشت پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میری آنکھ کُھل گئی۔ یورو پا جس کا چہرہ وفورِ مسرت سے چمک رہا تھا میرے پاس کھڑی تھی۔

"چلو، میرے ساتھ ...... "

مَیں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور اس کے ساتھ ایک طرف گئی۔ وہاں نفرتیتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں

تھا۔ یوروپا نے نفرتیتی کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اور خود میرے پاس بیٹھ گئی۔

"تم نے تو مجھے کچھ نہ بتایا۔ مگر میں نے آخر معلوم کر ہی لیا نا؟"

"کیا؟ ملکۂ مصر!"

"خزانہ ... !"

"خزانہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی!"

"ملکۂ مصر! میں نے تمہاری باتیں سمجھی نہیں۔"

یوروپا بے حد خوش تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ماں! تمہیں معلوم ہے۔ خزانے کا پتہ کس نے بتایا ہے؟"

"نہیں یوروپا!"

"میں تمہیں بتاتی ہوں۔ نفرتیتی نے اس احسان کے بدلے، جو میں نے اس پر کیا ہے۔ ایک ایسے خزانے کا پتہ بتایا ہے جو صدیوں ختم نہ ہوگا۔"

"مگر ... یوروپا!"

"نہیں، میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔" اس نے میرے الفاظ کاٹ کر کہا۔ "مجھے نفرتیتی پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ اگر خزانہ نہ نکلا۔ تو میں اسے اور میرون کو فوراً قتل کروا دوں گی۔"

"خدائے رع کے ... ..."

"اس وقت میں اور کچھ بھی سننا نہیں چاہتی ... مجھے دولت کی از حد ضرورت ہے۔ کل رات کو، میں نفرتیتی اور تم وہاں چلیں گے۔"

"کہاں؟"

"کہاں؟ ... جہاں وہ لے جائیگی!"

"میں تم سے بڑھ کر جانتی ہوں بیٹی!" میں نے اسے نرمی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "کھنڈروں میں کوئی خزانہ نہیں ہے۔ اور

تابوتوں سے ہم ... ... کسی صورت بھی دولت نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے"!

"کل تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے"! اس نے غضبناک لہجے میں کہا۔ میں چپ ہو گئی۔

"میں چاہتی ہوں۔ کہ ہمارے ساتھ کوئی مرد بھی جائے ... ... ایک ایسا مرد جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔ کہ وہ راز کو پردۂ اخفا میں رکھے گا"!

"ایسا مرد کون ہو سکتا ہے"؟

"خادموں پر مجھے اعتبار نہیں ہے"!

آخر یہ بات طے ہوئی۔ کہ میں اپنے بیٹے 'زاعموت' کو ہمراہ چلنے کے واسطے کہوں۔ دوسرے دن صبح کو میں 'زاعموت' کو ساتھ لیکر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

"دیکھو، کسی کو اس کے متعلق خبر نہ ہو" ملکہ نے زاعموت سے کہا!

"خدائے رع کی قسم! میں اپنے وعدے کو پورا کروں گا"

قسم کھانے کے بعد میں اور میرا بیٹا، وہاں سے واپس آ گئے!

—— (۹) ——

ایک تحیرزا واقعہ!

جب رات کی تاریکی پھیل گئی۔ تو میں نفرتتی، یوروپا، اور زاعموت محل سے نکلے۔ نفرتتی ہماری رہنمائی کرنے لگی۔ اس نے ہاتھ میں شمعدان پکڑا ہوا تھا۔ اور زاعموت کے ہاتھ میں کدال تھا۔ ہم خاموشی کے ساتھ چلنے لگے۔ ہر طرف خاموشی مسلط تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ ملاح گیت گاتے ہوئے کشتی کھینے لگے۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ کہ اُن کی کشتی میں کون سوار ہیں۔

آخر کار ہماری کشتی کنارے پر جا لگی۔ ساحل کے پاس درختوں کے لرزاں سائے، رینگتے ہوئے سیاہ سانپوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پانی میں ستاروں کے عکس ربۃ آئی سیز کے تاج کے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔

ہم کشتی سے اُترے۔ نفرتتی ہمارے آگے آگے چلنے لگی —— چاروں طرف پُراسرار اور وحشت ناک خاموشی چھائی

ہوئی تھی۔ میں یوروپا کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت افزا تصورات کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ اس کے برخلاف جب میں آگے بڑھ کر نفرتتی کے چہرے کو دیکھتی تھی۔ تو وہاں رنج و غم نمودار تھا۔ وہ چلتے ہوئے بار بار ٹھہر جاتی تھی۔ متجسسانہ ادھر اُدھر دیکھتی تھی۔ اور پھر چلنے لگتی تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم معبد "لے بیر نظ" کے پاس پہنچ گئے۔ نفرتتی رُک گئی۔

"اب ہماری منزلِ مقصود قریب آ گئی ہے۔" اس کے لبوں سے نکلا۔

"تو جلدی چلو۔" یوروپا نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

نفرتتی نے اپنا رخ معبد کے دائیں پہلو کی طرف کیا۔ اور چلنے لگی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک بڑا سا تودہ نظر آیا۔ نفرتتی تیزی سے اُس کے اوپر چڑھنے لگی۔ اور ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ ہم بھی آہستہ آہستہ چڑھنے لگے۔ شمعدان نفرتتی کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے تاریکی میں ہمیں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے بعد وہ نیچے اُتری۔ اور خاموشی سے ایک طرف کو قدم اٹھانے لگی۔ ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے رواں تھے۔ ہمارے آس پاس درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ "لے بیر نظ" کی چوٹی اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ یکایک نفرتتی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"ہم جائے مطلوبہ پر پہنچ گئے؟؟؟" یوروپا نے مضطربانہ کہا۔

"ہاں، ملکۂ مصر!" یہ کہکر وہ چند ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے اوپر چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر ہمیں ایک فراخ جگہ ملی۔ اس جگہ کو طے کرنے کے بعد پھر سیڑھیاں تھیں۔ ہم اُن سے نیچے اُترے۔ اور ایک شکستہ دروازے میں سے گزرے۔ ہمارے دونوں طرف سنگِ سماخ کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ چند قدم طے کرنے کے بعد نفرتتی نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"اب ہماری منزلِ مقصود آ گئی ہے۔"

آگے پھر سیڑھیاں تھیں۔ ان سے نیچے اترنے کے بعد ہم نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔ میں نے مدھم روشنی میں دیکھا۔ کہ ہمارے اِرد گرد لکڑی کے بڑے بڑے صندوق پڑے ہیں۔ میں نے ایک صندوق کو کھولا۔ اس میں ایک حنوط شدہ لاش تھی۔ میں نے جلدی سے اُسے بند کر دیا۔ اس وقت ہم قبرستان کے نچلے حصے سے گزر رہے تھے۔ خوف و ہراس مجھے پر طاری تھا۔ میرا بہادر بیٹا بھی ڈر رہا تھا۔ میں یوروپا کے چہرے کو نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ وہ نفرتتی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے ایک شگاف میں سے مدھم روشنی دکھائی دی۔ اور یہ دیکھ کر میں سخت متعجب ہوئی۔ کہ نفرتتی اس شگاف کی

طرف جارہی ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ وہ چھوٹا سا دروازہ ہے۔ نفرتتی نے ہاتھ بڑھا کر شمعدان کو دروازے کے باہر رکھدیا۔ اور خود بھی وہاں سے گزر گئی۔ یکے بعد دیگرے ہمیں بھی وہاں سے گزرنا پڑا۔ وہاں پہنچ کر اور یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ نہ تو وہاں نفرتتی ہے۔ نہ شمعدان پتھر کی ایک چٹان کے اوپر دو تین چراغ جل رہے تھے۔ میں نے یورو پا کا ہاتھ پکڑا۔ اور چراغوں کی طرف چلنے لگی۔ ابھی ہم اس کے قریب بھی نہ پہنچے تھے۔ کہ ہمارے کانوں میں نفرت انگیز قہقہوں کی آواز آئی۔ ہم ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

"آگے آجاؤ" وہیں سے تحکمانہ لہجے میں آواز آئی۔

ہم حیران و ششدر آگے بڑھے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میں لرز گئی۔ بوڑھا عموس چٹان پر بیٹھا ہوا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے پاس نفرتتی اور میرون کھڑے تھے۔ ایک طرف چند یونانی خنجر ہاتھ میں پکڑے اس طرح کھڑے تھے۔ گویا ابھی ہم پر حملہ کر دینگے!

"میرون! انہیں میرے احکام کے مطابق بند کر دو!" اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو دو مضبوط ہاتھوں میں پایا۔ پھر ایک تاریک جگہ پہنچ کر دھکیل دی گئی۔ میں دھم سے نیچے گر پڑی۔ بدن پر چوٹیں آئیں۔ اور مجھے اپنا بدن چکنا چور ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں اتنی تاریکی تھی۔ کہ مجھے اپنے پاس کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ پتھروں کے ٹکڑے اور مٹی مجھے اپنے گرد پھیلی ہوئی محسوس ہوئی معلوم نہیں میں کتنی دیر تک وہاں پڑی رہی۔ شدید ضربات نے مجھے بیدم کر رکھا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو میرے دل پر خیال پیدا ہوا۔ کہ اگر میں یونہی گرفتار اور بند رہی۔ تو یقینا مر جاؤں گی۔ اس کے آتے ہی میں نے چپے چپے کو ٹٹولنا شروع کر دیا اس وقت مجھے اپنی اتنی فکر نہیں تھی جتنی یورو پا کی ــــ میری بیٹی یورو پا! اسی اثنا میں میرا ہاتھ ایک شگاف میں جا پڑا۔ اسکی مٹی خود بخود گرتی جارہی تھی۔ اس لئے مجھے اس کے کشادہ کرنے میں زیادہ تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا جب یہ کافی کشادہ ہو گیا۔ تو میں اس سے دوسری طرف گئی۔ وہاں مجھے سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے اسے جنبش دی۔ وہ اٹھنے لگی۔ میں نے قدم اٹھائے۔ یکایک دھم سے میں پھر گر پڑی۔ ہاتھوں سے اپنے آس پاس کی چیزوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ میرا ہاتھ ایک انسانی جسم پر پڑا۔ تاریکی اس قدر تھی۔ کہ کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ میرا ہاتھ ایک چہرے سے مس کر رہا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ میں ایک تابوت کے اندر گر پڑی ہوں۔ میں کانپ اٹھی ــــ لرز اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر ڈھکنے کو اٹھایا۔ اور

باہر نکلی۔ اور پھر آگے بڑھنے لگی۔ چند قدم طے کرنے کے بعد میں پھر لاشوں کے درمیان گر پڑی۔ خوف و دہشت سے میرا دم نکلا جاتا تھا۔ میں آگے بڑھتی گئی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے مدھم سی روشنی نظر آئی ــ تیزی سے اس طرف پہنچی۔ وہاں ایک شگاف تھا کافی کشادہ، میں بآسانی اس میں سے گزر گئی۔ میرے ساتھ ساتھ دیوار جا رہی تھی۔ اور دائیں طرف چند قدموں کے فاصلے پر مٹی کے ایک تودے پر چراغ جل رہے تھے۔ ان کے پاس بوڑھا عموس بیٹھا تھا۔ پاس ہیرون تھا ــ اور چند ایک یونانی بھی تھے مگر چونکہ کچھ تاریکی تھی ۔ اس لئے انہیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یوروپا بوڑھے عموس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار نمودار تھے۔

"کیوں ملکہ! آخر تو ہمارے جال میں پھنس گئی نا؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

یوروپا خاموش کھڑی تھی۔

"تو سمجھتی تھی۔ کہ عموس جہاز سے گر کر مر گیا ہو گا ... مگر میں زندہ ہوں، تجھے دنیا کی شدید ترین سزا دینے کے لئے زندہ ہوں۔ تو نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہمارے بھائیوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ تیری بکا بوٹی کر دوں۔"

اس کے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ اس کے سینے کے پاس فرطِ غضب سے لرزنے لگے۔

"بتا اب کیا چاہتی ہے۔ فاقوں سے تڑپ تڑپ کر جان دینا یا ... ابھی۔"

"عموس!" یوروپا نے بلند آواز میں کہا:

"کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔ اس وقت تم مصر کے شاہی محل میں نہیں ہو ...... اپنی حالت کا اندازہ لگاؤ۔ میرے ایک اشارے سے تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر میں تمہیں سزائیں دے کر مارنا چاہتا ہوں۔ ایک غدار پیمان شکن عورت کو سخت سزائیں دے کر مارنا چاہیئے۔ اس وقت تم "نفرتتی" پر لعنتیں بھیج رہی ہو گی ... کہ اس نے تم سے دغا کی۔ مگر یہ بھی سمجھو تم کون ہو۔ اس نے مصری عورت ہو کر یونانیوں کی مدد کی۔ اور تم نے یونانی ہو کر اپنے بھائی یونانیوں کو سخت بے رحمی کے ساتھ اپنے سامنے قتل کروا دیا۔ بتاؤ تم میں سے زیادہ ذلیل، زیادہ دغا باز کون ہے؟؟ ...

... پیمان شکن عورت! اب تو تڑپ تڑپ کر یہاں جان دے گی۔ تمہارے ساتھی بھی یہیں مریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور یوروپا کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہاتھوں کو پکڑا۔ اور بلند آواز میں

کہنے لگا:-

"بتاؤ، تم یونانی نہیں ہو۔ یونان کی سرزمین نے تمہیں زندگی نہیں بخشی؟؟ زیوس تجھے ابدی عذاب میں مبتلا کرے۔ تم نے اپنے بھائیوں کو قتل کروا کر خوشی محسوس کی۔"

"عموس"! یوروپا نے دوبارہ کہا۔ اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

"مَیں اب بھی تجھے آزاد کر سکتا ہوں۔ تیری زندگی بچا سکتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔ بتاؤ اس شرط کو پورا کرو گی؟؟"

یوروپا خاموش رہی۔

"تمہیں ... تمہیں فرعون کو زہر دے ... ... نا ہوگا۔ اُس کی موت کے بعد بھی تم ملکۂ مصر رہو گی۔ پھر ہمیں مصریوں سے بڑھ کر دولت و مرتبہ دینا ہوگا۔ .... بولو یہ شرط منظور ہے؟؟"

"فرعون کو زہر ... ؟؟"

"ہاں، یوروپا! میری بیٹی! مصر کی ملکہ!! تجھے یہی کرنا ہوگا۔ ہزاروں یونانیوں کو بے رحمانہ قتل کیا گیا ہے۔ اُن کے خون کا ہر قطرہ یہی چاہتا ہے۔ تم یونانی ہو۔ ملکۂ مصر کا غرور تجھ سے تیرا یہ حق نہیں چھین سکتا۔ بولو جواب دو؟"

یوروپا خاموش رہی۔

"تمہیں یہ شرط منظور ہے"! عموس نے یہ کہتے ہوئے، اُس کی پیشانی پر خنجر سے زخم لگایا۔ اس میں سے خون بہنے لگا۔ میں ڈر گئی۔ کہ یہ ظالم کیا کرنے لگا ہے۔

"اس کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھو۔ اور خدائے زیوس کے جلال کی قسم کھا کر وعدہ کرو۔ کہ تم ہماری شرط پوری کرو گی۔"

میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب یوروپا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔

"اب تم آزاد ہو۔ اور ابھی محل میں پہنچائی جاؤ گی۔"

عموس کے حکم سے میرون نے ایک طرف ایک بڑا سا پتھر ہٹا دیا۔ عموس نے یوروپا کا ہاتھ پکڑا۔ اور وہاں سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باقی یونانی بھی باہر چلے گئے۔ میرے سامنے باہر نکلنے کا راستہ موجود تھا۔ مگر میں نہیں نکل سکتی تھی۔ ایک تو مجھے اپنے بیٹے زا عموت کی فکر تھی۔ اور دوسرے مجھے یہ بھی خوف تھا کہ جونہی میں باہر نکلی۔ وہ مجھے

پھر گرفتار کرلیں گے۔ اچانک پاس ہی ایک شگاف نظر آیا۔ میں نے چراغ اٹھا کر اس کے اندر دیکھا۔ زاعموت ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ اور اُسے شگاف میں سے نکل کر اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ جب وہ میرے پاس آ گیا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ اس کے زخموں سے خون بہ رہا ہے۔ سر کے بال بھی خون میں شرابور ہیں مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں رہائی حاصل کرنا تھی۔

"ہاں! اب ہمیں یہیں مرنا ہوگا۔ ملکہ مصر کہاں ہے؟؟"

"وہ ... وہ چلی گئی!"

"چلی گئی، کہاں؟؟"

"وہ یہاں سے نکل گئی ہے۔ مجھے بھی راستہ معلوم ہے۔"

"تو ہم کیوں نہ نکلیں۔"

"باہر یونانی کھڑے ہیں۔"

"کوئی پروا نہیں۔" زاعموت نے پُر جوش آواز میں کہا۔

ہم اسی راہ سے باہر نکلے۔ باہر کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ستارے چمک رہے تھے۔ ہمیں کوئی یونانی نہ ملا۔ ہم تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ بہزار دقت ساحل نیل پر پہنچ گئے۔ اب محل تک جانا آسان تھا۔

———(۱۰)———

فرعون کو زہر دیا جاتا ہے

جب ہم محل میں پہنچے۔ صبح کی روشنی بتدریج پھیل رہی تھی۔ میرا دل یورو پا سے ملنے کے واسطے بہت بیتاب تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے زاعموت کے زخموں پر کپڑا باندھ دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سو گیا۔ میرے جسم کے ریشے ریشے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ سوچنے سے قاصر تھا۔ میں لیٹنے کو تو لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں؟ آخر جب سورج کی کرنیں کھڑکیوں سے داخل ہو ہو کر میری آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ تو میں اٹھی۔ اور یورو پا کو تلاش کرنے لگی۔ ابھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ کہ میرے کانوں میں قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میرے پاس چند خواصیں کھڑی ہوئی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ

وہ ایک طرف چلی گئیں۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھی۔ قہقہوں کی آواز پھر میرے کانوں میں آئی۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد میں نے دیکھا۔ کہ فرعون تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کے سامنے یوروپا سنگِ مرمر کے ایک چبوترے کے ساتھ کھڑی ہے۔ چبوترے پر شراب سے بھرے ہوئے ساغر رکھے ہوئے ہیں۔ یوروپا نے پاؤں میں سنہری چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ اور اس کا جسم نیم عریاں تھا۔ فرعون سحرزدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ تمام حسین و جمیل اداؤں سے اسے مغلوب کر رہی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر یہ منظر دیکھنے لگی۔

یوروپا نے ایک سنہری صندوقچے سے دو چمکتے ہوئے موتی نکالے۔ اور انہیں ساغر میں ڈال دیا۔ وہ ساغر فرعون کی طرف بڑھایا۔ اس نے چند گھونٹوں میں اسے ختم کر کے ساغر کو پرے پھینک دیا۔ اس کے بعد یوروپا نے دو موتی اور نکالے۔ انہیں بھی ساغر میں ڈال کر پی لیا۔

"میں ایک چیز کی کمی محسوس کر رہی ہوں فرعون!" یوروپا نے قہقہہ لگایا۔ اور دلربایانہ انداز سے فرعون کو دیکھنے لگی۔

"کونسی چیز؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی چیز ہے۔ جو فرعون تمہیں نہیں دے سکتا؟"

"مجھے ایک چیز کی ضرورت ہے!"

"کہو، وہ کیا چیز ہے؟"

"وہ چیز" یوروپا نے چند موتی اور نکالے اور انہیں ساغر میں ڈال کر پی گئی۔

"تم سمجھتے ہو۔ کہ مصر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی جا سکتی؟"

"ہاں!" فرعون نے اٹھ کر کہا۔ "فرعون کی عظمت و قوت کے سائے میں رہ کر ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ فرعون کے اقتدار کی توہین ہے!"

"جہاں تک دولت کا تعلق ہے۔ یونان مصر پر فوقیت رکھتا ہے۔" یوروپا نے پھر قہقہہ لگایا۔

"یونان؟ چند دن کے بعد یونان کی تمام دولت تم اپنے قدموں پر بکھری ہوئی پاؤ گی۔"

"ایسا ہو سکتا ہے؟؟"

"فرعون کی طاقت ایسا کر سکتی ہے!"

"مجھے دولت کی سخت ضرورت ہے۔"

"چند دن تک دنیا کی تمام دولت تمہیں حاصل ہو جائیگی۔"

یوروپا نے ایک ساغر اٹھایا۔ اور اُسے فرعون کے ہاتھوں میں دیدیا۔

"فرعون کی محبوبہ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کر سکتی۔" اس نے محبت انگیز نظروں سے یوروپا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور ساغر کو منہ سے لگا لیا۔ اچانک یوروپا کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اور ساغر کو فرعون کے لبوں سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا۔ فرعون مبہوت و ششدر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے اس میں ...... کوئی موتی نہیں ڈالا تھا۔" یوروپا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اوہو!" فرعون نے قہقہہ لگایا...... "مگر تم کانپ کیوں رہی ہو۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے؟"

"میرے چہرے کا رنگ زرد ہے، واقعی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ صاف طور پر مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے چند موتی ایک ساغر میں ڈالے۔ اور اُسے فرعون کی طرف بڑھایا۔ فرعون نے اسے ختم کر کے یوروپا کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

"یونانی عورت!" یکایک مجھے قریب سے بہت آہستہ آواز سنائی دی۔

یوروپا تڑپ کر اٹھی۔ اور میرے پاس آکر دیکھنے لگی۔ میں دیوار سے لگ گئی۔

"ذلیل بوڑھے!" یوروپا نے بلند آواز سے کہا۔ فرعون بھی اٹھ بیٹھا۔ اور میرے پاس ہی سے عموس کو گھسیٹتے ہوئے تخت کے پاس لے لیا۔ ابھی تک ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

"تم کون ہو؟" فرعون نے گرجتے ہوئے کہا۔

"یوروپا! یونانی عورت! تمہارا وعدہ"۔ عموس نے یوروپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس ذلیل بوڑھے کو دیکھنا نہیں چاہتی۔" یوروپا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"فرعون نے عموس کی گردن پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ اور بلند آواز سے خادموں کو بلایا۔ چند خادم وہاں آگئے۔ فرعون کے اشارے سے اُنہوں نے عموس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے۔ یوروپا وہاں کھڑی رہی۔ اور اس ہولناک منظر کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھتی رہی۔

جب خادم چلے گئے۔ تو اُس نے خود کو فرعون کی آغوش میں دیدیا ــــ!

میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرا بیٹا انتظار کر رہا تھا!

اے معبدِ رع کے محافظ! میں نے تمام واقعات تمہیں سنا دیئے ہیں۔ میں نہیں جانتی۔ آگے کیا ہوگا!

(یہاں پہنچ کر آگیبطی کا بیان ختم ہو جاتا ہے، آگے بیان اس کے بیٹے "زاموت" کی زبانی ہے!)

ـــــــــ(۱۱)ـــــــــ

دردناک انجام

اے معبدِ رع کے محافظ! چونکہ میری ماں نے تجھ پر اعتبار کیا تھا۔ اور تیری خواہش کو پورا کیا تھا۔ اس لئے میں بھی تیری خواہش کو پورا کروں گا۔ اور تجھے آخری واقعہ بھی سُنا دونگا۔ فرعون کو زہر دیا گیا تھا۔ مگر کم مقدار میں، اور اس وقت اس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ یورو پا نے سم آلود شراب کا ساغر اس کے لبوں سے ہٹا لیا تھا!

جس صبح یہ ہولناک واقعہ پیش آیا۔ اس کے چند دن بعد ایک رات محل کے صحن میں عظیم الشان جشن منعقد تھا۔ میں فرعون کے پاس کھڑا تھا۔ یکایک اس کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ جشن سے باہر نکل گیا۔ یوروپا کو اس کی عدم موجودگی کی خبر نہ ہوئی۔ جشن ہوتا رہا۔ اور جونہی یوروپا کو خبر ملی۔ کہ فرعون جشن سے باہر چلا گیا ہے۔ تو اس نے جشن کو بند کرنے کا حکم دیا۔ اور جشن سے باہر نکل آئی۔ میں اور میری ماں بھی اس کے ساتھ تھے۔

فرعون کے سر چکرانے کی خبر سُن کر، وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں ہمیں ایک خادمہ ملی۔ اس نے ہمیں بتایا۔ کہ فرعون تہ خانے کی طرف گیا ہے!

ہم تینوں تیزی سے تہ خانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچکر ہم نے دیکھا۔ کہ فرعون بلند آواز سے "یوروپا! یوروپا" پکار رہا ہے۔ یوروپا تیزی سے اُس کے پاس پہنچی۔ اور اُس سے لپٹ گئی۔

"فرعون...... فرعون!! میں یہاں ہوں" اس کے لبوں سے نکلا!

یکایک ہمارے پیچھے سے "میرون" اور دو یونانی ہاتھوں میں خنجر لئے ہوئے ان کی طرف جھپٹے، میں بعجلت فرعون اور یوروپا کے آگے کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے ایک یونانی کے ہاتھ سے خنجر چھین کر، وہی خنجر اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ لڑکھڑا

کر گر پڑا۔ میں اکیلا تھا۔ اور وہ دو۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اُن کے واروں کو بچاتا رہا۔ آخر دوسرا یونانی بھی گر پڑا۔ میرون نے پورے جوش اور زور کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ میرے بازو پر کاری زخم آیا۔ میں نے تیزی سے اُس پر وار کیا۔ میرا خنجر اُس کے سینے کی طرف جا رہا تھا۔ کہ ایک دم نفرتتی درمیان میں آگئی۔ اور خنجر اس کی پشت پر لگا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر گر پڑی۔ اپنی محبوبہ کو مرتے دیکھ کر میرون کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے مجھ پر حملہ کیا۔ آخر اس کے سینے پر ایک ایسا زخم لگا۔ کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اور اس کے ساتھ میں بھی زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میری ماں۔ میری طرف بڑھنے لگی۔ مگر یوردوپا کی چیخ سن کر رُک گئی۔ فرعون گر پڑا تھا۔ اور تڑپ رہا تھا۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ خون برابر میرے زخموں سے بہ رہا تھا۔ مگر میں اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی آوازیں بھی میرے کانوں میں آ رہی تھیں:

"مجھے زہر دیا گیا ہے!" فرعون نے تڑپتے ہوئے کہا۔

"فرعون! فرعون!!" کہتی ہوئی یوردوپا اس سے لپٹ گئی۔ فرعون کے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی مگر میں وہ آواز نہ سُن سکا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

"میرے محبوب! میرے فرعون!!" یوردوپا چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ میری ماں نے اس کے بازو پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔

"میرا بیٹا بھی مر چکا ہے بیٹی!" میری ماں نے غمگین آواز میں کہا۔ میں نے آواز نکالنی چاہی۔ مگر فرطِ ضعف سے نہ نکال سکا:

"اب زندگی بیکار ہے ... ... آہ فرعون کو زہر میں نے دیا تھا ... ... ماں! میں نے خود پر کتنا بڑا ظلم کیا۔ ان ذلیل یونانیوں کا کہنا مان لیا۔ میں اب زندہ نہیں رہ سکتی ... ... !"

"میری زندگی بھی بیکار ہے۔" میری ماں نے کہا۔ یکلخت اس کی نظر گوشے میں کسی چیز پر پڑی۔ وہ یوردوپا کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف لے گئی۔ میں لیٹے لیٹے بصد مشکل ذرا آگے بڑھا۔ اب میں اس قدر نڈھال ہو گیا تھا۔ کہ جسم کو ذرہ بھر جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ میری ماں نے جھک کر کسی چیز کو اُٹھا لیا۔

"ہمارا زندہ رہنا بے سود ہے!" میری ماں نے کہا:

"ہاں، ماں!"

جانتی ہو، اس میں کیا ہے؟" میری ماں نے اس سے پوچھا:

"ہاں! ... ... میں جانتی ہوں ... ... مجھے ... ... مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔"

یوروپا خاموش ہو گئی!

"یوروپا، میری بیٹی! ... ... میری بیٹی!!"

"ماں! ... ... ماں!!"

میں جانتا تھا۔ کہ وہ زہر کھا رہی ہیں۔ اور میں نے آواز دینے کی سخت کوشش کی۔ مگر بے سود۔ میں تڑپنے لگا۔ لیکن فضول۔ اسی کوشش میں، میں بیہوش ہو گیا معلوم نہیں، کتنے گھنٹے میں بے ہوش رہا جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے اُٹھ کر دیکھا۔ تہ خانے میں خواجہ اور خادم حیران و پریشان کھڑے تھے۔ میری ماں اور یوروپا ایک سیاہ پردے کے پاس مُردہ پڑی تھیں۔ اور قریب ہی سنگِ مرمر کی ایک صندوقچی تھی۔ آہ یہ وُہی صندوقچی تھی۔ جس میں سے میری ماں اور یوروپا نے زہر لے کر کھایا تھا۔ اور یہ وُہی صندوقچی تھی جس میں سے یوروپا کی حقیقی ماں نے زہر کھایا تھا۔۔۔۔۔!

صحرانورد
کا
چوتھا خط
FAIZ
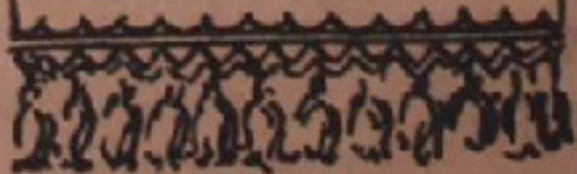
"مورتی"

مشفق دوست! ______________ !!

حسبِ وعدہ آج چوتھا افسانہ بھیج رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ تم اسے گزشتہ افسانوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ زیادہ دلآویز پاؤ گے۔ یہ افسانہ کیا ہے! چند پُر اسرار، تحیر زا اور دلپذیر واقعات کے ایک ایسے حسین و جمیل مجموعے کا جسے پڑھتے وقت انسان، زندگی کے تلخ حقائق وکوائف کشمکش و اضطراب، ہمہمہ زائی و ہنگامہ خیزی سے یکسر علیحدہ ہو کر، ایک عجیب و غریب رومانیت انگیز و طلسماتی دُنیا میں کھو جاتا ہے۔ میں اسے تین بار پڑھ چکا ہوں۔ اور ہر بار میرے دل نے دورانِ مطالعہ میں، ایک نئی لذت، ایک تازہ مسرت حاصل کی ہے۔ یہ افسانہ تم گزشتہ افسانوں سے ایک حد تک مختلف پاؤ گے۔ یہ اختلاف ایک ایسے عنصر کی موجودگی ہے جس سے گزشتہ افسانے تہی دست ہیں۔ اور یہی عنصر اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنی موجودہ حالت، قیام اور دیگر امورِ متعلقہ کے سلسلے میں کچھ کہوں۔ یہ بتا دینا بہتر سمجھتا ہوں، کہ یہ افسانہ مجھے کہاں سے ملا، پچھلے خط میں میں نے "ملکۂ مصر" کی داستان بھیجتے ہوئے تمہیں بتایا تھا۔ کہ کس طرح صحرا نوردی کرتے کرتے ہمیں ایک ضعیف و لاغر بوڑھا ملا تھا۔ اور پھر کس طرح اُس سے تین افسانے حاصل کئے تھے۔ پہلا افسانہ بعنوان "ملکۂ مصر" تمہیں بھیج چکا ہوں۔ یہ دوسرا افسانہ ہے۔ میں نے اس میں ایک حد تک ردوبدل کر دیا ہے۔ ایک شخص "رشدی" نے خود اس میں حصہ لیا ہے اور یہ اُسی کی زبانی ہے۔

اس دوران میں متعدد داستانیں پیارے رفیقِ سفر "آغا بہرام" نے مجھے سُنائی ہیں، اور ہر ایک اتنی موثر، اتنی دردناک، اور اتنی درد انگیز ہے۔ کہ تم اُسے پڑھتے وقت اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکو گے، تیسرا افسانہ بھیجنے کے بعد میں اُن کی طرف متوجہ ہونگا!

پیارے دوست! جیسا کہ تم جانتے ہو مجھے تمہاری شورش افزا دُنیا سے نکل کر، اس دنیا میں آئے ہوئے ڈھائی سال کی مدت گزر چکی ہے۔ اور میں نہایت مسرور زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ہر طرف دُور دُور پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں چلنا۔ شیریں چشموں کے کنارے خیمہ زن ہونا، کبھی کبھی قافلوں کو صحرا نوردی کرتے ہوئے دیکھنا، اُن کے اونٹوں کی خوش آئند آواز کو سننا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت، ریت کے عظیم الہیئت، خوفناک تودوں کے عقب میں، مشرقی آسمان کی نیلگوں وسعتوں کو سیلابِ نور میں نہلاتے ہوئے

دیکھنا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں کو ٹیلوں کی پیشانی پر حسرت انگیز نگاہیں ڈالتے ہوئے محسوس کرنا، عجیب عجیب، محو شدہ صحرائی داستانوں کو سننا ——— آہ یہ واقعات کتنے مسرت بخش ہیں ———؟ کس درجہ دلآویز ———؟؟

صحرا میں جب کبھی کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ تو اُس وقت کا منظر عجیب ہوتا ہے۔ میرا رفیق سفر کوئی دلآویز صحرائی داستان سنانے لگتا ہے۔ داستان کے افراد، جیتے جاگتے آنکھوں کے آگے ظاہر ہو کر اپنا پارٹ ادا کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے غمگین چہروں پر آنسوؤں کے قطرے لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فضا میں دلخراش آوازیں تڑپتی ہیں۔ اور پھر وہ ہستیاں سایوں کی صورت اختیار کر کے، برستے ہوئے بادلوں کی مانند، جو آہستہ آہستہ پانی میں تحلیل ہو جاتے ہیں شکستہ دیواروں پر رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں۔ اس منظر سے میرے دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں ———!!

مگر اس کے باوجود صحرائی زندگی خوفناک زندگی ہے۔ مسموم ہوا کے خطرناک جھونکے، جنگلی جانوروں کی موجودگی، تمہیں بتاؤ کیا زندگی خطرے میں نہیں ہے؟؟ لیکن یہ خطرات، صحرائی زندگی کی اُن مسرتوں کے مقابلے میں، جو مجھے حاصل ہو رہی ہیں کوئی حیثیت کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں مسرور ہوں، از حد مسرور!! صحرائی زندگی کی لذتیں چھوڑ دینے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا۔

اِس وقت میں ایک شاداب نخلستان میں پہنچ چکا ہوں۔ صبح کی روشنی بتدریج پھیل رہی ہے۔ میں خیمے کے دروازے پر بیٹھا ہوا صحرائی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ میرا پیارا ساتھی خیمے کے اندر ابھی سو رہا ہے ———! اچھا، اب تھوڑی سی مدت کے لئے الوداع!

تمہارا ——— "صحرا نورد"

آغازِ داستان

میرا نام رشدی ہے۔ والدین نے میرا کیا نام رکھا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ میرے ایک دوست کے باپ نے، جسے میں چچا کہا کرتا تھا۔ مجھے بتایا، کہ میرا حقیقی نام غیاث ہے۔ میں نہیں جانتا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ بہرحال لوگ مجھے رشدی ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ اور اب بھی جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میرا یہی نام ہے۔ اس وقت میں عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں۔ جہاں انسانی زندگی اور موت کے غار کی اتھاہ گہرائیوں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ حال یہ ہے۔ کہ رہی سہی طاقت بھی جواب دے چکی ہے۔ جوانی کی گرمجوشی، اور زندہ دلی ضعیف، مضمحل اور بوڑھے جسم کی شکنوں میں غائب ہو گئی ہے اگرچہ میری نظروں میں یہ وسیع کائنات، تمام دلچسپیوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اردگرد کے مناظر میں مسلسل تغیر میرے دل

دل کی دنیا میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ تاہم ابھی ایک ذریعہ ہے، جو میرے لئے ایک ناقابلِ تلافی سامانِ تفریح سے کسی طرح کم نہیں! یہ سامانِ تفریح، یہ ذریعۂ مسرت کیا ہے؟ بصرف گزشتہ حیرت زا واقعات کی یاد میں کھو جانا۔ میری موت کے بعد جو شخص بھی میرے عجیب و غریب حالات کو پڑھے گا۔ وہ انہیں یقیناً دماغی کاوش کی پیداوار اور ذہنی جنون نمائیوں کا نتیجہ سمجھے گا۔ مجھے اعتراف ہے۔ کہ میرے قصے میں ایسے عناصر ہیں جن پر انسانی عقل کبھی یقین نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ درست نہیں۔ یہ واقعات میری نگاہوں کے سامنے پیش آتے رہے ہیں۔ اور میں نے خود ان میں اہم حصہ لیا ہے۔ دنیا میں ہر ایک چیز! ممکن ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے۔ تو پھر میری داستان کو کیوں ناممکن الوقوع سمجھا جائے؟

چند دن سے میرا ارادہ تھا۔ کہ اسے لکھ ڈالوں۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر جن میں شدتِ نقاہت اور بیماری کا زیادہ حصہ ہے۔ میرا یہ ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ اب میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اس عزمِ راسخ کے ساتھ اٹھایا ہے۔ کہ اپنی پوری داستان لکھ کر ہی اسے ہاتھ سے چھوڑونگا! اللہ میرا مددگار ہو——!!

جب میں نے ہوش سنبھالا۔ تو اپنے آپ کو "عطفہ" میں پایا۔ "عطفہ" ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جو دریائے "نورز" کے کنارے آباد ہے۔ ہوش سنبھالنے سے پیشتر میرے والدین راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ اور میں ایک بوڑھے خادم کے ساتھ اپنے شاندار مکان میں رہتا تھا۔ جب میں نے عالمِ شباب میں قدم رکھا۔ تو یہ بوڑھا خادم بھی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اسکی موت اور عطفہ کی آبادی کے بیشتر حصے کی موت کا باعث ایک خاص بیماری تھی۔ جو آناً فاناً تمام شہر میں پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد عطفہ ویران مقام نظر آنے لگا۔ فطری طور پر میں وہاں رہنے سے گھبراتا تھا۔ لیکن چونکہ اپنی زندگی کا زیں حصہ وہاں گزار چکا تھا۔ اس لئے نقل مکانی کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اور تن تنہا اپنے مکان میں رہنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شہر میں کئی قسم کے تغیرات پیدا ہوئے۔ کئی لوگ باہر سے آکر وہاں آباد ہو گئے۔ اور متعدد آدمی وہاں سے چلے گئے۔ جو لوگ باہر سے آئے۔ ان میں سے بہتوں کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ایک شخص سے میں ہر وقت ڈرتا رہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنے، اس کے پاس جانے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا تھا۔ یہ شخص ایک دراز قد، سیاہ رو بوڑھا تھا جس کا نام کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اور نہ کسی کے ساتھ اس کی ملاقات تھی۔ اہلِ عطفہ کی نظروں میں اُسکی شخصیت ایک پُراسرار ساحر کی تھی۔ اور اُسے شہر کے ہر گوشے میں ساحر ہی سمجھا جاتا تھا۔ ساحر کا چہرہ بہت خوفناک تھا۔ مگر سب سے زیادہ خوفناک اُسکی آنکھیں تھیں۔ آہ وہ بڑی بڑی خشمگیں سُرخ سُرخ آنکھیں

اب بھی ان کا خیال میرے دل کو خوفزدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صبح ہی صبح جب میں بغرضِ سیر ساحل پر جاتا۔ تو بوڑھے ساحر کو یا تو کشتی سے اُترتے ہوئے دیکھتا۔ یا ٹہلتے ہوئے پاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوا۔ کہ میں رات کا کافی حصّہ، ایک دوست کے ہاں گزارنے کے بعد، گھر جا رہا ہوں۔ تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی آواز نہیں۔ کوئی متنفس نہیں۔ یکایک دُور، چاند کی دُھندلی روشنی میں، میری نگاہوں کو ساحر کا خوفناک چہرہ نظر آتا ہے۔ اور میں ڈر کر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ میں ہی نہیں۔ دوسرے لوگ بھی اسے خوفناک ہستی سمجھتے تھے۔ خود تو وہ کسی سے بولتا ہی نہیں تھا۔ اور دوسرے بھی اس سے گفتگو کی جرأت نہیں کر سکتے تھے!

ساحر کے متعلق لوگوں کا خیال تھا۔ کہ وہ چند سال پیشتر "دیوی ساموٗ" کے مندر کے مضافات میں رہتا تھا۔ اور دیوی کا پجاری بھی تھا۔ ایک اور بات بھی اسی سلسلے میں سُنی جاتی تھی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ بوڑھا ساحر روحانیات میں کامل دسترس رکھتا ہے۔ اور اب کوئی خاص علم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کا خیال تھا۔ کہ ساحر کسی کی تلاش میں رہتا ہے کس کی تلاش میں رہتا ہے؛ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا ——— !!

متعدد بار، اسے رات کو اس طرح پُراسرار طریقے پر گھومتے دیکھکر، میرے دل میں اس کا بھید معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا تاہم اُسکی خونخوار آنکھوں کے سامنے اس خیال کو دم توڑتے ہی بنی! اس طرح ایک سال گزر گیا میرے دل میں، اپنی خواہش کے پورا کرنے کا خیال کافی قوت حاصل کر گیا ——— !

(۲)

ایک دن شام کے وقت، میں ساحلِ دریا پر ایک چٹان سے سہارا لگائے، دُور اُفق کے آغوش میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ایک کشتی کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہی بتدریج پھیل رہی تھی۔ آسمان کے گوشۂ مغرب میں شفق کی سرخیوں کے درمیان ڈوبتا ہوا سورج، ایک زخمی خون میں تر اور سپاہی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جو میدانِ جنگ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو۔ دریا کے دوسرے کنارے پر دیوی ساموٗ کے مندر کے عقب میں، بلند سوکھے سوکھے درخت ظلمت پوش فضا کی لامتناہیوں میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کشتی ہلکا سا شور پیدا کر کے روانہ ہو جاتی۔ اور جب تک وہ دوسرے کنارے تک پہنچے۔ ملاح کے گیت سے فضا میں مترنم ارتعاش جاری رہتا۔ ملاحوں کے گیتوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور میں ان کو بڑے شوق سے سُنتا رہا ہوں۔ اس وقت بھی ملاحوں کی معصومانہ آواز میرے شوق کے لئے سامانِ تسکین پیدا کر

رہی تھی۔ اسی اثنا میں میرے قریب پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر چپوؤں کی حرکت سے مدھم سا شور کان میں پڑا۔ یہ سمجھ کر کہ کوئی شخص دوسرے کنارے کو جا رہا ہے۔ میں ملاح کے گیت کا منتظر تھا۔ مگر ایک دو منٹ گزر گئے۔ اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر ایک کشتی بہ رہی تھی۔ اور کشتی میں سے ساحر کی خوفناک خونخوار آنکھیں گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ بوڑھے ساحر کی آنکھوں کی تاب لانا میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ کشتی بہتی جا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی گہرائیوں میں ایک جذبہ شدت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ پُراسرار بوڑھے ساحر کا تعاقب کرنا۔ اس کا بھید معلوم کرنا۔ چند منٹ کے بعد کشتی کنارے پر جا لگی۔ ساحر اترا۔ اور ایک طرف چلنے لگا۔ دور تاریکی میں وہ سائے کی مانند حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے غائب ہو جانے کے بعد میں بمشکل چار پانچ منٹ وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر کشتی میں جا بیٹھا۔ اور اسے کھینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ خوف و لذت کا ملا جلا جذبہ، ایک لہر بن کر میرے دل و دماغ میں دوڑ گیا۔ میرے اردگرد چاند کی مدھم روشنی چھائی ہوئی تھی۔ دیوی سامو کے مندر سے پجاریوں کی آواز نکل نکل کر فضا میں گونج رہی تھی۔ ہر طرف مہیب "رومانیت" برس رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میں مندر کے قریب پہنچا۔ اور دروازے میں سے اندر دیکھا۔ کریہہ المنظر پجاری جلتی ہوئی لکڑیاں ہاتھوں میں لئے، گا رہے تھے۔ گاتے وقت ان کے پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں دیوی سامو کی مورتی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ یکایک میری نظریں ساحر پر پڑیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ کھڑا دیوی سامو کے کمرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

اب گیت ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے پجاری دروازے کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کی موجودگی میں میرا اندر جانا ناممکن امر تھا۔ ساحر بھی کہیں غائب ہو چکا تھا۔ دوسرے دن پھر میں اسی وقت وہاں پہنچا۔ گیت جاری تھا۔ دروازے میں سے جھانک کر میں نے اندر دیکھا۔ ساحر ایک طرف کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد حسب معمول پجاری دروازے کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ میں حیران تھا۔ کہ کیا کروں جی میں آیا۔ کہ واپس چلا جاؤں۔ لیکن "رازجوئی" کا وہ جذبہ جو فطرت انسانی کے ساتھ ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اندر جانے کی کوشش کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے دل کڑا کیا۔ اور مندر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مشرقی دیوار کے اختتام پر پہنچ کر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ کیونکہ اس میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے جھک کر اندر دیکھا۔ ایک طرف چراغ جل رہے تھے۔ اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے دروازے کے اندر

قدم رکھدیا۔ دماغ میں بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ چند قدم طے کرنے پر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں چھوٹی سی کھڑکی میں سے دیوی ساموا کی مورتی صاف طور پر نظر آرہی تھی۔ دیوی سنگ مرمر کا ایک نہایت خوبصورت، دلآویز اور حسین وجمیل نسوانی پیکر تھی جس کے سر پر، شانوں پر، پیشانی پر سنہری بال بکھرے ہوئے تھے۔ ارد گرد چراغ جل رہے تھے۔ فضا میں روشنی کے سیلاب کے اندر عود و عنبر کی لہریں، دھوئیں کے پیچ در پیچ حلقوں میں تیر رہی تھیں۔ مورتی کے پاس کوئی پجاری نہیں تھا۔ اور میں اس کے خوبصورت پیکر کے دیکھنے میں مشغول تھا۔ کہ ایک طرف سے شعلہ نظر آیا۔ اور پھر کمزور، ضعیف اور کہولت زدہ پجاری کا غمگین چہرہ پجاری نے جلتی ہوئی لکڑی مورتی کے پاس فرش پر رکھدی۔ اور خود اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل نکل کر اس کی داڑھی میں غائب ہونے لگے۔ اس کے لب تھرتھرانے لگے اور فضا میں اس کی غمگین مدھم آواز گونجنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

" اے خداوندہ آتش! میں کب تک آنسو بہاتا رہوں گا؟ کیا میری آرزو کبھی بھی پوری نہیں ہوگی؟

میری ملکہ! مجھ پر رحم کر ——— رحم کر!"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ مورتی کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ انہیں چوما۔ پھر اس کے ہاتھوں کو چوما۔ اس کے بعد وہ سجدے میں گر پڑا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اچانک دروازے کے پاس پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اور چند لمحوں کے بعد بوڑھا ساحر اندر داخل ہوا۔ اس نے خونخوار نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور جھک کر اپنا ہاتھ پجاری کے سر پر رکھ دیا۔ پجاری نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اور ساحر کو دیکھا۔

" اتنی بیتابی درست نہیں" ساحر نے آہستہ سے کہا۔

" یہ بیتابی تو مجھے مار ڈالے گی! آہ میں کیا کروں؟"

" صبر"

" صبر اب مجھ سے نہیں ہوسکتا ——— نہیں ہوسکتا" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

" یہ بیتابی تمہارے حق میں نقصان دہ ہے۔ اگر اس طرح رو رو کر جان کھو دو گے۔ تو اس وقت جب تمہاری آرزو پوری ہوگی کیا کرو گے؟"

اِن الفاظ سے پجاری کے حسرت انگیز چہرے پر ہلکی سی بشاشت دوڑ گئی "میری آرزو پوری ہوگی؟" اس

نے پوچھا۔

"ہاں! اپنے مقررہ وقت پر" ساحر نے جواب دیا۔

"وہ مقررہ وقت ابھی نہیں آیا؟"

"ابھی نہیں! ــــ صبر کرو!"

دونوں خاموش ہو گئے۔ بوڑھے نے آہستہ سے کچھ کہا۔ جسے میں سن نہ سکا۔ چند لمحے بوڑھا ٹھہرا اور پھر باہر نکل گیا۔ پجاری اس کے جانے کے بعد دیوی کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے "سنہری بالوں والی دوشیزہ ــــ! کہاں ــــ؟ سنہری بالوں والی دوشیزہ!" اس نے آہستہ آہستہ کہا ــ آنسو خشک کئے۔ اپنی لکڑی کی طرف دیکھا۔ جو جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔ پھر حسرت ناک نظریں مورتی پر ڈالیں۔ اور فرش پر لیٹ گیا۔

ہر طرف خاموشی، پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ سنگ مرمر کے چبوترے پر دیوی ایک خوبصورت دوشیزہ کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کچھ کہنا چاہتی ہیں ــــ!

میں مندر سے باہر نکلا۔ اور واپس چلنے لگا۔ یہ خیال کہ پجاری سنہری بالوں والی ایک دوشیزہ پر عاشق ہے۔ میرے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ باقی پجاری کھلے میدان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ساحل پر پہنچ کر، میں کشتی میں بیٹھ گیا ــــ دوسرے کنارے پر میں نے دیکھا۔ کہ ساحر کشتی سے نکل کر ایک طرف چلنے لگا ہے!

(۳)

گزشتہ واقعے کو گزرے، ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس اثنا میں بوڑھے ساحر کو میں نے کہیں نہ دیکھا۔ متعدد بار مندر میں گیا۔ پجاریوں کی نگاہوں کے سامنے، ان کی نظروں سے چھپ کر، میں نے اسے ڈھونڈا۔ مگر بے سود۔ معمر ساحر کی غیر موجودگی کوئی معمولی سا واقعہ نہ تھا۔ ہر روز اس سلسلے میں عجیب و غریب افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ ساحر کسی ناگہانی موت کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ خوفناک بوڑھے کی ساحرانہ و پُراسرار شخصیت نے میرے دل میں اس درجہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ کہ میں اسکی ہر حرکت کو ایک راز، اس کے ہر فعل کو ایک بھید، اور اس کے ہر کام کو ایک معمہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس وقت بھی اس کی غیر موجودگی، میری نظروں میں کوئی نہ کوئی راز لئے ہوئے

تھی۔

اس رات کو، جس کے آخری حصے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں خلاف معمول جلد سو گیا۔ اور جب میری آنکھ کھلی فضا میں کہیں کہیں تاریکی پھیلی ہوئی تھی میرے اعضا کچھ مضمحل سے تھے۔ اس لئے میں مکان سے نکل کر ساحل دریا پر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے مکان سے بہت دُور نکل گیا۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا۔ کہ میں نے اپنے پاس ہی بوڑھے ساحر کو، ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک نہایت خوبصورت عورت جس کے سنہری بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا لہرا کر عجیب منظر پیدا کر رہے تھے۔ ایک خوبصورت و توانا نوجوان کے پہلو میں، قدم اُٹھا رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ کہ نوجوان مجھے دیکھکر ٹھٹک گیا ہے۔ اس نے بوڑھے کو مستفسرانہ نظروں سے دیکھا جس کے جواب میں ساحر نے داہنے ہاتھ کو جنبش دی۔ اور خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ مگر کھڑا وہیں رہا۔ تینوں چلتے گئے۔ یہاں تک کہ گنجان درختوں کے پیچھے گم!

بوڑھا ساحر پہلے ہی میری نظروں میں بہت پُراسرار تھا۔ مگر اس منظر کے بعد تو وہ زیادہ خطرناک، زیادہ خوفناک ہستی معلوم ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سنہری بالوں والی دوشیزہ کو دیکھ کر مجھے پجاری کے یہ الفاظ یاد آگئے ــــ "سنہری بالوں والی دوشیزہ کہاں ــــ؟" میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یہ سنہری بالوں والی دوشیزہ ضرور اس پجاری کی محبوبہ ہے جسے یہ ساحر کہیں سے لے آیا ہے ــــ مگر یہ نوجوان؟ اس کا جواب میں کیونکر دے سکتا تھا ــــ؟؟

اب سورج کی شعاعیں بکھرتی جا رہی تھیں۔ رات کے آغوش میں سویا ہوا ہنگامہ، انگڑائی لیکر بیدار ہو رہا تھا۔ میں مکان میں آیا۔ دل میں اضطراب موجزن تھا۔ دُوسرے دن بھی میں نے دوشیزہ کو دیکھا۔ اب اُس کے ساتھ صرف نوجوان تھا جس سے وُہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی نوجوان نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اور منہ دُوسری طرف پھیر لیا!

دو دن اور گزر گئے، چوتھے دن حسب معمول صبح کے وقت میں ساحل پر ٹہل رہا تھا۔ کہ مجھے دُور، دریا میں غوطے کھاتے ہوئے کسی کا ہاتھ دکھائی دیا۔ فن شناوری میں مجھے کامل مہارت حاصل تھی۔ اور جوانی کے عالم میں یہ فن میرے لئے بہت بڑا ذریعہ تفریح تھا۔ میں نے فوراً دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اگر چند لمحے میں دیر سے پہنچتا۔ تو وہ شخص یقیناً ڈوب چکا ہوتا۔ خوش قسمتی سے میں عین موقعہ پر پہنچ گیا۔ اور کوشش و ہمت سے اسے کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ جب میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ یہ وُہی شخص تھا جسے

میں نے، ساحر کے ساتھ اور پھر دوشیزہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کے ہوش وحواس ٹھکانے لگے۔ اُس نے ممنونانہ مجھے دیکھا۔ ایک وُہ وقت تھا۔ کہ اُسکی نظروں میں شکوک وشبہات کے اثرات تھے۔ اور ایک اب یہ وقت تھا۔ کہ وُہ احسان مندی کا اظہار کر رہا تھا۔

"حیران ہوں کہ آپ کا شکریہ کیونکر ادا کروں" اس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا۔ وُہ انسانی ہمدردی کا اقتضا ہے۔ آپ اگر میری بجائے ہوتے۔ تو یہی کرتے!"

"یقیناً یہی کرتا ــــ لیکن چونکہ اس وقت آپ نے یہ فرض ادا کیا ہے۔ اس لئے تادمِ واپسیں آپ کا شکرگزار رہونگا۔ آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اِس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں۔ میرے عزیز محسن! میری موت کے ساتھ ایک اور ہستی بھی بے مراد دُنیا سے رخصت ہو جاتی۔ مجھے بچا کر، آپ نے دو جانوں کو بچایا ہے!"

"دو جانیں؟" میں نے متعجبانہ پوچھا۔

"ہاں میرے محسن! اِس وقت مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ آپ اپنا دولتکدہ مجھے بتا دیجئے۔ میں دو تین گھنٹے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرونگا۔"

"آپ بخوشی جا سکتے ہیں۔ رہا میرے مکان کا پتہ، تو وُہ دیکھئے ــــ! بڑا سا مکان!" میں نے اپنے مکان کا پتہ بتا دیا۔ اور وُہ چلا گیا۔

مجھے اپنے مکان میں پہنچے ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے۔ کہ وُہی اجنبی ــــ میرے مکان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے نیچے جا کر دروازہ کھول دیا۔ اور اُوپر آ کر ہم دونوں کوچ پر بیٹھ گئے۔

"اس وقت میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"لیجئے میں حاضرِ خدمت ہو گیا۔" اس نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ کے احسانِ عظیم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کہ میں آپ کو اپنا سمجھوں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی مغائرت و اجنبیت نہ رہنی چاہیئے۔ میرا راز آپ کا راز، اور آپکا راز میرا راز ــــ ہے۔ جس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ وُہ کسی صورت بھی میرے حق میں نقصان پسند نہیں کریگا۔"

"یہ آپکی مہربانی ہے۔ جو میرے متعلق آپ یہ خیال رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے محسن! یہ میرا فرض ہے۔" وُہ ذرا ٹھہرا اور پھر نرم و شیریں آواز میں کہنے لگا: جیسا کہ آپ پر ظاہر ہے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں میں یہاں کیوں آیا؟ اس کا جواب بھی میں آپ کو دینے لگا ہوں —— ! میرا نام شہاب ہے۔ اور شمشاد آباد میرا وطن۔ بچپن نہایت آرام و آسائش سے گزارا۔ کیونکہ میرے والدِ محترم فوج میں ایک بہت بڑے افسر تھے۔ جب میں جوان ہوا۔ تو انہوں نے سپہ سالار سے مخالفت کی بنا پر استعفےٰ دیدیا۔ چونکہ اُنہوں نے حکومت کی کافی خدمت کی تھی۔ اس لئے مجھے بآسانی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اور میں بہت جلد ترقی کر کے فوج کے ایک دستے کا افسر بن گیا۔ سپہ سالار مجھ پر بہت مہربان تھا۔ میں اس کے گھر اکثر جایا کرتا تھا۔ اسی اثنا میں میں نے اسکی اکلوتی لڑکی رجیلہ کو دیکھ لیا۔ عشق کے اندھے دیوتا نے تیر پھینکا۔ جو میرے سینے کو چیرتا ہوا ایک اور دِل کو بھی زخمی کر گیا —— اور وُہ دل —— نازک دِل رجیلہ کا تھا۔ عشق چھپانے سے چھپ نہیں سکتا۔ ہماری محبت بھی بدنام ہو گئی! رجیلہ کے رشتہ داروں نے اس امر کو اپنے حق میں ایک ذِلت سمجھا۔ اور انتہائی کوشش کی۔ کہ رجیلہ کو مجھ سے بدظن کر دیں۔ مگر اُن کی ظالم کوششوں کو ناکامی ہی اٹھانی پڑی۔ ان کی مخالفتوں نے ہماری محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا دنیا میں صرف ایک شخص تھا۔ جس نے ہماری آرزو کی مخالفت نہ کی۔ اور وُہ تھا رجیلہ کا والد۔ اس نے مرتے وقت بھی اصرار کیا کہ مجھے رجیلہ کا رفیقِ زندگی منتخب کر لیا جائے۔ مگر بدبخت رشتہ داروں کی ظالمانہ مخالفت نے ہماری آرزوؤں کی پامالی ہی کو پسند کیا۔ ہم پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ آخر کار میری اور رجیلہ کی صلاح ہوئی۔ کہ ہم دونوں رات کے وقت شمشاد آباد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ ہم اس کے لئے موقعے کی تلاش میں تھے۔ کہ وُہ بوڑھا شخص جسے آپ نے اس دن ہمارے ساتھ دیکھا ہے۔ مجھے تنہائی میں ملا۔ اور کہنے لگا۔ "بیٹا! رجیلہ کے ساتھ جو صلاح تم نے کی ہے۔ وُہ نہایت مناسب ہے۔ یہاں تمہاری محبت آہوں اور آنسوؤں ہی میں تڑپتی رہے گی۔"

یہ سُنکر بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ یہ ارادہ میرے اور رجیلہ کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا —— ہم نے نہایت خفیہ جگہ پر یہ صلاح کی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ کہ وُہ ہمارا نہایت ہمدرد ہے۔ اور ہمارے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کیواسطے تیار ہے۔ مختصر یہ کہ ایک رات میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا۔ کہ بوڑھا کھڑا ہے۔

"تمہاری آرزو کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے —— مکان کے عقب میں گھوڑے کھڑے ہیں۔ رجیلہ بھی آرہی ہے۔"

یہ سُنکر میں سخت متحیر ہوا۔ میں نے سمجھا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ چند منٹ کے بعد رجیلہ آگئی —— !

ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں آگئے —— یہ ہے میری زندگی کی داستان!

"تو آپ کے ساتھ اُس دِن رحیلہ تھی؟"

"ہاں!"

"اب آپ بوڑھے ہی کے پاس رہتے ہیں؟"

"ہاں بوڑھا بہت مہربان ہے ——— اور خدا کرے مہربان ہی رہے!"

یہ الفاظ سُن کر میں بے حد متعجب ہُوا۔ شہاب بوڑھے کو مہربان سمجھ رہا تھا۔ اور میری نظروں میں وُہ نہایت خطرناک انسان ——— چند منٹ خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا:-

"تو صبح کا واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

"وُہ اس طرح، کہ رات میری طبیعت بہت خراب رہی۔ صبح سویرے مجھ سے بوڑھے نے کہا "جاؤ دریا کے کنارے کچھ دیر ٹہل آؤ۔" میں اور ایک شخص دریا پر آئے۔ اس آدمی نے، جو بوڑھے کا خادم ہے، مجھے کشتی کی سیر کے لئے کہا، مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا جب ہماری کشتی منجدھار میں پہنچی۔ تو اس آدمی نے چپو میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے یہ کام تمام عمر میں نہیں کیا تھا۔ اس لئے کشتی چکرانے لگی۔ اس نے چپو جلدی سے پکڑ لئے ——— مگر کشتی میں پانی آنے لگا ——— اور اسکے بعد وُہ واقعہ پیش آیا۔ جو آپ پر ظاہر ہے ——— میرا خیال تھا۔ کہ وہ خادم ڈوب چکا ہے۔ مگر وُہ بھی بچ گیا!"

"اُسے تیرنے کا طریقہ آتا تھا؟"

"میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بہت کم!"

اِس کے بعد ایک گھنٹہ تک اور باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اُس نے جیمیمانہ شکریہ ادا کیا۔ اور ہم نے وعدہ کیا۔ کہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اس کے بعد وُہ چلا گیا ———!!

دو تین ملاقاتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے!!

(۱۴)

کس درجہ ہولناک خواب؟ اب بھی مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ تو دل لرز جاتا ہے۔ رات کے آخری حصے میں دیکھتا ہوں۔ کہ ساحل دریا پر ایک شکستہ کشتی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دُور سے ایک کشتی تیزی کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کشتی میں

کون ہے؟ میں یہ نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں آفتاب کی روشنی میں کسی کے سنہری بال چمک رہے ہیں۔ چند منٹ کے بعد کشتی میرے قریب آجاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ اس میں رجیلہ ایک دِلآویز انداز میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے سے یاس و افسردگی کے آثار نمایاں ہیں۔ آنکھوں سے خوف کے اثرات ٹپک رہے ہیں۔ میں اُسے بلانا چاہتا ہوں۔ مگر بلا نہیں سکتا۔ ایک قسم کا خوف میری رگ رگ، ریشے ریشے پر طاری ہے۔ ایک طرف شور سنائی دیتا ہے۔ میں اُس طرف مڑ کر دیکھتا ہوں۔ ایک اور کشتی آرہی ہے۔ اس میں ساحر بیٹھا ہے۔ جو خونخوار نظروں سے رجیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی کشتی بڑھتی آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ رجیلہ کی کشتی کے قریب پہنچ جاتا ہے ـــــ زور سے دھماکے کی آواز آتی ہے۔ میری متحیر نظریں دیکھتی ہیں۔ کہ ساحر رجیلہ کی کشتی میں کود پڑا ہے۔ رجیلہ ڈر کر ایک کونے میں، جیسے زخمی پرندے کی مانند جو شکاری کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ ساحر اپنے لمبے لمبے، خوفناک ہاتھ اس کے سینے کی طرف بڑھاتا ہے ـــــ اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ اس ظالم کے طویل، ڈراونے اور خون آشام ناخن اس کے سینے کو چیرتے جا رہے ہیں۔ رجیلہ خون میں شرابور، تڑپتی ہوئی، دردناک آوازیں نکالتی ہوئی، دریا میں گر پڑتی ہے ـــــ میں چیخ کر بیدار ہو جاتا ہوں۔

سورج کی حدت بکنار کریں میرے سینے پر پڑ رہی تھیں۔ صراحی فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ اور میرے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ حالتِ اضطراب میں میرا ہاتھ صراحی سے جا لگا تھا جس سے وہ فرش پر گر پڑی تھی۔ اور میری انگلی بھی زخمی ہو گئی تھی۔ میں نے چارپائی سے اٹھنا چاہا۔ لیکن خوف نے مجھ اس طرح دماغ پہ اثر ڈالا تھا۔ کہ میں خاموش وہیں لیٹا رہا! خواب کا ہولناک منظر پھر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا کافی دیر تک میں چارپائی پر لیٹا رہا۔ اور معلوم نہیں کب تک لیٹا رہتا۔ کہ کسی نے نیچے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا ـــــ آنے والا شہاب تھا۔

"میں تمہیں ملنے والا تھا۔" میں نے اپنا اضطرابِ قلبی چھپاتے ہوئے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے؟ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے ـــــ بہت ہولناک خواب!"

ہم اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ اور میں شہاب کو اپنا خواب سنانے لگا میں جب خواب کا آخری حصہ سنا رہا تھا۔ تو شہاب کے

چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ اور وہ نہایت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔

"میں اس خوفناک بوڑھے سے بے حد خوفزدہ ہوں۔" میں نے کہا۔ شہاب کی نظریں صراحی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر گڑی تھیں!

"اگر کہو۔ تو میں تمہیں اِس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سناؤں؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے سر کے اشارے سے آرزو ظاہر کی۔ اور میں نے وہ واقعہ جو دیوی سامو کے مندر میں پیش آیا تھا۔ اُسے سنا دیا۔

"میں خود بھی اس بوڑھے سے ڈرتا ہوں۔ اور رحیلہ بھی اس سے خوفزدہ ہے۔ اُس نے ہم پر احسان کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کیا جائے؟"

اس نے میرے الفاظ سن کر کہا۔

"میں ڈرتا ہوں مبادا تم پر کوئی ناگہانی مصیبت آئے۔ پجاری کے یہ الفاظ" سنہری بالوں والی دوشیزہ کوئی گہرا راز اپنے اندر رکھتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

یہ الفاظ سُنکر اُس نے سر جھکا لیا۔ اور پھر یکلخت بول اُٹھا۔ گویا اُسے کوئی فراموش شدہ بات یاد آگئی ہے۔ "کل شام کو ایک دُبلا پتلا شخص بوڑھے کے پاس آیا تھا۔ جسے دیکھکر رحیلہ ڈر گئی تھی۔ میرا خیال ہے۔ وہ شخص پجاری ہوگا"۔

شہاب سے حلیہ پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ پجاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

"تو اُس نے بوڑھے سے کیا کہا؟" میں نے پُوچھا۔

"چند لمحے تو وہ بوڑھے کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔" میرے بزرگ! کیا وقت ابھی نہیں آیا؟" اور اس کے جواب میں بوڑھے نے بصورت انکار سر کو جنبش دی۔ پجاری نے پوچھا۔" تو وہ کب آئیگا؟" اُس کی آواز میں التماسانہ رنگ غالب تھا۔

بوڑھے نے جواب دیا۔ "ابھی انتظار کرو"۔ یہ سُنکر پجاری خاموشی سے چلا گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے رحیلہ کو عجیب انداز سے دیکھا تھا"۔

یہ الفاظ سن کر میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ بوڑھا کوئی سخت فریب کارانہ چال چل رہا ہے۔ جس سے

شہاب اور رحیلہ کی زندگیاں معلوم نہیں، کن خطرات میں پڑ جائیں گی۔

"میں دیکھ رہا ہوں، کہ تمہیں مجھ پر کافی اعتماد حاصل ہو گیا ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے۔ کہ ہر معاملے میں اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق تمہاری مدد کروں۔ اور ہر ممکن قربانی سے کام لوں۔ تم مجھے اپنا رفیقِ صادق پاؤ گے"!

یہ الفاظ میں نے اس وقت کہے۔ جب وہ جانے کے لئے تیار ہوا ——! اس کے جانے کے بعد میں خیالات کے ہجوم میں غرق ہو گیا۔ میرے دل میں اس بات کا یقین پیدا ہو گیا۔ کہ شہاب کی کشتی اُلٹ جانے کے معاملے میں بھی ساحر کا ہاتھ تھا ——!

میری نگاہِ تصور، مستقبل قریب کے پردے پر کسی خطرہ عظیم کا اعلان شعلوں کے حروف میں پڑھ رہی تھی۔ ایسا نظر آتا تھا۔ کہ کوئی رُوح فرسا راز منکشف ہونے والا ہے، کوئی خوفناک بھید معلوم ہونے والا ہے۔ بوڑھا ایک تو خود اسرار کی دُنیا۔ اور پھر تازہ واقعات کی تحیّر زا پیچیدگیاں! کچھ معلوم نہ —— تھا۔ کہ کتنا بڑا خطرہ آنے والا ہے۔ خون آلود اُفق پر ستارے قیامت خیز شور پیدا کرتے ہوئے، ٹکرانے کے لئے ایک دوسرے کی طرف برق آسا رفتار کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ نتیجہ کیا ہو گا؟ اس خیال سے رُوح لرز رہی تھی!

شہاب کے جانے کے بعد میں نے غسل کیا۔ لباس بدلا۔ اور اس قسم کے دیگر فرائض انجام دینے میں مصروف تھا۔ کہ شہاب گھبرایا ہوا اُوپر آیا۔ اسکی سراسیمہ صورت دیکھ کر مجھے خطرے کے وقوع پذیر ہونے کا یقین ہو گیا۔

"میں برباد ہو گیا ہوں "! اس نے یہ الفاظ اس سراسیمگی کے عالم میں کہے۔ کہ میں بے حد ڈر گیا!

"کیا ہوا"؟

"رحیلہ —— میری رحیلہ وہاں نہیں ہے"!

"کہاں گئی"؟

"اور بھی وہاں کوئی نہیں —— رشدی"!

"وہ کہیں سیر کو نہ گئے ہوں"!

"نہیں۔ رحیلہ میرے بغیر ایک منٹ کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ کوئی سخت دھوکا ہوا ہے"!

"جس چیز کا مجھے ڈر تھا، وُہی پیش آئی"!

"تو اب کیا کیا جائے، رشدی؟"

"میرے دوست، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ سب سے پہلے تمہاری قیام گاہ پر جانا لازم ہے۔ پھر کہیں اور چلیں گے۔" میں نے کہا۔ اور ہم دونوں مکان سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہو کر، بوڑھے کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے!

آتشیں چہرہ آفتاب، فضائے بسیط میں، چھوٹے چھوٹے، بھورے بھورے بادلوں کے درمیان نور کا سیلاب اگل رہا تھا۔ اس کی گرم گرم شعاعیں ریت کے تودوں پر سنہری زنجیروں کے مانند چمک رہی تھیں۔ اثنائے راہ میں ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ یہاں تک کہ ہم ساحر کے فراخ و کشادہ مکان میں داخل ہو گئے سب سے پہلے ایک کمرے میں گئے۔ شہاب نے اس کے کونے کونے، چپے چپے پر متجسسانہ نظریں ڈالیں۔ مگر بے سود۔ اس وقت کا منظر عجیب منظر تھا۔ سورج کی کرنیں روشندان میں سے داخل ہو ہو کر، اس کی قطرات آلود پیشانی پر اس کے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں پر، روشنی کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پڑ رہی تھیں۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ادھر جاتا تھا۔ اور کبھی ادھر۔ اس کے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں سے بالوں ہو کر تیسرے کمرے میں پہنچے۔ وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ ہم اس میں سے باہر نکلنے لگے تھے۔ کہ شہاب کی نظر، کمرے کے آخری گوشہ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی پر پڑی۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچا — دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اور بعجلت اندر چلا گیا۔ میں بھی تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اب ہم دونوں ایک فراخ کمرے میں تھے۔ ہمارے دل میں یہ خیال تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہاں بھی کمرہ ہے! مدھم سی روشنی وہاں آ رہی تھی۔ یکایک مجھے فرش پر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں اس کے پاس جا کر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ شہاب نے اس کے بازوؤں کو ہلایا۔ اس کے سر کو جنبش دی۔ مگر فضول۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ ہم نے سمجھ لیا۔ کہ یہ مار دیا گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم نے پھر کمروں کو دیکھا —! شہاب بار بار مجھے چلنے کو کہتا تھا۔ حالات کے اس روح فرسا تغیر، واقعات کے اس حوصلہ شکن انقلاب نے اس کی عجیب حالت کر دی تھی۔ حیرت، مایوسی اور خفگی کے ملے جلے اثرات نے اسے ایک ایسی سطح پر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں انسان سے انتہائی بہیمانہ حرکت کے ارتکاب کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔ میں اسے برابر تسلی دے رہا تھا۔ مگر وہ ساحر کا تعاقب کرنے پر مصر تھا۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ کہ ساحر حیلہ کر کے کہاں گیا ہے؟

"اب کیا ہو گا؟ — وہ شیطان ساحر —!" فرط خفگی کے باعث وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہم اُسی شخص کے پاس جاتے ہیں ——— میرا خیال ہے وہ مُردہ نہیں ہے۔" میں نے شہاب سے کہا۔

"وُہ مُردہ نہیں ہے"؟ شہاب نے متعجبانہ کہا!

"ہاں، میرا خیال ہے۔"

ہم دونوں پھر وہیں پہنچے۔ وُہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو جنبش دی۔ اور یہ دیکھ کر مجھ پر مسرورانہ حیرت طاری ہو گئی۔ کہ وہ شخص زندہ ہے۔ کیونکہ اُس نے حرکت کی۔ میں نے اس کے بازوؤں کو زور سے ہلایا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وُہ کہاں ہیں"؟ شہاب نے اس کے شانوں کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"کون"؟ اجنبی نے پوچھا۔

"رجیلہ ——— ساحر ———"

اجنبی آنکھیں پھاڑ کر شہاب کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دو تین منٹ تک تو وہ شخص ہمارا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بیہوشی کے اثرات ابھی تک اس کے دماغ پر مسلط تھے۔ آخر کار اُسے ہوش آیا۔ اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ حوصلہ کرو!"

"جلدی کہو"! شہاب نے بیتاب ہو کر کہا۔

"صبح پجاری آیا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں جن سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ کہ وُہ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ساحر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ میرا خیال ہے۔ کہ وہ میرے ہی مکان میں گئے ہیں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"وُہ ——— مکان یہاں سے بہت دُور ہے جنوبی سمت پہاڑوں کے پہلو میں۔"

یہ سن کر شہاب جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

"ذرا ٹھہرو شہاب"! میں نے اس سے کہا۔ اور اس شخص سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ اور ساحر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"جس مکان کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میں اس میں رہتا ہوں۔ "نادو" میرا نام ہے۔ اور میں ساحر کا خادم ہوں۔ راستے

ابتدائی حصے میں ساحر مجھے یہاں لے آیا تھا۔ معلوم نہیں، میرے یہاں لانے سے اُس کا کیا مقصد تھا؛ میرے سوال پر اس نے کہا۔

"اگر ساحر کو معلوم ہو گیا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ تو وہ یقینی طور پر مجھے ہلاک کر دے گا"!

میں نے اُسے حوصلہ دیا۔ اور اخفائے راز کا وعدہ کر کے ہم نیچے اُترے۔ اس شخص نے نیچے آ کر ہمیں منزلِ مقصود کا راستہ بتا دیا۔ اور ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ شام کے وقت کہیں جا کر، ہم نے پہاڑوں کے پاس ایک بڑا سا شکستہ مکان دیکھا۔ ہم گھوڑوں سے اُترے اور اس کا دروازہ ڈھونڈنے لگے۔ کئی منٹ گذر گئے۔ اور ہمیں پُر اسرار مکان کا دروازہ نظر نہ آیا۔ مکان کی دائیں دیوار میں چند گز کے فاصلے پر، ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ شہاب کے دماغ میں ایک تجویز آئی۔ اُس نے گھوڑا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ اور اُس پر کھڑے ہو کر، زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ ایک پٹ کھل گیا —— پھر دوسرا بھی کھل گیا۔ اور وہ بے دھڑک اندر چلا گیا۔ میں نے بھی اسکی پیروی کی۔

اردگرد تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ ایک طرف کو بڑھایا۔ کسی نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ میں نے پکارا "شہاب! یہ دیکھ کر کہ یہ میرا ہاتھ ہے۔ شہاب نے اسے چھوڑ دیا۔ اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ ہم نیچے اتر رہے ہیں۔ آخر ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے۔ جہاں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی —— یکایک نسوانی آہ و زاری کی آواز ہمارے کان میں آئی۔ "میری رحیلہ" شہاب نے کہا۔ اور جلدی سے ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رحیلہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے آ گیا —— بیچاری عورت کا چہرہ مرجھا چکا تھا۔ آنکھیں فرطِ غم سے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ بمشکل ہم اسی کھڑکی تک پہنچے۔ اب نیچے اُترنے کا سوال تھا۔ شہاب نے نیچے چھلانگ لگا دی —— گھوڑے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ اور اس طرح میں اور رحیلہ، نیچے اترنے میں کامیاب ہو گئے!

اسرار کے میں انہیں اپنے مکان میں لے گیا۔ رحیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر شادابی حاصل کر گیا ——!!!

دو دن گذر گئے۔

ایک دن شام کے وقت رحیلہ کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ کہ وہ لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی۔ اپنے محبوب سے جا لپٹی۔ "خوفناک بوڑھے نے مجھے دیکھ لیا ہے" —— اُس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ہم نے اسے تسلی دی۔ باوجود انتہائی کوشش کرنے کے ہم ساحر کو کہیں نہ دیکھ سکے —— چند دن سکون کے ساتھ گذر گئے۔

اسی اثنا میں بدقسمتی سے رجیلہ بیمار ہو گئی۔ اس کی بیماری کی وجہ وُہ خوف تھا جو ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا تھا۔
ایک دن ہم چند گھنٹوں کے لئے باہر گئے۔ جب واپس آئے۔ تو دیکھا۔ کہ رجیلہ بستر پر مُردہ پڑی ہے۔

(۵)

کس قدر ہیجان خیز، کس قدر دردناک واقعہ! دو تین گھنٹے پیشتر ہم جس گُل اندام حسینہ کو چلتے پھرتے، بولتے چالتے دیکھ رہے تھے۔ کتنا ستم تھا کہ اب وُہ ہماری نظروں کے سامنے، زندگی کی حرارت سے محروم، بے حِس و حرکت پڑی تھی۔ شہاب نے اُسے زور کے ساتھ پکارا۔ اس کے شانوں کو، سر کو، ہاتھوں کو ہلایا۔ مگر اب اسکی دلنواز مجبوبہ پتھر کی ایک مورتی تھی، حِس و حرکت سے محروم، برف کی ایک ڈلی تھی، خونِ حیات سے تہی دامن! اس کا سفید چہرہ کوچ کے بازو پر یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا گلاب کا ایک افسردہ پھول شاخِ نخل سے ٹوٹ کر، ایک خار دار ٹہنی پر اٹکا ہوا ہے۔ وُہ رومال جسے وہ ڈھ کا ٹ رہی تھی۔ اس کے پہلو میں پڑا تھا۔ کمرے میں سب کچھ اسی حالت میں تھا جس حالت میں ہم چھوڑ گئے تھے۔ کسی قسم کا تغیر، کسی نوع کی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی تھی! شہاب نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر، رکھدیئے اور اُسے زور زور سے پکارنے لگا۔ آہ وُہ کتنا دردانگیز منظر تھا:

"قسمت کو یہی منظور تھا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں خواب تو نہیں دیکھ رہا —— معاملہ کیا ہے۔ رجیلہ بولتی کیوں نہیں؟" شہاب نے گھبرا کر کہا!

"اب صبر سے کام لو — شہاب!"

"مگر رجیلہ جاگتی کیوں نہیں؟ اتنی گہری نیند کیوں سو رہی ہے"؟؟

آہ بدنصیب انسان موت کو گہری نیند سمجھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خوفناک حقیقت اُس پر منکشف ہو گئی۔ اس کے باوجود اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر انسان سب کچھ سمجھنے کے باوجود، کچھ نہیں سمجھ سکتا!

"تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ دردناک واقعہ رُونما ہو چکا ہے۔ مگر صبر سے کام لو۔ رجیلہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اب اسکی نعش پر چیخنا چلانا، دیوانوں کی مانند کپڑے پھاڑنا عبث ہے۔ صبر کرو میرے عزیز دوست!" میں نے کہا۔

"رجیلہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہے؟ کیا کہہ رہے ہو؟؟ یہ گہری نیند ــــ رجیلہ! رجیلہ!!" اس نے چیخ چیخ کر کہا۔

"یہ ایسی گہری نیند ہے جس کے بعد بیداری ممکن نہیں!"

"کیوں نہیں؟ رجیلہ جاگے گی۔ اسے جاگنا چاہیئے! ــــ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا!"

"میرے دوست! قسمت کو یہی منظور تھا۔ تمہیں اس کے بغیر بھی زندہ رہنا ہو گا۔"

کافی دیر تک میں اُسے تسلی دیتا رہا۔ اگر میں اس کے پاس نہ ہوتا۔ تو یقیناً فرطِ صدمہ سے وہ جان کھو دیتا۔ مَیں اور میرے دو دوستوں نے رجیلہ کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کئے۔ بدنصیب عورت کی نعش کو تاریک قبر میں اُتارتے وقت شہاب اس طرح چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی رونے پر مجبور ہو جائے۔ وہ دردناک منظر میں تادمِ واپسیں بھی نہیں بھول سکتا۔ اس بیچارے کے دل کو کتنا صدمہ ہوا۔ اس کا اندازہ انسانی طاقت لگانے سے قاصر ہے۔ رجیلہ کی ناگہانی موت ایک معمّا تھی۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ ساحر ہی کا ظلم ہے۔ مگر ایک تو وہ مفقودالخبر ہو چکا تھا۔ اور شہر کے چند لوگوں نے اس کی نعش کو بھی ساحل پر دیکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ رجیلہ کی نعش آٹھ گھنٹے تک ہمارے سامنے رہی تھی۔ اور اس دوران میں ہم نے اسے ہوش میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ آخر کار لوگوں کے ساتھ مجھے بھی یہی یقین کرنا پڑا۔ کہ رجیلہ کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔ شہاب ایک دن بمشکل میرے ہاں ٹھہرا۔ پھر کہیں چلا گیا۔ جانے سے پیشتر میں نے باصرار اس سے پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو، مگر اس نے میرے سوال کا یہی جواب دیا "میں دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں بقیہ زندگی گزارونگا۔" میں پھر تنہا تھا، تنہا اور مغموم!!

اس کے جانے کے بعد میں اُسی کمرے میں گیا۔ جہاں بدنصیب شہاب کی زندگی ہمیشہ کے لئے تاریک ہو گئی تھی۔

دوسرے دن جب میں اپنے ایک دوست کے ہاں سے آ رہا تھا۔ میں نے نادو کو دیکھا۔ جلدی سے اُس کے پاس پہنچکر، اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے، ٹھٹکتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔

"مجھ سے تمہارا کیا کام؟" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"نادو! ایک دفعہ پہلے بھی تم نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ اب ایک احسان اور کرو۔ میں تمام عمر ممنون رہونگا۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں ــــ؟ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا!"

"تم مجھے کچھ نہ کچھ بتا سکتے ہو، دیکھو میری التماس کو رد نہ کرو۔"

اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر کہا: "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ مجھے تم لوگوں پر رحم آرہا ہے۔"

"ساحر واقعی مر چکا ہے؟"

"ساحر زندہ ہے!"

"اگر وُہ زندہ ہے۔ تو لوگوں نے کس کی نعش دریا کے کنارے دیکھی ہے؟"

"ساحر زندہ ہے!"

"تو خدا کے لئے بتاؤ۔ رجیلہ کی موت میں اس کا ہاتھ ہے؟"

"رجیلہ ——— !"

یکایک اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اسکی آنکھیں پاس ہی درخت کی ایک ہلتی ہوئی شاخ پر لگی تھیں۔ بغیر ایک لفظ کہے، وُہ ایک طرف چلا گیا۔ اور غائب ہو گیا۔ میں اُس شاخ کے قریب گیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا!

(۶)

نادو کی گفتگو کا ہر لفظ، ہر حرف میرے لئے ایک ناقابل حل چیستاں، ایک پُر اسرار معما کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور تو اور اس کا ٹھٹک ٹھٹک کر باتیں کرتے ہوئے، ایک طرف دیکھ کر، ایکدم عالمِ خوف میں خاموش ہو جانا، اور پھر منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر تیزی سے چلے جانا۔ کچھ کم تعجب انگیز امر نہیں تھا۔ میں جب اپنے مکان میں پہنچا۔ میرا دل سخت حیرت میں تھا۔ واقعات پر جتنا غور کرتا جاتا۔ خوف مجھ پر طاری ہوتا جاتا۔ نادو کے چند الفاظ نے مجھے اس پُر اسرار دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں وسیع وغیر محدود فضاؤں میں خوفناک بھیانک غیر انسانی صورتیں، سمع خراش شور پیدا کرتی ہوئی، آگ کے مہیب شعلوں پر رقص کر رہی تھیں۔ میں دوبارہ گھر سے نکلکر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اور جب وہاں سے لوٹا۔ تو رات نصف منزل طے کر چکی تھی۔ دلچسپ مشاغل تفریح میں حصہ لینے کی وجہ سے کسی حد تک خوف کے اثرات میرے دل سے دور ہو چکے تھے اور اس امر کا احساس کر کے، کہ ایک مبہم خوف سے متاثر ہو کر، رات کے وقت مکان پر جاتے ہوئے "ڈرنا بزدلی ہے"۔ میں تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ اگرچہ چاند کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ کوئی شخص نظر نہیں

آتا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے درختوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے ـــــ کہ میں مکان کے قریب آ گیا۔ اب چاند بادل سے نکل آیا تھا۔ اور اس کی روشنی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ دفعتہً مجھے اس چیز کا احساس ہوا۔ کہ کوئی میری طرف آ رہا ہے۔ ہلکی سی آواز میرے کان میں آئی۔ میں کمزور دل انسان نہیں ہوں۔ مگر اس وقت ڈرنے لگا۔ سوکھے ہوئے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ ایک درخت کے تنے پر رکھدیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھا ـــ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر، رحیلہ کی قبر کا پتھر چمک رہا تھا۔ میں آگے قدم اٹھانے ہی لگا تھا۔ کہ ایک طرف، چند گز کے فاصلے پر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ سایہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ میرے سامنے آ گیا۔ چاند کی روشنی میں میں نے دیکھا۔ کہ وہ سایہ انسانی پیکر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میری طرف اُسکی پشت تھی۔ اس لئے میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا ـــــ! کچھ دُور ایک اَور سایہ حرکت کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس کے قریب آ پہنچا۔ پہلے نے رُخ بدلا۔ خوف کی لہر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے دل و دماغ میں دوڑ گئی ـــــ میرے سامنے بوڑھا ساحر اور پجاری کھڑے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا۔ اور درخت سے چمٹ گیا۔ ساحر نے آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ پجاری کے شانے پر مارا اور دونوں میرے گھر کی طرف چلنے لگے۔ کیا ان کا مقصد مجھے ہلاک کرنا ہے؟ یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ اور یہ دیکھ کر کہ میں ان کے قبضے سے باہر ہوں۔ خوف کا کچھ حصّہ زائل ہو گیا۔ رحیلہ کی قبر کے پاس پہنچکر دونوں ٹھہر گئے۔۔ بوڑھے نے قبر پر ہاتھ رکھدیا ـــــــــــــــــــــــــــــ پھر دونوں رحیلہ کی قبر کے پتھر کو اکھیڑنے لگے۔ فضا میں ضربوں سے آہستہ آہستہ آواز پیدا ہونے لگی۔ چند منٹ کے بعد قبر کا پتھر ہٹ گیا۔ بوڑھا ساحر قبر میں داخل ہوا۔ پجاری بھی دہانے پر جھک گیا۔ ایک منٹ اَور گذر گیا۔ اب ساحر کفن میں ملبوس نعش ہاتھوں پر اٹھائے قبر سے نکل رہا تھا۔ اس روح فرسا منظر کو دیکھکر میرا دل دہل گیا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ نیم بیہوشانہ حالت میں مَیں نے جو کچھ دیکھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ پجاری اَور ساحر نعش کو اٹھائے تیزی کیساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں ہوا۔ کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ہوش آیا۔ تو گھر کی طرف جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں واپس چلا گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ساحر اور پجاری میرے مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور قدم اندر رکھتے ہی مجھے ہلاک کر دیں گے ـــــ!

صبح کے وقت جب لوگ چلنے پھرنے لگے۔ میں رحیلہ کی قبر کے پاس پہنچا۔ پتھر اپنی جگہ رکھا پڑا تھا۔ لیکن اس کے نیچے مٹی

اُکھڑی ہوئی تھی۔ یکایک میری نظر ایک چیز پر پڑی۔ مَیں نے اُسے اُٹھا لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہتھیار تھا۔ رات کا واقعہ جسے میں خواب پریشان سمجھنے لگا تھا۔ اب حقیقت اختیار کر چکا تھا ــــ!

ــــــــ(۷)ــــــــ

میرے دل میں رجیلہ کی قبر کھودنے اور رات کے ہولناک واقعے کی تصدیق کا خیال پیدا ہوا۔ مگر ایک مبہم خوف کے زیرِ اثر میری یہ خواہش پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ بوڑھے ساحر کی موت کا یقین آبادی میں ہر شخص کو ہو چکا تھا۔ اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا۔ جس نے اس کی موت کی افواہ کے بعد اسے کہیں دیکھا ہو۔ ان حالات میں لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کر کے، قبر کو کھودنا خود کو تختۂ تضحیک بنانے کے مترادف تھا۔

دو دن اور گذر گئے۔ اور اِس دوران میں میں شش و پنج میں مبتلا رہا۔ اچانک ایک عجیب افواہ میرے کان میں آئی۔ تمام شہر میں دیوی سامو کے غائب ہو جانے پر اظہارِ تعجب کیا جا رہا تھا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا واقعہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا تعجب برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں نے مندر میں جانے کا ارادہ کیا۔ اور دن ڈھلے روانہ ہو گیا۔ لوگ جوق در جوق جا رہے تھے۔ اور ہر شخص اس تحیّر زا واقعے پر، اپنے اپنے خیال کے مطابق روشنی ڈال رہا تھا۔ عام خیال یہ تھا۔ کہ دیوی سامو لوگوں کی سیاہ کاریوں کی وجہ سے چلی گئی ہے۔ اور عنقریب کوئی بہت بڑی مصیبت، کوئی بہت بڑا عذاب آئے گا۔ میں مندر میں گیا۔ جو کچھ سنا تھا۔ بالکل صحیح تھا۔ مورتی غائب تھی۔ پجاریوں کے چہرے رنج و غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر مندر سے باہر نکلا۔ اور کشتی میں بیٹھ گیا۔ رات کی تاریکی بتدریج پھیلتی جا رہی تھی۔ ابر آلود فضائے بسیط پر مغموم چاند اس طرح نظر آ رہا تھا۔ گویا ایک مرجھایا ہوا پھول، بھنگیں موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا، دریا میں بہہ رہا ہے۔ میرا دماغ عجیب و غریب خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کتنے ہولناک خواب ہیں عالمِ بیداری میں دیکھ چکا تھا!

کشتی سے اترنے کے بعد بجائے اپنے مکان کی طرف جانے کے، میں ساحر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے اردگرد تاریکی ہی تاریکی مسلط تھی۔ میں نے جیبی لمپ نکالا۔ اور اس کی روشنی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ اب ساحر کا مکان میرے سامنے تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ میں ایک لمحہ توقف کئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ پہلے زینے پر قدم رکھا، روشنی نظر آئی۔ دائیں طرف دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ایک سوراخ میں چراغ جل رہا ہے۔ اوپر سے ہلکی سی آواز بھی ــــ آ رہی

تھی۔ مگر اس کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اُوپر کئی خونخوار ہستیاں چیخ چیخ کر، انسانی زندگی کی مصیبتوں کا تذکرہ کر رہی ہیں! پہلے کمرے سے ہو کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اور ایک گوشے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی متنفس نہیں تھا۔ ایک طرف شمعدان سے روشنی نکل نکل کر کمرے کی فضا میں حلقۂ نور بنا رہی تھی۔ آخر میں اس کھڑکی کے پاس پہنچ گیا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اور اندر سے ایک مغموم آواز بلند ہو رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، روشنی کم تھی۔ ڈرتے ڈرتے، جھجک جھجک کر، سانس کو روکتے ہوئے، میں نے اپنا چہرہ پٹ کے ساتھ لگا دیا۔ اور اندر دیکھا۔ اُف کس قدر تحیّر زا منظر ——!

کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ، ایک چھوٹے سے چوبی میز کے اُوپر دیوی سامو کی مورتی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے پجاری کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مورتی کے ایک ہاتھ میں تھا۔ اور دُوسرا اس کے سینے پر۔ چراغ کی مدھم روشنی انہیں احاطہ کئے ہوئے تھی۔ پجاری کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور وہ مغمومانہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میری دیوی! میں نے پچیس برس تک تیری پوجا کی —— دل و جان سے تیری خدمت کی۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ تو مجھے میری خدمت کا معاوضہ دے جب میری مراد حاصل ہو جائیگی۔ اس وقت میں کتنا خوش قسمت ہونگا، میری دیوی ——! میری سامو!!"

اس نے ہاتھ وہاں سے ہٹا لئے۔ اور مورتی کے پاؤں پر سر رکھ کر، آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ دو تین منٹ کے بعد وہ اٹھا مورتی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور مندرجہ بالا الفاظ دہرانے لگا۔ اس کے بعد اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ میں نے چہرہ وہاں سے ہٹا لیا۔ ذرا سی دھمک کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ کھڑکی کی طرف آنے لگا —— "بزرگ باپ"! اس کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے اور اس کے ساتھ ہی اس کا پاؤں کھڑکی سے باہر نکلا۔ میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ وہ کھڑکی سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "بزرگ باپ"! اس نے دوبارہ کہا۔ اور جب جواب نہ پایا۔ تو قدم اٹھانے لگا۔ میں دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اسے آتے ہوئے دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکلا۔ اور بعجلت چلنے لگا۔ دروازے تک وہ میرے پیچھے پیچھے آیا، مگر مجھے دیکھ نہ سکا۔ دروازے میں سے نکل کر میں مکان کے عقب میں پہنچا ——! سفید بادلوں میں پھیکا پھیکا زرد زرد چاند، کفن میں لپٹی ہوئی نعش کے چہرے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہر طرف وحشت ناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے اردگرد کے سوکھے ہوئے، سائیں سائیں کرتے ہوئے، درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر، ایک عجیب منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا فضائے بسیط میں بے تابانہ۔ مضطربانہ چکر لگاتی ہوئی زخم نصیب روحیں اپنے دکھوں کی

کہانی بیان کر رہی ہیں۔

میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ چاند بادلوں سے نکل چکا تھا۔ اور اس کی مدھم روشنی پھیل رہی تھی۔ یکایک پاس ہی سے ایک ہلکی سی درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ میں ذرا آگے بڑھا۔ آواز پھر آئی۔ ایسا محسوس ہوا۔ گویا کوئی سوکھے ہوئے پتوں پر چل رہا ہے۔ ایک فوری جذبے کے زیر اثر میں نے چند قدم تیزی سے اٹھائے۔ اور ارد گرد دیکھا۔ دریا کے کنارے، مٹی کے تودے پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اور سر جھکا ہوا تھا۔ درخت کے دو تین پتے اس پر گرے، گھبرا کر اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس کا چہرہ صاف طور پر نظر آ رہا تھا —— یہ "نادو" تھا۔

میں عجلت اس کے پاس پہنچا۔ اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ مضطربانہ حرکت کے ساتھ وہ پیچھے ہٹا۔

"اب مجھ پر رحم کرو —— رحم!"

"نادو"! میں نے کہا!

"تم کون ہو؟"

یہ منظر دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ پھر بھی وہ مجھے پوچھ رہا ہے!

"نادو! میں وہی شخص ہوں۔ جو اس دن شہاب کے ساتھ تمہارے پاس آیا تھا۔ اور اس کے بعد بھی تم سے ملا تھا۔ میرا نام "رشدی" ہے۔ اور تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا —— آنکھیں کھولتے کیوں نہیں؟؟"

"تم نے میری آنکھوں کو دیکھ لیا؟ رشدی!"

"آنکھیں کھولتے کیوں نہیں؟"

"میں اندھا کر دیا گیا ہوں —— میں اب دیکھ نہیں سکتا ——!"

"کس نے تم کو اندھا کیا؟؟"

"اسی نے۔"

"ظالم ساحر نے؟ افسوس میں کیا دیکھ رہا ہوں!"

"میرے ساتھ تو جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ تم اپنی جان بچاؤ خوفناک ساحر تمہاری تاک میں ہے —— جاؤ اپنی جان بچاؤ!"

"ڈرو نہیں نادو! میں اس ظالم سے سمجھ لونگا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم — خوفناک ساحر کی طاقتوں سے تم واقف نہیں۔ مجھے اس نے اندھا کر دیا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کریگا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ بھینچ لیے۔

"لیکن تمہارے ساتھ یہ واقعہ پیش کیوں آیا؟؟"

"اُس دن ساحر نے مجھے تم سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا — اور ایک آدھ بات بھی سن لی تھی۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ تم بھی اپنی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے — ورنہ اِسی زہین دوز کمرے میں تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔"

"یہ تو دریا کا کنارہ ہے —!" میں نے کہا۔

"دریا کا کنارہ! — آہ کتنی مہیب سزا — آنکھوں سے محروم کر کے، جان لینا — کتنی خوفناک سزا ہے؟؟"

"نادو! اِس ظالم کے ظلم اب ختم ہو جائیں گے، اسکی ہلاکت اب قریب آچکی ہے!"

"کیا کہہ رہے ہو تم رشدی! وہ بیحد ظالم شخص ہے۔ اور نہایت خوفناک طاقتوں کا مالک ہے۔ تم جاؤ اور اپنی جان بچاؤ!"

"تمہیں چھوڑ کر تو میں نہیں جا سکتا۔"

"تو کیا کرو گے، میری طرح اندھا ہونا چاہتے ہو رشدی! مجھے چھوڑ دو!"

"اور حیلہ —!" میں آگے کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ نادو نے میرے الفاظ کاٹ کر کہا۔ "اِس قسم کی باتیں مجھ سے نہ پوچھو!"

"اچھا یہاں کچھ نہ بتاؤ — چلو میرے ساتھ؟"

"کہاں؟"

"میرے ہاں!"

"نہیں — یہ نہیں ہو گا۔"

"تمہیں چلنا ہوگا نادو!" یہ کہکر میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ کافی اصرار کے بعد وُہ چلنے پر راضی ہُوا

(۸)

میں نے ایک ہاتھ میں جیبی لیمپ اور دوسرے میں نادو کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکے قیامت خیز شور پیدا کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ چاند تاریک بادل میں چھپ گیا تھا۔ آسمان کے گوشے میں ایک تنہا ستارہ یوں نظر آ رہا تھا گویا شام صحرا میں دُور کسی فقیر کی کٹیا میں ایک دیا روشن ہے۔ نادو کو میں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔ تاہم وُہ سخت خوفزدہ تھا۔ اُسے تسلی دینے کے باوجود مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی مصیبت ہم پر آنے والی ہے۔ میں اسے اپنے مکان میں لے جانا چاہتا تھا مگر وُہ کہیں اور جانے پر مُصر تھا۔ میں نے اس کی رائے پر عمل کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اور دریا کے دوسرے کنارے اپنے ایک دوست کے مکان میں جانے کا ارادہ کیا۔ ساحل پر کوئی کشتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے میں اپنے مکان کی طرف چلنے لگا۔ کیونکہ میری اپنی کشتی مکان کے سامنے بندھی رہتی تھی۔ ابھی تک ہم نے ان پُراسرار واقعات کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ جو چند دن سے پیش آ رہے تھے۔ میں نے نادو کے ہاتھ کو دبایا اور کہا:۔

"نادو تم ساحر کے متعلق کچھ بھی بتانا نہیں چاہتے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائیگا۔ ساحر اس قدر خوفناک قوتوں کا مالک ہے۔ کہ انسانی ذہن اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ افسوس تم اس کے راستے میں حائل ہو رہے ہو۔ اس کی قوت کے سامنے تمہاری ہستی ایک حقیر تنکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ——!"

"ممکن ہے ایسا ہو" میں نے کہا۔ "جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم اس کا جواب دو!"

"تم خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو!"

"نادو، تم یہ الفاظ بار بار کیوں کہہ رہے ہو؟ ساحر نے کئی ہستیوں کو ہلاک کیا ہے۔ اب موقعہ آ گیا ہے۔ کہ اُس سے بدلہ لیا جائے۔ ہماری قوت حقیر ہونے کے باوجود اس سے انتقام لینے میں کامیابی ہو گی۔ یہ میرا یقین ہے۔"

میں نے پُرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ اور وُہ ہے بوڑھے ساحر کے

پُراسرار افعال و اقوال کو معلوم کرنا۔ لوگوں کو اس کے پنجۂ آہنی سے بچانا۔ کیا تم اس کام میں میری مدد نہیں کر سکو گے؟؟

میرے الفاظ سن کر اُس کی حالت میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ "تم جو کچھ کہہ رہے ہو، بالکل درست ہے۔ اتنا خوفناک و ظالم شخص آج تک دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔"

"اِن باتوں کو چھوڑ دو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ رحیلہ کہاں ہے؟"

نادو آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "میں نے اُس دن بھی تمہیں بتانا چاہا تھا۔ کہ رحیلہ مری نہیں —— وُہ ابھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ جس دن سے ساحر نے میری آنکھیں نکال دی ہیں۔ اُس دن سے میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ رحیلہ کی زندگی محفوظ ہے۔"

"رحیلہ کی زندگی محفوظ ہے؟؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"اور محفوظ ہی رہے گی؟؟"

"اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا ——!"

"اور یہ واقعات جو اس کے ساتھ پیش آئے۔ کیا راز اپنے اندر رکھتے ہیں؟؟"

"صرف ایک راز —— اور وُہ یہ ہے۔ بوڑھا ساحر مدت سے سنہری بالوں والی دوشیزہ کی تلاش میں تھا۔ اُسے رحیلہ ملی۔ مگر شہاب کے ساتھ۔ دوشیزہ کو شہاب سے علیحدہ کرنے کے واسطے جو کچھ اُس نے کیا، تم اس سے بے خبر نہیں ہو۔ شہاب کی کشتی کا الٹ جانا —— رحیلہ کو پہاڑوں والے مکان میں لے جانا، پھر اسے مُردہ بنا دینا۔ اور آخر میں اسے قبر سے نکالنا۔ یہ تمام واقعات شہاب سے رحیلہ کو جدا کرنے کی ہولناک کوششیں تھیں۔"

"اور اب وُہ کہاں ہے؟"

"ایک علیحدہ مکان میں —— جس کی تمہیں خبر نہیں، اور نہ جس کی مجھے خبر ہے!"

"تمہیں اس کی خبر نہیں؟"

"بالکل نہیں —— اسے ساحر کے مکان سے لے گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ میں نہیں جانتا۔"

"وُہ پہاڑوں والے مکان میں ہوگی؟"

"نہیں ـــــ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تم نے اُسے دیکھ لیا ہے ـــــ ساحر کسی کو اپنے کاموں میں مخل نہیں دیکھ سکتا۔ جو شخص مخل ہوتا ہے۔ یا تو اسے مار ڈالتا ہے، یا بالکل علیحدہ کر دیتا ہے!"

"یہ بتاؤ کہ رجیلہ مر گئی تھی۔ پھر قبر سے لیکر اُسے زندہ کیونکر کیا گیا۔ اتنا عرصہ کیا وُہ بے ہوش ہی پڑی رہی؟"

"نہیں وُہ بے ہوش نہیں تھی، مردہ تھی۔ اُس کی روح ساحر نے نکال لی تھی ـــــ اور پھر قبر سے نکالنے کے بعد اسے زندہ کر دیا گیا ـــــ ساحر اسی قسم کی خوفناک قوتوں کا مالک ہے!"

اس سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یہ بات کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ یہ واقعہ سنکر میرے دل و دماغ پر خوف طاری ہو گیا ـــــ لیکن میں نے دل کڑا کیا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو نادو!"

"نہیں ـــــ ابھی کشتی نہیں آئی؟"

"بس چند قدم اور چلو"

اچانک مجھے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

"وُہ آگیا ـــــ ؟؟" نادو نے میری خاموشی اور مضطربانہ حرکت سے اندازہ لگا کر گھبراتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ حوصلہ رکھو!"

ہم چلنے لگے۔ چند قدم طے کر کے میں نے پھر اپنی دائیں طرف دیکھا۔ چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ مگر اتنی جلدی غائب ہو گئے۔ کہ میں نے اس منظر کو آنکھوں کا دھوکا سمجھا۔ چونکہ کشتی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس لئے اس میں بیٹھ گئے اور کشتی چلنے لگی۔ ایک مبہم خوف میرے دل پر چھا چکا تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ کوئی بڑی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے ایک اور کشتی آ رہی تھی۔ جس خطرے کا اندیشہ تھا۔ وُہ پیش آ رہا تھا!

"تم خاموش کیوں ہو گئے؟" نادو نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں!"

"تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

کشتی قریب آتی جارہی تھی۔ اور میرا ڈر بڑھتا جا رہا تھا۔

"مجھے کیوں نہیں بتاتے، رشدی! کیا معاملہ ہے؟"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"جو معاملہ ہے ــــ میں نے تم سے پہلے کہہ دیا تھا۔ کہ خطرہ آنے والا ہے۔ تم نے میری بات نہ مانی!"

"ایک کشتی آرہی ہے۔ تم حوصلہ رکھو، میں مقابلہ کرونگا!"

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے!"

اب ہماری کشتی وسط دریا میں پہنچ چکی تھی۔ ہماری اور دوسری کشتی کے درمیان تین چار گز کا فاصلہ تھا۔

"نلوہ!" میں نے اُس کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "مصیبت آگئی ہے، لیکن میں اس کا مقابلہ کرونگا! کیا تم میری آخری آرزو پوری نہیں کرو گے؟"

"کیا ــــ کہو؟"

"رجیلہ کہاں ہے؟"

"پہاڑوں والے مکان میں ــــ"

"اُس کے ساتھ کیا ہوگا؟"

"اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ کل نصف رات کو اُس کا دل ــــ"

یکایک ایک بہت بڑا پتھر ہماری کشتی میں گرا۔ اور اسکی آواز پتھر کی دھمک میں ڈوب گئی! پیشتر اس کے کہ وہ الفاظ دوبارہ کہتا۔ دو لحیم و شحیم شخص پجاری اور ساحر کود کر ہماری کشتی میں آگئے۔ میں تیزی سے اُٹھا۔ اندھے کی حالت اُس وقت قابلِ رحم تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپر اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ ایک لحیم و شحیم شخص نے زور کے ساتھ میرے سینے پر گھونسا مارا۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ پھر اُٹھا۔ مگر دوسری بار بھی میرا یہی حشر ہوا۔ اب میں نے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے منہ میں خون آگیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا ــــ مُردے کی مانند میں تختے پر بے حس و حرکت پڑ گیا۔ انہوں نے کشتی الٹ دی۔ میں پانی کے نیچے جانے لگا۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت تو مجھ پر طاری تھی۔ مگر اپنی موجودہ حالت کا اندازہ لگانے سے میں قاصر نہ رہا۔ میں نے ڈبکی لگائی۔ اور دُور جا کر، انتہائی کوشش سے آہستہ آہستہ تیرنے لگا!

(۹)

جب میں کنارے پر پہنچا۔ میرا جوڑ جوڑ عضو عضو ٹوٹ رہا تھا۔ سینے میں ناقابلِ برداشت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اور پاؤں کا تو یہ حال تھا۔ کہ ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ سر کے پچھلے حصے میں، چپو کے لگنے سے سخت چوٹ آئی تھی۔ اور ابھی تک زخم میں سے خون بہ رہا تھا۔ میں نے رومال زخم پر باندھ دیا۔ اور ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا۔ اور بڑی مشکل سے قدم اٹھانے لگا۔ حالت یہ تھی۔ کہ ایک ایک قدم پر محسوس ہوتا تھا۔ کہ کسی نے دماغ میں نشتر چبھو دیا ہے۔ آخر کار بمشکل تمام گھر پہنچا۔ اور پہنچتے ہی لیٹ گیا۔ درد لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فرطِ نقاہت اور شدتِ درد سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بے ہوشی تو دور ہو گئی۔ لیکن درد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ پہلو بدلنا بھی میرے لئے مشکل ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا جسم آتشیں زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ تمام دن اسی حالت میں گزر گیا۔ شام کے وقت میں کہیں حرکت کرنے کے قابل ہو سکا۔ گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ بالخصوص بدنصیب اندھے کی دردناک موت کا واقعہ دل کو بیقرار کرنے لگا۔ کافی دیر تک میں انہی خیالات میں غرق رہا۔ یکایک نادو کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "رحیلہ کی پُراسرار زندگی کا سوال میرے پیشِ نظر تھا۔ ممکن ہے رحیلہ زندہ ہو —— پھر اُسے بچانا میرا فرض نہیں ہے ؟" یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا۔ مگر اس حالت میں ساحر کے مکان میں جانا۔ اور ساحر کے کام میں مداخلت کرنا انتہائی مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ تاہم ایک جذبہ تھا جو مجھے ہر مصیبت ہر تکلیف کے برداشت کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اور وہ جذبہ تھا راز جوئی کا۔ اس کے علاوہ رحیلہ کی زندگی بچانے کی تمنا بھی میری سعی و تجسس کو قوت دے رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھا۔ اور مکان کے نیچے آیا۔ گھوڑے کی لگام پکڑی اور اُسکے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تھم گئی تھی۔ میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا —— اور روانہ ——

ایک مضبوط ارادے کی قوت، ایک قوی جذبے کی طاقت جسمانی تکلیفوں اور دنیاوی کشمکشوں کے اثرات مختصر سی دیر کے لئے ضرور زائل کر دیتی ہے۔ اس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ راز جوئی کا جذبہ "رحیلہ" کی زندگی بچانے کا خیال میرے دل و دماغ پر پوری قوت کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ جسمانی تکلیف، اس خطرناک اقدام کا ہولناک انجام، بوڑھے ساحر کی ہیبت ناک شخصیت کی ہیبت خیزیاں، الغرض میں ان تمام چیزوں سے بے پروا ہو گیا تھا —— فضا میں میرے گھوڑے کی

ناپوں کی آواز گونج رہی تھی۔ آخر کار میں منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ پہاڑوں کے پاس ساحر کا مکان کھڑا تھا۔ میں نے گھوڑا درخت سے باندھ دیا۔ اب مشکل یہ تھی۔ کہ اوپر کیونکر جاؤں؟ گھوڑے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے، کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہونے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ مگر ایک مبہم سا خوف دل پر طاری ہو گیا۔ بغیر کچھ معلوم کئے خطرے میں پڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر خیال آیا۔ کہ اس دن شہاب نے بھی یہی اقدام کیا تھا۔ تاہم اس اقدام کے پسِ منظر کوئی اور جذبہ تھا۔ عشق کے راستے میں عقل کی پختہ کاری و دُور اندیشی کو ذرہ بھر اہمیت حاصل نہیں ہے۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ میرے پاس سے کوئی گذرا میں درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ دُور جا کر، اس نے چند پتے اٹھائے۔ اور پھر واپس چلنے لگا۔ میں اسے دیکھنے لگا وہ مکان کے عقب میں چلا۔ چند قدم طے کرکے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ جہاں اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آدمی ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چٹان کی طرف چلا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ اس چٹان کے پیچھے مکان کو جانے کا راستہ ہے۔ چٹان کے پاس پہنچ کر میں جھکا، رازجوئی کے جذبے نے اکسایا۔ اور میں چٹان کے پیچھے جا کر، سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ چار پانچ سیڑھیوں کے بعد میں گھپ اندھیرے میں تھا۔ میں نے جیبی لمپ کو روشن کیا۔ یہ ایک زمین دوز کمرہ تھا۔ جس کے وسط میں بڑے بڑے ستون کھڑے تھے۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا تھا۔ جگہ زیادہ فراخ ہوتی جاتی تھی۔ حیران تھا۔ کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ آخر کار پلٹا۔ اور دیوار کے ساتھ ساتھ واپس آنے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر کافی روشنی دکھائی دی۔ وسط میں ایک خلا سے روشنی آ رہی تھی۔ میں نے سمجھ لیا۔ کہ مکان کے نیچے کی جگہ ہے۔ اسی اثنا میں، میری نظر ایک اونچی سی جگہ پر پڑی۔ جلدی سے وہاں پہنچا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ چبوترہ ہے۔ اور اس کے بعد سیڑھیاں چبوترے پر پہنچ کر، میں نے سیڑھی پر قدم رکھ دیا — دل دھڑکنے لگا —! میں نے دل کڑا کیا۔ اور چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ آخری سیڑھی پر پہنچ گیا۔ آگے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دیوار میں ایک دیا جل رہا تھا۔ آگے نشیبی راستہ تھا۔ دائیں طرف ایک اور کمرہ تھا۔ دروازے میں سے جھانک کر میں نے اندر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ چند قدم طے کرکے، میں ایک اور دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کا ایک پٹ کھُلا تھا۔ اندر سے ساحر کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اندر دیکھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں روشنی تھی۔ اور باقی حصہ نیم تاریکی میں تھا۔ جس گوشے میں روشنی تھی۔ وہاں دیوی سامو کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اور پجاری اس کے سامنے سجدے میں گرا ہوا تھا۔ میں نے جرأت کرکے دروازے میں قدم رکھا۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میری نظر ایک گوشے میں گئی —— اور ایسا محسوس ہوا۔ گویا میں کوئی وحشتناک خواب

دیکھ رہا ہوں۔ دیوار کے ساتھ رجیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ میں قدم آگے بڑھانے ہی لگا تھا۔ کہ ساحر کی خونخوار نظریں میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ وہ ایک طرف کھڑا تھا۔ خوف سے میں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ آہ فطرتِ انسانی کی کمزوری!

رجیلہ کا چہرہ چھپ گیا۔ روشنی زیادہ مدھم ہو گئی! میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود!! پجاری اٹھا۔ اور یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلنے لگے:۔

"میری ساموا! اب وقت ہے۔ کہ میری آرزو پوری ہو۔ میری ساموا! ساموا!؟"

یہ کہتے ہوئے وہ مورتی کے پاؤں سے چمٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ساحر مورتی کے پاس آیا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹا!" یہ سن کر پجاری اٹھ بیٹھا!

"تمہاری آرزو پوری ہونے والی ہے ــــ خاموش کھڑے رہو!

"میری آرزو ــــ میری آرزو پوری ہو جائیگی ــــــ!

پجاری نے مورتی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اور خاموش ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ساحر تاریک گوشے میں چلا گیا۔ دو منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ پھر فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی پجاری سجدے میں گر پڑا تھا۔ اور اس کی ہلکی ہلکی آواز فضا میں گونج رہی تھی ــــ مگر چیخ ــــ

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

ساحر ہاتھوں میں کچھ لئے ہوئے مورتی کے پاس آیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کے ہاتھوں میں پتے ہیں۔ اور ان پر کوئی سرخ سی چیز ــــ!!

پجاری زور زور سے کچھ کہنے لگا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ پھر وہ اٹھا۔ اور انگیٹھی میں سے جلتی ہوئی لکڑیاں لے کر مورتی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مورتی کے چہرے کے آگے دھواں اور شعلے تھے ــــ!! میں دو قدم آگے بڑھا۔ اب ساحر اور پجاری کی خوفناک آوازیں گونجنے لگیں۔ میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ دونوں کے ہاتھ پر اسرار حرکت کرنے میں مشغول تھے۔ وہ حرکت کیا تھی؟ دھوئیں اور شعلوں کی وجہ سے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پجاری نے لکڑیاں انگیٹھی میں رکھ دیں۔ اور پھر واپس آکر ساحر کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد دونوں سجدے میں گر پڑے۔ اس کے بعد

جو منظر میں نے دیکھا۔ وہ میں تادم واپسیں بھی نہیں بھول سکتا۔ اُف کس قدر دہشتناک واقعہ !!

موتی میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے بازو آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگے۔ فرطِ خوف سے میں کانپنے لگا۔ پجاری جلدی سے اُٹھا۔ اُس کے لبوں سے نعرۂ مسرت بلند ہوا۔ اور وہ پُراسرار موتی سے لپٹ گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ میری زندگی کا سب سے زیادہ تحیر زا سب سے بڑھکر حیرت خیز واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

موتی برابر حرکت کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ اور فضا میں ایک شیریں آواز گونجی !

فرطِ خوف و حیرت سے میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ میں دیوار کے ساتھ سہارا لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ ہیبت ناک انسان، جسے دنیا ساحر کہتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن کو سُن رہا ہے۔ اور ابھی اس کے خونخوار پنجے میرے سینے کی طرف بڑھیں گے۔

پجاری جلتی ہوئی لکڑیاں اُٹھائے، رقص کر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی پھیلتی جاتی تھی۔ میری زندگی انتہائی خطرے میں تھی۔ اور یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا۔ کہ میں گر رہا ہوں۔ دھم کی سی آواز آئی —— اور پھر —— ساحر کی خوفناک، خونخوار نظریں، میرے چہرے کے قریب تھیں۔ اس نے مجھے پاؤں کی ٹھوکریں لگائیں۔ اور گرجتے ہوئے لہجے میں کچھ کہا۔ اس کے بعد کئی طاقتور ہاتھوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اور لے جانے لگے۔ میں بے ہوش ہو گیا —!!

جب میں ہوش میں آیا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ میں مکان کے نیچے، ستون کے ساتھ مضبوط رسے سے باندھ دیا گیا ہوں۔ اوپر خلا میں سے روشنی میرے پاس مختصر سی جگہ پر پڑ رہی تھی۔ باقی حصہ تاریکی میں تھا۔ سامنے کے ستون ہیبت ناک اژدہوں کی مانند پھنکارتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میرا جسم اس مضبوطی اور سختی سے جکڑا گیا تھا۔ کہ ذرہ بھی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُف کس قدر عجیب سزا تھی۔ میں نے نظریں اوپر اُٹھا کر خلا کو دیکھا۔ ساحر کی خونخوار خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ملعون انسان! میرے کام میں مداخلت کرنے کی یہ سزا ہے!" اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ اور اپنے آپ کو ملعون کرنے لگا۔ کہ کیوں یہ اقدام کیا؟

بھوک اور پیاس کی شدت، فرطِ نقاہت اور اپنے دردناک انجام کا تصور، آہ اس وقت میں کتنی مصیبت

میں تھا، قلم اس وقت کی مصیبت کا اظہار کرنے سے یکسر قاصر ہے!

وقت گذرتا گیا اور تکلیف بڑھتی گئی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ موت جلد آجائے۔ تاکہ اس ناقابل برداشت مصیبت سے نجات ملے۔ اب بھی اس حالت کا خیال کرتا ہوں۔ تو بے اختیار کانپ جاتا ہوں۔ ساحر بار بار آ کر خلا میں سے مجھے خوفناک انجام کی خبر دیتا۔ میں کہنا چاہتا۔ کہ مجھے جلد ہلاک کر دے۔ مگر میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا!

اب دن ہے یا رات، میں یہ امتیاز کرنے سے قاصر تھا۔ ہر آنیوالا لمحہ میری تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔ اسوقت جب کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ایک دو منٹ کے بعد میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایک نرم و نازک ہاتھ میرے شانے پر لگا۔ دو تین لمحوں کے بعد ایک حسین پیکر میرے سامنے تھا، یہ حسین پیکر، دیوی سامو تھی —— زندہ، حسین و جمیل عورت!!

"تم کتنی مصیبت میں ہو؟" اس نے شیریں آواز میں کہا۔

میں نے اپنی زبان باہر نکالی۔ وہ وہاں سے چلی گئی چند منٹ کے بعد واپس آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا۔ اور دوسرے میں جلتی ہوئی لکڑی۔ گلاس اس نے میرے منہ سے لگا دیا۔ مجھ میں ذرا سی قوت پیدا ہوئی۔ پھر اُس نے جلتی ہوئی لکڑی سے میرے رسے کو آگ لگا دی —— دو تین منٹ کے بعد میں آزاد تھا۔ اور وہ سنہری بالوں والی حسین و جمیل مگر پُراسرار عورت مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سامو، سامو!!"

پجاری کی آواز اوپر سے آئی۔ سامو چلی گئی۔ میں باہر نکلا اور چلنے لگا۔

گھوڑا بھوکا پیاسا، درخت سے بندھا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس خیال سے کہ کہیں ساحر دیکھ نہ لے۔ اور میں پھر کسی جانگداز مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا۔ کافی دور جانے کے بعد میں اترا۔ گھوڑے کو چشمے میں سے پانی پلایا۔ اور پھر روانہ ہو گیا۔ جب میں گھر پہنچا۔ میرے ریشے ریشے، رگ رگ میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تمام جسم جکڑے رہنے کی وجہ سے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ سینے پر تو ہاتھ بھی نہیں رکھا جاتا تھا۔ سر سے خون بہہ کر گردن پر جم گیا تھا۔ ایک دوست کی تیمارداری نے مجھے مرتے مرتے بچا لیا۔ چند دن گذر جانے کے بعد کہیں جا کر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا۔ جسمانی تکلیف میں تو کمی واقع ہوئی۔ مگر ذہنی اضطراب لمحہ بھر چین لینے نہیں دیتا تھا۔ واقعات نے کچھ اس طرح کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کہ میں عجب کشمکش میں تھا۔ حیرت خیز سے حیرت خیز واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پیش آ چکا تھا۔ اور

سب سے بڑھکر حیرت ناک واقعہ دیوی ساموٗ کا زندہ ہونا تھا۔ ایک بے جان، بے حس و حرکت، سنگِ مرمر کی مورتی کا چلنا، پھرنا بولنا چالنا، اور مسکرانا، اُف کتنا تعجب خیز امر تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہو گیا۔ کہ ساحرا ایسی خوفناک قوتوں کا مالک ہے جنہیں ذہنِ انسانی تصوّر میں بھی نہیں لا سکتا۔ میں دیر تک انہی خیالات میں غرق رہا۔ جب رات کے وقت بستر پر سویا۔ تو یہی واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ایک واقعہ تو بار بار میرے ذہن میں آتا۔ بار بار ذہن میں آ کر، بیتاب کرتا۔ اور وُہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا۔ جبکہ میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ یعنی ساموٗ کا مجھے پانی پلانا، میرے رسّے کو جلانا، اور میری زندگی بچانا ——! جب اس نے گلاس میرے منہ سے لگایا تھا۔ اس وقت وُہ کتنی خوبصورت، کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی؛

ساموٗ ——؛

حسین ترین عورت، مگر اس کے ساتھ نہایت پُراسرار، جب اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھکر مجھے سیاہ لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تو ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ اس کے سرخ رخساروں پر بکھرے ہوئے سُنہری بال کتنے دلآویز منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے تھے؛ مجھے شاید اس پُراسرار عورت سے محبت ہو گئی ہے۔" میں نے دل میں کہا۔ اور بے تاب ہو کر کروٹ بدلی۔ ساموٗ کا مسکراتا ہوا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔

ایک دن اور گذر گیا۔ لیکن یہ عجیب و غریب جذبہ میرے دل کی گہرائیوں میں ترقی کرتا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہ بیتابی ساموٗ کی محبت کے باعث ہے۔ لیکن جب یہ خیال آیا۔ کہ چند دن ہی ہوئے، مرتے مرتے بچا ہوں۔ اور دیوی ساموٗ کا زندہ دیکھنا بھی فریب نظر ہے۔ تو ذہن گذشتہ واقعات دہرانے لگا۔ بار بار غور کرنے اور واقعات دہرانے کے بعد بھی میں اس خیال کو رد نہ کر سکا۔ کہ ساموٗ کو میری نظروں نے زندہ دیکھا ہے۔ "رجیلہ کے ساتھ کیا کیا گیا؛ شاید یہ رجیلہ ہی ہو۔ مگر رجیلہ اور ساموٗ کی صورتوں میں بہت فرق تھا۔ گو دونوں کے بال سنہری تھے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی مشابہت نہیں تھی۔ اچانک مجھے وُہ الفاظ یاد آ گئے۔ جو اندھے ملاح نے کشتی میں کہے تھے۔ "رجیلہ کا دل! افسوس میں آگے کچھ نہ سن سکا۔ معلوم نہیں یہ کتنا بڑا راز تھا۔ چین میں میں نے سنا تھا کہ انسانی دل، دیوی کے سامنے پیش کرنے سے آرزو پوری ہو جاتی ہے اور یہاں کونسی آرزو تھی، دیوی کا زندہ ہونا ——! ممکن ہے رجیلہ کا دل ساموٗ کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ اور وُہ اسی دل کی گرمیٔ حیات سے زندہ ہو گئی ہو! یہ خیالات ایک ساتھ میرے دماغ میں آئے۔ اسی عالم استغراق میں میں سو گیا۔

صبح اٹھا۔ تو وہی خطرناک جذبہ کافی ترقی حاصل کر چکا تھا۔ اور وہ جذبہ کیا تھا، ساموکی محبت !!

یہ ساموکی محبت ہی تھی جس نے مجھے اس بھیانک مقام پر جانے کے لئے اُکسایا۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب میں ساحر کے مکان کے پاس پہنچا۔ ابھی گھوڑے کو باندھ رہا تھا۔ کہ میری نظروں نے دور ایک شعلہ دیکھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ ایک دو منٹ کے بعد ساموجلتی ہوئی لمبی لمبی لکڑیاں، ہاتھوں میں اٹھائے۔ اچھلتی کودتی، سامنے کے میدان میں آگئی۔ میں آگے بڑھ کر، جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ حسین ساحرہ عجب انداز سے رقص کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹھہر گئی۔ اس کی لکڑیاں آدھی سے زیادہ جل چکی تھیں۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر، دائیں جانب آگ بلند ہوئی۔ میں حیران تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ کہ وہاں سے پجاری جلتی ہوئی لکڑیاں لئے آگے بڑھا۔ ساموں نے وہ لکڑیاں پھینک دیں اور دوسری لکڑیاں پکڑ کر اپنے شغل میں مشغول ہو گئی۔ کیسا عجب نظارہ تھا۔ جو شخص خود جلتی ہوئی لکڑیاں اٹھا کر عبادت کے طور پر، دیوی کے سامنے ناچا کرتا تھا۔ اب اُس کے سامنے اس کی معبودہ اسے خوش کرنے کے واسطے ناچ رہی تھی!

وہ لکڑیاں بھی نصف سے زیادہ جل گئیں۔ اس نے لکڑیاں پھینک دیں۔ اور مسکراتی ہوئی پجاری کی طرف آئی۔ پجاری نے آگے بڑھ کر اُسے آغوش میں لے لیا۔

"میری محبوبہ سامو!" پجاری کے لبوں سے نکلا۔ اور اس کے ہونٹ، ساموکے ہونٹوں کی طرف بڑھنے لگے اور ——— پھر پیوست ہو گئے۔ ساموں نے اپنے ہونٹ علیحدہ کر دیئے۔ اس کے چہرے پر آزردگی کے آثار نمایاں تھے۔ پجاری نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ہلکی سی شیریں آواز مجھے یہ کہتے ہوئے سنائی دی۔

"بوڑھے ہونٹ!"

ساموایک طرف کو چلنے لگی۔ پجاری بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ وہ چلتے گئے۔ اور میں جھاڑیوں میں سے، نکل کر انہیں دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر، میرا دل لرز گیا۔ ساحر خوفناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے پلٹا۔ گھوڑے کو کھولا۔ اور اس پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا ———!!

مکان کے قریب آ کر میں گھوڑے سے اترا۔ اور چلنے لگا۔ یکایک جمیلہ کی قبر کے پاس مجھے ابھری ہوئی کوئی چیز دکھائی

دی بعجلت وہاں پہنچا۔ رحیلہ کی قبر کا پتھر علیحدہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے قبر کے اندر دیکھا۔ وہاں چند اینٹوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت میں ایک جذبۂ بے اختیار کے زیر اثر جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا رحیلہ کی قبر کے پاس پہنچا۔ وہ اسی حالت میں تھی۔ جس حالت میں میں ایک دن پیشتر اسے دیکھ چکا تھا۔ پتھر ایک طرف پڑا تھا۔ اکھڑی ہوئی اینٹیں دوسری جانب اور ان کے درمیان ایک خوفناک گڑھا۔ میں نے جیبی لیمپ روشن کر کے نہایت احتیاط کے ساتھ اس پُراسرار گڑھے میں نظر ڈالی۔ اینٹوں کے علاوہ درخت کے چند پتے بھی اب نظر آرہے تھے۔ ان کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں چند منٹ وہیں کھڑا رہا۔ ہجوم خیالات میں غرق! حیرت ناک واقعات کے تسلسل نے مجھے اس مقام پہنچا دیا تھا۔ جہاں تحیر زا سے تحیر زا واقعہ بھی انسانی ذہن پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتا۔ میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ بے جان، بے حس و حرکت سنگِ مرمر کی مورتی کا زندہ ہونا! مدفون نعش کا قبر میں سے لے جایا جانا ـــــــ اور ابھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے بڑھ کر تعجب انگیز و محیر العقول واقعات رونما ہونے والے ہیں ـــــــ!!

جب کافی تاریکی پھیل گئی۔ تو میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مکان کو چلنے لگا۔ ہوا کے تیز و سرد جھونکے درختوں سے ٹکرا کر اس طرح شور پیدا کر رہے تھے۔ گویا ایک زخمی شیرنی مسموم تیر پہلو میں لیے چنگھاڑ رہی ہے۔ فضائے بسیط میں سیاہ بادل مصرِ قدیم کے حبشی غلاموں کی مانند وحشیانہ رقص کر رہے تھے۔ ایک سیاہ بادل کے پاس مرجھایا ہوا افسردہ چاند اس طرح نظر آرہا تھا۔ گویا ایک بدقسمت عورت، ماتمی لباس میں ملبوس، ہاتھوں میں چراغ پکڑے۔ رات کی تاریکی میں، ٹھوکریں کھاتی ہوئی گرتی پڑتی اپنے شوہر کے مرقد کی طرف جا رہی ہے۔

میں گھر جا کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور باہر دیکھنے لگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی۔ کہ میرے دل میں سلیو کے مکان میں جانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ ساموکا حسین و جمیل، دلآویز و سحر زا چہرہ میری آنکھوں کے آگے پھرنے لگا میں بعجلت مکان سے نیچے اُترا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر، ساحر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ عجیب بات تھی۔ کہ جب میں ساحر کے مکان سے کچھ فاصلے پر، گھوڑے سے اُتر رہا تھا۔ اس وقت یہ خیال کہ آج کی رات ایک ہولناک ترین واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ یقین کی قوت حاصل کر چکا تھا۔ مکان کے پہلو میں عظیم الجثہ پہاڑ بزبان خاموشی میرے یقین کی تائید کر رہے تھے۔ گھوڑے کو باندھ کر میں مکان کے عقب میں پہنچا۔ ابھی چٹان کے پاس بھی نہیں پہنچا تھا۔ کہ پاس ہی میری نگاہ ہونے

کسی شخص کو دیکھا۔ میں ایک طرف ہوگیا۔ اس شخص کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ یکایک اُس نے میری طرف رُخ کیا۔ میں نے چاند کی مدھم روشنی میں دیکھا۔ کہ وُہ شہاب ہے ——!!

قریب جا کر میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھدیا!

"شہاب!"

شہاب نے میری طرف دیکھا۔ غصّے سے اُس کی آنکھیں خونفشاں نظر آرہی تھیں۔

"رشدی! تمہیں کچھ خبر ہے"! اس نے بلند آواز سے کہا۔

"آہستہ سے بولو" میں نے انگلی لبوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "موقعہ کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیئے"۔

"تم نہیں جانتے، کیا ہُوا ہے ؟؟"

"کہو، کوئی اور گُل کھِلا ہے ؟"

"اس قدر ظلم ——؟"

محبوبہ کی موت انسان کے لئے سب سے بڑا ظلم ہے!"

"یہی نہیں بلکہ اُس کی نعش بھی قبر میں نہیں ہے ——! سنتے ہو رشدی!"

"تم نے اس کی قبر کھودی ہے؟" میں نے متعجبانہ پوچھا۔

"ہاں —— سخت بیتاب ہو کر میں اس کی قبر پر گیا۔ اور اس کی قبر کھود ڈالی —— مگر اس کی نعش —— اسکی نعش کہاں گئی —— اسے کون لے گیا ؟؟"

"میں نے اسے ساحر کے پاس زندہ دیکھا ہے" میں نے بے اختیارانہ کہدیا۔ دفن کرنے کے بعد اُسے زندہ تو میں نے دیکھا تھا۔ مگر کیا وُہ اسوقت بھی زندہ تھی؟ اس کے متعلق مجھے کیا خبر ہوسکتی تھی؟

"زندہ —— کون ؟؟ میری رحیلہ ؟؟؟" یہ کہتے ہوئے شہاب مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا!"

"کیا —— ؟؟"

اتنا مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہاب!"

شہاب وحشیانہ طور پر مکان کی طرف جانے لگا۔

"شہاب!" میں نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ مکان میں جانے کا راستہ بھی تمہیں معلوم ہے؟"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں اندر چلا جاؤنگا ـــــ کسی نہ کسی طرح!"

"ذرا ٹھہرو۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔ صبر سے کام لو۔ اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا!"

"تو چلو ـــــ!"

اسوقت شہاب عجب حالت میں تھا۔ محبت میں انسان کیا کچھ نہیں ہو جاتا؟ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چٹان کے عقب میں جا کر ٹھیرا۔ لمپ روشن کیا۔ اور اس کے آگے سیڑھی پر قدم رکھا۔ اضطراب و ہیجان کے باعث وہ بار بار مجھ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ اور مجھے تیزی کے ساتھ چلنے کے لئے کہتا۔ سیڑھی کے بعد اب زمین دوز کمرہ آچکا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کافی دور تک چلے گئے۔ مگر اوپر جانے کی سیڑھیاں نہ ملیں۔ افسوس میں راستہ بھول گیا تھا۔ ہمارے آگے روشنی کا مدھم سا حلقہ نور تھا۔ اور دائیں بائیں خوفناک تاریکی ہیبت ناک خاموشی!

شہاب نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ آخری حد تک پہنچنے کے بعد ہم دونوں مڑے ـــ یکایک ایک طرف روشنی نظر آئی۔ شہاب اپنا ہاتھ چھڑا کر جلدی سے وہاں پہنچا۔ میں بھی اس کے پیچھے وہاں گیا۔ ہم دونوں خلا کے نیچے تھے۔ وہی جگہ جہاں مجھے ستون کے ساتھ جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا۔ اور جہاں میری نگاہوں نے ایک خواب جمیل کو انسانی پیکر میں دیکھا تھا۔ مجھے قریب ہی ستون کے پاس کوئی چیز پڑی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچا۔ اور جیبی لمپ کی روشنی میں ایک نہایت لرزہ خیز منظر دیکھا۔ رجیلہ کی نعش خاک پر پڑی تھی۔ اس کے سینے میں بڑا سا شگاف تھا۔ ـــــ اُف یہ ہولناک منظر!!

شہاب دیکھتے ہی نعش سے لپٹ گیا۔

اس منظر نے تمام بکھری ہوئی کڑیوں کو ملا دیا۔ ساحر کو رجیلہ کی نہیں۔ رجیلہ کے دل کی ضرورت تھی۔ کشتی میں اندھا دادو یہی کہنا چاہتا تھا۔ اس بدنصیب عورت کے دل ہی نے بے جان مورتی میں زندگی پیدا کی تھی میں نے شہاب کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ برابر اپنی مردہ محبوبہ کی بے نور مگر حسرت بداماں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"بدنصیب دوست اٹھو۔ قسمت کو یہی منظور تھا۔"

شہاب نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور خاموش رہا۔

"شہاب! اب اُٹھو۔ قسمت نے ہمیں کیا کچھ نہیں دکھایا؟"

"میری رجیلہ کی نعش ——— سبینہ ———؟؟"

"ہاں یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری محبوبہ مر گئی تھی ——— اور اب بھی مُردہ حالت میں ہے۔"

"یہ تمام کارروائی اس شیطان کی ہے ——— میں اس کی ہڈیاں چبا ڈالوں گا!" ——— اس کی خونفشاں آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اُس نے نعش کو اُٹھا لیا۔ "میں ابھی اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا۔ اتنا ظلم ———؟؟"

میں نے اس کا دامن پکڑا۔ مگر وہ دامن چھڑا کر، تاریکی میں غائب ہو گیا۔ پھر دھم کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا۔ وہ گر پڑا ہے۔ اس لئے اس طرف بڑھنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی اُٹھائے تھے۔ کہ ایک دم۔ دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں بعد ازیں میں جیم و شحیم آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ چار پانچ آدمی اور آ رہے تھے۔ وہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر مجھے لے جانے لگے۔ موت کی ہولناک تصویر میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں ساحر کی خونخوار نظروں کے سامنے تھا۔

خلا کے پاس ساحر کھڑا تھا۔ اور اس کے پاس پجاری خلا میں دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بدبخت انسان! تو ابھی زندہ ہے؟" ساحر نے مجھے دیکھ کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا،

"میری آخری آرزو!" پجاری نے ملتجیانہ نظروں سے ساحر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" ساحر نے اپنا دایاں ہاتھ اُس کی پشت پر رکھ کر کہا۔ "تمہاری آخری آرزو کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

پھر اُس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "حقیر ہستی! یہاں آ کر بیٹھ جا۔"

یہ سنگی کرسی پر بیٹھ گیا۔ خوف نے میرے لب سی دیئے تھے۔ پجاری للچائی ہوئی نظروں سے میرے بازوؤں اور سینے کو دیکھنے لگا۔

"میری آخری آرزو ———"

وہ ابھی فقرہ ختم کرنے بھی نہیں پایا تھا۔ کہ شہاب کو تین چار آدمی پکڑے ہوئے اُوپر لائے۔

"تم پھر آ گئے شہاب! تمہاری رجیلہ مر چکی ہے۔ اور یہ صدمہ تمہارے لئے کافی تھا۔ مگر تم اپنی جان بھی گنوانا چاہتے

ہو۔ آج تمہاری یہ آرزو بھی پوری کردی جائیگی "۔

"شیطان! کمینے۔!" شہاب نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

ساحر نے خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور کہا۔ "خاموشی سے یہاں کھڑے رہو۔ تمہارا خاتمہ قریب ہے"۔

"میرا خاتمہ کرنے سے پہلے میں تمہاری ہڈیوں کو چبا ڈالونگا۔ شیطان!"

"تم خاموش نہیں رہوگے؟"

"نہیں!"

"اتنی جرأت! تم میری طاقتوں سے واقف نہیں؟"

"واقف ہوں اور انہیں مٹا دینے کے لئے آیا ہوں۔ بے رحم، سفاک، شیطان!"

اسکی سزا یہ ہے۔ کہ تمہارے جسم میں ایک غیر روح داخل کی جائے گی۔ اور تمہاری روح ہمیشہ کیلئے فضا میں غم سے جلتی رہے گی۔ ساحر نے گرج کر کہا۔ اور ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اور جب آیا۔ تو اُس کے ہاتھوں میں مضبوط رسے اور سلاخیں تھیں۔ ان آدمیوں نے شہاب کو کرسی پر بٹھا کر رسی سے اس طرح جکڑ دیا۔ کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور مجھے انہوں نے کمرے کے ایک گوشے میں، ایک موٹے سے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ ساحر نے مجھے دیکھتے ہوئے سلاخیں میرے قریب ہی رکھی ہوئی انگیٹھی میں ڈالدیں۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم نے کئی دفعہ میرے کاموں میں مداخلت کی۔ اور میری سزا سے بچتے رہے۔ آج کوئی طاقت بھی تمہیں میرے ہاتھ سے نہیں بچا سکے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد تم ہمیشہ کے لئے اندھے ہوگے!"

اس کے بعد ساحر نے خلا کے قریب ایک چھوٹی سی میز رکھدی۔ اس کے اُوپر دو شیشے کے ظروف رکھے ہوئے تھے پجاری ان تمام کاروائی کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ بعد ازیں ساحر کے حکم سے اُسکے تمام خادم باہر نکل گئے۔ ساحر نے دروازہ بند کر دیا۔ اور کنڈی لگادی۔

میرے قریب سلاخیں آگ میں تپ رہی تھیں۔ اپنی مہیب ترین سزا کا تصور کر کے میں اپنی حرکت پر پچھتانے لگا پجاری بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسکی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یکایک ساحر نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے بازو اُوپر اٹھائے۔ شعلہ طراز خونخوار نظروں سے شہاب کو دیکھا۔ پھر اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھدیئے۔ میں نے دیکھا۔ کہ شہاب کے چہرے پر مُردنی چھا رہی ہے۔ ساحر

نے ایک ظرف اٹھایا۔ اور اُس کا ڈھکنا اٹھا کر شہاب کے قریب لے آیا ـــــ پھر ڈھکنا اس پر رکھکر ظرف کو میز پر رکھدیا۔

میری متحیر نظروں نے دیکھا۔ کہ ظرف کے اندر مختصر سا دھواں تیر رہا ہے۔ اور شہاب بالکل بے حس و حرکت، بے جان مُردہ کرسی پر پڑا ہے۔ یہی کاروائی اُس نے پجاری کے ساتھ بھی کی۔

میز کے اوپر دو ظروف پڑے تھے۔ جن میں دو انسانوں کی روحیں مقید تھیں۔

'ساحر' کی پیشانی پر پسینہ آگیا تھا۔ آنکھیں زیادہ خوفناک ہو گئی تھیں۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کا ہاتھ ایک ظرف کی طرف بڑھا۔ ظرف اُٹھا کر وہ شہاب کے جسم کے قریب لایا۔ اس کا ڈھکنا اُٹھا دیا۔ اور پھر ـــــ!

شہاب کے چہرے پر ذرا سی سرخی دوڑی 'ساحر' کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ اور وہ جلدی جلدی شہاب کا رسہ کھولنے لگا۔ رسے سے جکڑے ہوئے انسان کے چہرے سے مُردنی جا چکی تھی۔

"تو میں نے تمہاری آخری آرزو بھی پوری کر دی ـــــ ساحو کا حُسن و شباب تو تو" یہ کہتے ہوئے اُس نے شہاب کو بالکل آزاد کر دیا۔ شہاب کے بازوؤں میں حرکت ہوتی۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔

چند لمحوں کے بعد اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اور وہ ایک دم ساحر پر جھپٹا۔

"شیطان، ذلیل!" ساحر پیچھے ہٹنے لگا۔ مگر شہاب کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ چکے تھے۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ 'ساحر' اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ شہاب کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی۔ مگر پھر اُس نے گردن دبوچ لی ـــــ گتھم گتھا حالت میں وہ میرے قریب آ گئے۔ 'ساحر' کی پتلیاں نکلنے لگیں۔ شہاب کی ٹانگ انگیٹھی میں چلی گئی۔ تمام آگ بکھر گئی۔ اور اُس کے کپڑوں کو بھی لگ گئی۔ مگر اُس نے ساحر کی گردن نہ چھوڑی۔ ساحر نے آخری بار زور لگایا۔ مگر بےسود۔ شہاب کی انگلیاں اُس کی گردن میں دھنس گئی تھیں۔ ساحر کی تمام جدوجہد ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا ـــــ شہاب پیچھے ہٹا۔ اور خلا میں گر پڑا۔ زور سے دھم کی آواز پیدا ہوئی ـــــ!

بوڑھا ساحر، مُردہ میرے سامنے پڑا تھا۔

میں اپنی جان بچانے کے لئے سوچنے لگا۔ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا۔ لکڑی کا ایک جلتا ہوا ٹکڑا میرے پاؤں کے پاس آ پڑا تھا۔ میں نے نہایت مشکل کے ساتھ اسے پاؤں کی انگلیوں میں دبا کر کھڑا کیا۔ اُس کا جلتا ہوا سرا رسے تک پہنچ گیا۔ رسہ جلنے لگا۔

دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ اور ساتھ ہی آواز آئی "دروازہ کھولو ——!" میں نے آواز پہچان لی۔ یہ آواز اُسی پُر اسرار عورت کی تھی۔ جو چند دن پیشتر دیوی ساموؔ کی بے جان مورتی تھی!

آخر کار میں آمادہ ہو گیا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ ساموؔ اندر آگئی۔ یکایک اُس کی نظر مُردہ پجاری پر پڑی۔ وہ تیزی کے ساتھ وہاں پہنچی۔ اور اس پر جُھک گئی۔

"میرے محبوب!" ساموؔ نے شیریں آواز میں کہا۔

مُردہ کیا بول سکتا تھا۔ یکایک میں نے دیکھا۔ کہ ایک طرف سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔

"میرے محبوب!" ساموؔ نے دوبارہ کہا۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟"

مُردہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"اُف! تمہارا جسم سرد۔ بے حس و حرکت۔ مُردہ، آہ یہ کیا ہو گیا؟"

"اس کی جان نکل چکی ہے۔" میں نے نزدیک آ کر کہا۔ اس نے آنسو بھری آنکھیں میری طرف اُٹھائیں۔ اور خاموشی کے ساتھ پجاری کا سر اپنے زانو پر رکھ دیا۔ اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اُس کے دلآویز رخساروں پر بہتے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کا غمناک منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔

"میرے محبوب! تم مُردہ —— بے جان!"

ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دُھوئیں کے بادل کمرے کی فضا میں منڈلا رہے تھے۔

"ساموؔ!" میں نے گھبرا کر کہا۔ "اُٹھو مکان میں آگ لگ گئی ہے۔"

وہ بغیر میری طرف دیکھے، سسکیاں بھر کر روتی رہی۔ "میرے محبوب!" بار بار اُس کے لبوں سے نکلتا تھا —— "ساموؔ کیا کر رہی ہو۔ مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ اُٹھو!" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں اپنے محبوب کے ساتھ مروں گی۔"

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتی۔ یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اُٹھو ساموؔ!"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ تم جاؤ۔ میرا محبوب مر چکا ہے۔ اُس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی —— تم جاؤ۔"

یہ سن کر میں نے آخری بار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اُس نے اب کے بھی میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کے سنہری بالوں

میں آگ لگ چکی تھی۔ مگر اُس کا پیارا حسین و جمیل چہرہ مُردہ پجاری کے چہرے پر جُھکا ہوا تھا۔ مایوس ہو کر میں دروازے میں سے نکلا۔ آگ یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ کھڑکی کے پاس پہنچکر میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ نیچے پہنچکر مجھے معلوم ہوا۔ کہ پُجاری کی رُوح ظرف میں بند تھی۔ مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا؛ پانی سر سے گذر چکا تھا۔

آگ کے خوفناک و آتشیں شعلے لرزہ خیز آواز پیدا کرتے ہوئے مکان کو بڑی تیزی کے ساتھ نگل رہے تھے۔ اور میں ایک ٹیلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا؛

آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ دھوئیں کے سائے اِس طرح زمین پر نظر آ رہے تھے۔ گویا بھوت مَوت کی وادی میں وحشیانہ رقص کر رہے ہیں؛

میں سوچنے لگا۔ کہ اگر "ساحر" غلطی نہ کرتا۔ اور شہاب کے پیکر میں پجاری ہی کی روح داخل کر دیتا تو پھر — ہ میں دنیا کی سب سے بڑی نعمت "بصارت" سے محروم ہو کر موت کے آہنی پنجے میں گرفتار ہو جاتا۔ کچھ دیر کے بعد مکان کی بجائے، راکھ، اور اینٹوں کے تودے، جلے ہوئے ستون، اور کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ آہ! سب کچھ جل چکا تھا۔

صحرانورد کا پانچواں خط

چاہِ بابل

ہاروت و ماروت کی داستان!

مکرم دوست!

مکمل پانچ ماہ کی خاموشی کے بعد ایک "تازہ رومان" بھیجکر اپنی زندگی کا ثبوت دے رہا ہوں۔ اس مدت میں مجھے کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا؟ کیسے کیسے حوصلہ فرسا واقعات سے میری ہمت کو دوچار ہونا پڑا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے، ایک طویل قصہ ہے۔ جسے تمام و کمال بیان کرنا ناممکن بھی ہے۔ اور نامناسب بھی۔ مختصر یہ کہ اس وقت، جبکہ کافی تگ و دو، جدوجہد اور امید و بیم کے بعد میرے دل و دماغ کو سکون میسر ہوا ہے۔ میں اپنے ذہن میں بے شمار "تازہ رومان" موجود پاتا ہوں۔ "تازہ رومان" جو صحرا کی وسعتوں میں میری آنکھوں کے سامنے پیش آئے۔ اور جن میں ایک خاص دلچسپی کے ساتھ میں نے بھی حصہ لیا۔ یہ رنگین و دل آویز "رومان" سننے کیلئے تم بے تاب ہو گے؛ مگر دوست! میں سب کچھ ایک ہی دفعہ کیونکر بھیج سکتا ہوں۔ اور شاید تم خود بھی اسے مناسب نہ سمجھو۔ تمام افسانے یکے بعد دیگرے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ جس دلچسپی کے ساتھ میں اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ کیا اس سے وعدہ شکنی کا احتمال ہو سکتا ہے؟

میرے عزیز، دور افتادہ دوست! میرے لئے صحرا کے ذرے ذرے میں ایک تحیر زا دنیا آباد ہے۔ پہاڑ مجھے فطرت کی عظمت و جبروت کا ہیبت ناک راگ سناتے ہیں صحرا کی وسعتیں قدرت کی ہیبت و لامحدود قوتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ ریت کے طوفان بحر و بر پر حکومت کرنے والی ہستی کی عظمت و جلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر طرف چھا جاتے ہیں۔ صبح کے وقت سورج کی اولیں معصوم شعاعیں، ریگ کے تودوں کی جبیں پر ناچ ناچ کر ایک لطیف نغمہ میری روح کو سناتی ہیں۔ اور بہنگام شام اونچے اونچے، سوکھے سوکھے درخت سسکیاں بھر بھر کر، کائنات کی دکھ بھری کہانی سناتے ہوئے تاریکی میں غائب ہو جاتے ہیں۔ میرے پیارے دوست! میں کیسی عجیب و غریب دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔ میری زندگی کیسے کیسے ہوشربا و تحیر زا واقعات سے گزر رہی ہے؟ تم تصور میں بھی ان

کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ صحرا کی دنیا کے اسرار و رموز "صحرا نورد" ہی کا دل جانے!

جیسا کہ میں گزشتہ خطوط میں بتا چکا ہوں۔ صحرائی زندگی مسرتوں اور مصیبتوں کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اس میں مسرتیں ہیں تو بے شمار اور مصیبتیں ہیں تو بے پایاں۔ اور میں انہی بے شمار مسرتوں اور بے پایاں مصیبتوں میں زندگی گزار رہا ہوں۔

گزشتہ مہینے میں جہاں میں نے کئی خطرات کا سامنا کیا۔ وہاں ایک خاص تکلیف بھی اٹھانی پڑی۔ خطرات کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ صحرا میں رہ کر زندگی کو محفوظ سمجھنا ایک خوفناک غلط فہمی ہے۔ اور ویسے بھی مستقبل قریب میں میرے بھیجے ہوئے "رومان" پڑھکر تم ایک حد تک اُن کا اندازہ لگا سکو گے! اب رہ گیا ایک خاص تکلیف کا ذکر، تو سُنو! تم جانتے ہو۔ میرا پیارا ہمسفر آغا بہرام ایک بوڑھا آدمی ہے۔ نوجوانانہ ہمت کے باوجود اُس کے قوا، کمزور و مضمحل ہیں۔ جو صحرائی زندگی کی مصیبتوں کا بخوبی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اُس کے آرام کی خاطر بعض اوقات مَیں کئی کئی دن ایک ہی جگہ قیام رکھتا ہوں۔ مگر میری "ادنےٰ سی احتیاط" ان مصیبتوں کو کیونکر روک سکتی ہے؟ اس معمولی سی کوشش سے میرا بوڑھا ہمسفر لاتعداد تکلیفوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ پچھلے دنوں تھکاوٹ کے باعث وہ بخار میں مبتلا ہوگیا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ پاؤں کا زخم جو قریباً مندمل ہوچکا تھا۔ بدقسمتی سے خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ مجھے اپنے ساتھی سے بے حد محبت ہے۔ اس کی شیریں کلامی میرے لئے اپنے اندر خاص دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ اور اس کی جواں ہمتی، استقامت طبع اور مستقل مزاجی ہر لحاظ سے قابل تعریف و احترام! اس لئے اُسے تکلیف میں مبتلا دیکھکر میرے دل کو بہت تکلیف ہونے لگی۔ وہ ہر وقت خیمے میں لیٹا رہتا تھا۔ اور میں اس کی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف۔ یہاں معالج اور دوائیں کہاں؟ اس دُنیا میں بوٹیوں کا استعمال ہی غنیمت ہے۔ میں نے بھی اُس کے زخم کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ قدرت نے میری حقیر مساعی کو نوازا اور وہ روبصحت ہونے لگا۔ آغا بہرام اگرچہ بوڑھا اور کمزور ہے۔ مگر میرے دوست! سچ کہتا ہوں۔ انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی میں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی۔ ایک دفعہ تو اس کی حالت اتنی خطرناک ہوگئی۔ کہ میں اُس کی زندگی سے مایوس ہوگیا۔ اس نے میری مایوسانہ حالت کو دیکھا۔ اور مجھے تسلی و تشفی دی۔ اسوقت مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کہ یہ بوڑھا انسان جو قبر کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ کیونکر اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھ سکا ہے۔ بہرحال اب اُسے صحت حاصل ہوگئی ہے۔ ایسے حوصلہ مند شریک سفر پر کسے فخر نہ ہوگا؟

مندرجہ بالا سطور میں تو مَیں نے اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیا۔ اب "تازہ رومان" کے متعلق کچھ سُنو۔ یہ تو تم سمجھ گئے ہوگے۔ کہ

یہ ان تین داستانوں میں سے آخری داستان ہے۔ جو بوڑھے کے توسط سے ہمیں حاصل ہوئیں۔ وادیٔ نیل کی خوں آشام ساحرہ کا رومانِ محبت تو تم سن چکے۔ اب وادیٔ فرات کی ایک حسین قاتلہ کی داستانِ عشق بھی سن لو ——— !! "بابل" کے متعلق تم نے تواریخ میں بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ اور شاید میری طرح یہ پُراسرار نام لیتے ہوئے تم بھی اپنے دل میں ایک عجیب کیفیت محسوس کرتے ہوگے؟؟

میں جب اس کا خیال کرتا ہوں۔ تو میرے تصوّر کی نگاہوں کے سامنے ماضی کے بحرِ بے پایاں کی سطح پر ایک ایسا شہر نمودار ہو جاتا ہے۔ جس کے اونچے اونچے ہیبت ناک مینار، پُراسرار باغ اور شاندار معبد ہزاروں سال پیشتر کی انسانی زندگی کے حالات سناتے ہیں۔ "بابل" ——— انسانیت کا اوّلین گہوارہ، جہانِ دنیائے قدیم کا قاہرِ اعظم "سکندر" سو رہا ہے۔ جہاں وریلئے فرات کے کنارے یہودی ولی عذرا ابدی خواب میں محو ہے۔ جہاں نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اور پھر انتہائی ذلّت کے عالم میں موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ جہاں اپنی محبوبہ "اشارت" کے لئے ایک قاہر بادشاہ "بخت نصر اعظم" نے معلق باغات لگوائے۔ "بابل" ——— جہاں عیاش بادشاہ "بیلشضر" کے شاہانہ غرور نے شاندار مگر آخری بزمِ عشرت میں "مقدّس پیالوں" کی توہین کی۔ "بابل" ——— جہاں عیش پرست بادشاہ "ہیروڈ" نے اپنی سوتیلی بیٹی "سلومی" کے سحر زا حُسن پر عاشق ہو کر فطرت کے انتقام کو جھنجھوڑا۔ "بابل" ——— سحر و جادو کی سرزمین، حسن و جمال کی وادی، عشق و محبت کا شہر ——— "بابل" ——— دُنیا کے ایک گوشے میں کھنڈروں کی صورت میں عظمتِ پیشیں پر ماتم کرتا ہوا، بدنصیب بابل ——— !! آہ میرے دوست! اسوقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہے!

زمانہ ابتدائے آفرینش سے، ہاتھوں میں زلزلے، سیلاب اور آگ کے آتشیں شعلے لئے، شاندار شہروں کو اپنی ایک ہی ٹھوکر سے تباہ کرتا ہوا، متمدن ملکوں کو حقیر سے حقیر جملے میں کھنڈر بناتا ہوا، آبادیوں کو صحرا اور جنگلوں کو بحری خطّوں میں تبدیل کرتا ہوا ناقابلِ تصوّر عجلت کے ساتھ بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں، کہ بابل و نینوا کی طرح موجودہ متمدن و مہذب شہر برباد ہو جائیں۔ یہ ہولناک صحرا جس کے ایک گوشے میں تمہارا صحرا نورد دوست تمہیں خط لکھ رہا ہے۔ آبادی میں تبدیل ہو جائے۔ اور تمہارا حسین و جمیل شہر ایک ہولناک صحرا؟؟؟ دنیا میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ اور ایسا ہوتا رہے گا۔

خیر میرے دوست! آج تمہیں اس طلسم و جادو کی سرزمین (جسے بابل کہتے ہیں) کی ایک خون آشام حسینہ کی دردناک دل آویز داستانِ محبت سناتا ہوں۔ پہلی داستانوں کی طرح کہنے والے نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک داستان ہے کسی کی زبانی سُنی ہوئی۔ اور کسی کے قلم سے لکھی ہوئی۔ بوڑھے نے اسے کہاں سے حاصل کیا۔ اور کیونکر کیا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ بوڑھا اب بھی میرے پہلو میں بیٹھا ہوا اُسے پڑھ رہا ہے ——— اچھا اب رخصت!

تمہارا اپنا "صحرا نورد"

(۱)

سرزمین "بابل" کے ذرے ذرے پر مسرورانہ کیفیت چھائی ہوئی تھی ـــــ ہر شخص کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ تھا۔ ہر جگہ نہایت فراخدلی کے ساتھ دادِ عیش دی جا رہی تھی۔ دریا کی سطح پر بہتی ہوئی کشتیوں کی مانند، فضا میں منڈلاتے ہوئے، رنگ برنگ کے بادل گرج گرج کر زمین والوں کو عیش پرستی کی صلائے عام دے رہے تھے۔ اور زمین والے اُن کا پیغام سُن سُن کر اس طرح مشغولِ لہو و لعب تھے۔ گویا ان کی زندگی سے زندگی کے تمام فرائض کی پابندی ہٹا دی گئی ہے۔

بات دراصل یہ تھی۔ کہ چند سال پیشتر اہلِ بابل نے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات پائی تھی۔ اور اُس دن اسی کی مسرور یاد میں ہر جگہ بزمِ عشرت قائم تھی۔ یہ مصیبت کیا تھی ـــــ؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ عرصہ ہوا لگاتار بارش اور دریائے فرات کی ہولناک طغیانی نے مل کر شہر کے بیشتر حصے کو پانی میں غرق کر دیا۔ دیوتاؤں کے آگے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کے باوجود بارش کے زور میں ذرہ بھر کمی واقع نہ ہوئی۔ ماہرینِ سحریات کی مسلسل ساحرانہ کوششوں کے باوصف طغیانی میں کوئی فرق نہ پیدا ہو سکا۔ اس عالمِ سراسیمگی میں لوگوں سے جو کچھ بن پڑا کیا مگر انہیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ کہ عنقریب وہ موت کے ظالم پنجے میں ہونگے۔ بلند، عالیشان عمارتیں منہدم ہو رہی تھیں۔ اور اُن کے مالک ہرنوں کی طرح جو شکاری کو دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لئے انتہائی تیزی کے ساتھ بھاگتے ہیں، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ یکایک "رب الشمس" کے مندر "عیبیر" کی ایک معمولی سی کاہنہ "مغی" نے اعلان کیا۔ کہ وہ لوگوں کو اس مصیبتِ عظمےٰ سے بچا سکتی ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا لوگ اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ ایک بلند مینار پر چڑھ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی پانی کے زور میں کمی ہونے لگی۔ اس کے بعد لوگوں کی مسرور و حیرت زدہ نظریں دیکھ رہی تھیں۔ کہ بارش تھم گئی ہے۔ اور سیلاب رُک گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ "بابل" کی اس مصیبت کو دُور کرنے والی "کاہنہ" ہی تھی۔ اس لئے جب وہ مینار سے نیچے اُتری۔ تو لوگ اُس کی بیحد عزت کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ اُن کے عقیدتمندانہ جذبات میں ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ موت کے بعد اُسے "ربہ مغی" اور "مادرِ بابل" کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔

چونکہ اُس دن اہلِ بابل نے موت کے خوفناک چنگل سے رہائی حاصل کی تھی۔ اس لئے اس خوشی داد عیش دے رہے تھے۔ غریبوں نے غریبانہ طور پر بزمِ عشرت قائم کر رکھی تھی۔ اور طبقہ اُمراء نے وسیع پیمانے پر۔ "بابل" کے دولتمند تاجر "عماموس" نے اپنے احباب و رفقاء کو مدعو کیا ہوا تھا۔ اس کے وسیع اور شاندار مکان سے ملحق ایک بہت بڑے میدان میں عیش پرستی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ بے شمار غلام شرابِ ناب سے بھرے ہوئے مٹکے اٹھائے لوگوں میں گھوم رہے تھے۔ جہاں ذرہ بھر کمی

کا اشارہ ہوا۔ ایک غلام ٹھہر گیا۔ اور شراب سے بھرا ہوا جام اشارہ کرنے والے کے سامنے پیش ہوا۔ پینے والے نے آدھا پیا۔ اور آدھا کپڑوں پر گرا کر، خالی جام کو بے پروایانہ پرے پھینک دیا۔ غلاموں کے ساتھ ساتھ حسین و جمیل خادمائیں سنہری طشتوں میں طرح طرح کے لذیذ و خوشنما پھل لئے، دلربایانہ ادا کے ساتھ عیش پرستوں کو دیکھتی، شیریں آوازمیں "ربعیٰ" کی تعریف کے دلنواز گیت گاتی، ہوا میں لہراتے ہوئے رنگین پھریروں کی مانند پھر رہی تھیں۔ فضا میں قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اور ہر طرف شور و نوشا نوش برپا تھا!

ایک طرف سنگِ مرمر کی سیڑھیوں کے اوپر، سنگِ احمر کی نشستگاہ پر کاہن اور پجاری بیٹھے تھے۔ ان کی عیش پرستی کا انداز ہی نرالا تھا۔ تر و تازہ پھل اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی شراب سے لبریز ظروفِ زریں ان کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ 'ربعیٰ' کی تعریف کے گیت گا رہے تھے۔ ان کے درمیان 'ربعیٰ' کا حسین و جمیل مجسمہ ایستادہ تھا۔ جسے وہ بار بار عقیدتمندانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے بعض شراب اور پھل دونوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور دو تین عیش پرست انسانوں کی احمقانہ حرکات کی طرف اشارہ کر کر کے مسکرا رہے تھے۔ سارا دن کھیل تماشے ہوتے رہے۔ شہر کی مشہور و معروف رقاصاؤں نے استادانہ رقص کئے۔ مغنیوں نے طرح طرح کے گیت گائے۔ الغرض ہر قسم کی رنگ رلیاں ہوتی رہیں۔ دن کے اختتام پر سب سے بڑھ کر شاندار پروگرام ہونے والا تھا۔ اور لوگ اسی پروگرام کا بے تابانہ انتظار کر رہے تھے یکایک مجمع پر ایک تازہ مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی نگاہیں میدان کے جنوبی حصے میں، ایک بلند چبوترے کی جانب اٹھیں۔ چبوترے پر 'ربعیٰ' کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ اور اس کے قریب ایک اور رنگین مجسمہ۔ فضا میں مسرت کے نعرے گونجنے لگے کاہن اپنے شغل میں مصروف تھے۔ اگرچہ ان میں سے چند ایک کن انکھیوں سے اس طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ رنگین مجسمے کو حرکت ہوئی اور چند لمحوں کے بعد مجمع کے سامنے بابل کی سب سے بڑی رقاصہ حسین و جمیل سمیرا رقص کرنے لگی۔ ساحرانہ انداز میں ناچتی ہوئی وہ یوں نظر آتی تھی۔ گویا چاند کی آغوش میں بادۂ احمریں کی ایک موج پرکیف اچھل رہی ہے۔ یا طلسماتی فضا میں ایک زندہ نغمہ تیر رہا ہے۔

رقاصہ سمیرا بابل کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عورت سب سے بڑھ کر مشاق رقاصہ تھی۔ وہ دین پر رقص کرتی تھی اور اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں رقصاں ——! اس وقت بھی وہ رقص کر رہی تھی۔ اور اس کے پاؤں کی ہر ایک جنبش کے ساتھ دلوں کی دھڑکن تیز تر ہو رہی تھی۔ رقص ختم ہو گیا۔ رقاصہ نگاہوں کے ہجوم میں ایک شاندار جگہ پر جا بیٹھ گئی۔ میزبان نے اعلان کیا۔ کہ رقاصہ مجمع میں سے

ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے شراب کا جام دیگی۔ یہ مژدہ دلنواز سنتے ہی مجمع کی رگوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ رقاصہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور لوگوں کو دیکھنے لگی۔ دلوں کی عقیدتوں کا ہجوم آنکھوں میں مچلنے لگا۔ مگر کاہنوں کے چہروں پر غصے کے آثار نمودار تھے۔ رقاصہ ہیرا جو لاکھوں دلوں پر حکمران تھی۔ اُن کے نزدیک ایک فاحشہ عورت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے گھور کر میزبان کی طرف دیکھا۔ اور میزبان نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

خادمائیں شراب سے بھرے ہوئے ظروف اور جام اٹھا کر اس کے ساتھ چلنے لگیں۔ جس طرف جام جاتا تھا پیاسی نظریں اٹھ کر رقاصہ کے چہرے پر گڑ جاتی تھیں۔

اب کاہن باقی رہ گئے تھے۔ رقاصہ مغرورانہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کاہنوں کے چہروں پر غصہ و کراہت کے آثار پیدا ہوئے اور ان میں سے ایک بوڑھے کاہن نے جس کا نام امرائیل تھا۔ اور جو رب الشمس کا کاہن تھا۔ حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

رقاصہ نے یہ توہین انگیز منظر دیکھا۔ تو سب سے پہلے اُس کی طرف بڑھی —— اور جام اُس کی طرف بڑھایا۔

"میں ایک ذلیل فاحشہ عورت کے ہاتھوں سے جام پیوں"! یہ کہتے ہوئے کاہن نے جام پرے پھینک دیا۔ رقاصہ کا چہرہ فرطِ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کے دل میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا۔ کہ کوئی شخص اُسکے ساتھ ایسا ذلّت انگیز سلوک کر سکتا ہے۔ تمام مجمع مبہوت و ششدر اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

"اِتنی جُرأت بوڑھے گدھے"! رقاصہ نے خشمناک نظروں سے بوڑھے کاہن کو دیکھتے ہوئے کہا!

"رب الشمس کی تم پر لعنت ——" کاہن نے کرخت آواز میں کہا۔

رقاصہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "بوڑھے کتّے"! اُس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور بوڑھے کے سفید بالوں کو پکڑ لیا۔ بوڑھا اُٹھنے لگا۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ کھڑا ہو۔ یا بال چھڑائے رقاصہ نے اُسے زور سے دھکا دیا۔ اور کمزور، بوڑھا جسم لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے گرنے لگا۔

کاہن بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ انہیں کبھی یقین بھی نہیں آ سکتا تھا۔ کہ اُن کے معزز ساتھی کے ساتھ ایسا سلوک بھی ہو سکتا ہے!

(۲)

تمام مجمع پر ایک ناقابلِ بیان سنسنی چھا گئی۔ حیرت میں ڈوبی ہوئی نظریں تھیں جو نعش پر گڑی تھیں۔ تاسف میں غرق نگاہیں

تھیں۔ جو آنیوالی مصیبت عظمیٰ کا اعلان کر رہی تھیں عیش وعشرت کے دلوں کے کسی عنقریب آنیوالی مصیبت کے تصور کے سائے میں دم توڑ رہے تھے۔ لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا۔ کہ نحش کے پھٹے پھٹے خوفناک دیدوں میں سے ایک عظیم مصیبت، ایک بہت بڑی تباہی جھانک رہی ہے۔ مرحوم کاہن کی بوڑھی بیوی شمرطی غم انداز نظروں سے اپنے بے جان خاوند کو دیکھ رہی تھی۔ رقاصہ نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور خاموشی کے ساتھ ایک طرف چلنے لگی۔ کاہنوں نے لاش کو اٹھایا۔ اور میزبان کے گھر کی طرف لے چلے مجمع میں سے کئی لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور باقی اس خوفناک واقعے پر اظہار خیالات کرنے لگے۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ اہل بابل پر کوئی مصیبت آنیوالی ہے۔ بزم عشرت میں ایک کاہن کی ہلاکت اور وہ بھی ایسی ذلت کے ساتھ یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ تھا بعض افراد کے دلوں میں رقاصہ کے خلاف غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اور یہ وہ تھے۔ جنہیں اس سلوہ جمیل نے کبھی قابل التفات نہیں سمجھا تھا۔ مگر بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اس واقعے کو اتفاقی امر کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ کاہن نے رقاصہ کی سخت توہین کی تھی۔ جس کے جواب میں اس نے بھی کاہن کی بےعزتی کی۔ رقاصہ کا ارادہ اُسے ہلاک کرنے کا نہیں تھا —— وہ ایک مغرورانہ سلوک کا جواب مغرورانہ انداز میں دینا چاہتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بزم عشرت میں کاہن ہلاک ہو گیا تھا؟

ہاروت بابل کا ایک حسین وجمیل نوجوان، میدان کے ایک گوشے میں اپنے ساتھی سے اِس حادثے کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ اس کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

"ایک دفعہ جب بزم عیش میں کاہن کو ہلاک کیا گیا تھا۔ تو ایک زلزلہ آیا تھا۔ اب دیکھئے غریب لوگوں پر کیا مصیبت ٹوٹتی ہے"

ہاروت نے اپنے ساتھی کو عجیب انداز سے دیکھا۔ اور خاموش رہا۔

"رقاصہ کی تکا بوٹی کر دینی چاہیئے" اس کے ساتھی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

"اُس کا کیا قصور؟" ہاروت نے پوچھا!

"قصور؛ اُس نے معبد بت الشمس کے کاہن کو انتہائی بےعزتی کے ساتھ ہلاک کیا ہے"!

"مگر رقاصہ کا ارادہ اُسے ہلاک کرنے کا نہیں تھا۔ اور یہ بھی دیکھو۔ کاہن نے اُس کی کتنی بےعزتی کی"!

اُس کے ساتھی نے معنی خیز نظروں سے ہاروت کو دیکھا۔ اور کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں جس جذبے کے زیر اثر تم یہ

کہہ رہے ہو۔ مگر یاد رکھو۔ رقاصہ کی صرف حمایت کرنے سے تم اُس کی التفات حاصل نہیں کر سکتے۔ اُس کے دل میں گھر کرنے کے لئے تمام بابل کے ــــ بلکہ تمام دنیا کے مال وزر کی ضرورت ہے۔"

ہاروت کے چہرے پر مایوسانہ اثرات چھا گئے۔ وہ اپنے قریب رکھے ہوئے پودے کو دیکھنے لگا۔ گذشتہ واقعات اسے یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے۔ وہ کئی بار سمیرا کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ مگر رقاصہ نے کبھی بھی اس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ اُمراء جواہرات کی چمکتی ہوئی زبان سے اظہارِ محبت کرتے تھے۔ اور بسا اوقات ساحرہ بابل کی توجہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے تھے۔ مگر ہاروت ــــ ایک غریب نوجوان کبھی اتنا خوش قسمت نہ ہو سکا۔ اس کے دل کی پیاس کبھی بھی نہ بجھی کہ عُمر کا ساتھی چلا گیا۔ مگر وہ اپنے خیالات میں غرق وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد میدان کے دوسرے گوشے کی طرف چلنے لگا۔ لوگ برابر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی آنے والی مصیبت کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اور کوئی رقاصہ کے حسن وجمال کی تعریف میں مشغول

ہاروت سیڑھیوں کے اُوپر چڑھ گیا۔ اور اُس جگہ کھڑا ہو گیا۔ جہاں رقاصہ نے بوڑھے کاہن کو دھکا دیا تھا۔ کاہن کی موت کا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔

رقاصہ مسرورانہ انداز میں بوڑھے کو دیکھتی ہوئی کس قدر خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔

یکایک ایک چہرے نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بوڑھا کاہن مثل اس کے قریب آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ہاروت نے سیڑھیوں سے نیچے اترنے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ معلوم کونسی قوت تھی، کونسا جذبہ تھا جو اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اُس کے قدم آگے اُٹھنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے سیڑھیاں کافی فاصلے پر تھیں۔

چاندنی میں سائیں سائیں کرتے ہوئے اُونچے اُونچے درخت یوں دکھائی دیتے تھے۔ گویا ارواحِ خبیثہ قطار اندر قطار کھڑی موت کا راگ الاپ رہی ہیں۔

"ہاروت!" یکایک اس کے قریب ایک شیریں آواز آئی۔ اس نے دائیں جانب دیکھا۔ رقاصہ ایک درخت کے پاس کھڑی تھی۔

"ہاروت!" رقاصہ نے دوبارہ آواز دی۔ وہ مبہوت و ششدر اس کے قریب پہنچا۔

"کاہن مر گیا تھا؟" رقاصہ نے پوچھا۔ اُس کی آنکھوں میں حقارت انگیز تبسم موجزن تھا۔

"ہاں ـــــ اُس کا سر پھٹ گیا تھا"!

"اوہ ـــــ مگر میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتی۔ وہ میری توہین کرنیوالا کون تھا؟ بوڑھا گدھا"!

"اُس کی موت اتفاقی امر ہے"!

"اتفاقی امر ـــــ؟ کیا تم ان پاگلوں کی طرح مجھے قصور وار نہیں گردان رہے؟؟ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ یہ احمق لوگ کچھ بھی نہیں جانتے"!

ہاروت اُس کے دِل آویز چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا!

"کاہن نے سخت غلطی کی تھی"! ہاروت نے زوردار لہجے میں کہا!

"تم بہت اچھے ہو ہاروت! شاید میں نے پہلے بھی تمہیں کئی بار دیکھا ہے؟

"مگر توجہ کبھی نہیں کی ـــــ شاید میں توجہ کے قابل ہی نہیں تھا"!

رقاصہ خاموش رہی۔ اور کاہن کے ان سفید بالوں کو جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ درخت کی ایک پتلی سی شاخ کے گرد لپیٹنے لگی۔

"آؤ ذرا وہاں چل کر بیٹھیں"۔ رقاصہ نے کہا۔ اور دونوں کچھ دُور ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہاروت کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔

"اگر میرے اختیار میں ہو۔ تو ان ذلیل بوڑھے کاہنوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں ـــــ پاگل انسان"! رقاصہ نے کہا۔

"مگر دیوتاؤں کا قہر و غضب؟"

"دیوتاؤں کا قہر و غضب ـــــ؟ میں دیوتاؤں سے سخت بیزار ہوں"۔

ہاروت حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"مگر چھوڑو اس قصے کو! میں تمہیں ایک گیت سناتی ہوں"! چند لمحے بعد رقاصہ کی دلنواز آواز فضا میں گونجنے لگی۔ اسوقت ہاروت کا دل و دماغ نشے کی لہروں میں ڈوبا ہوا تھا ـــــ اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ درخت کے قریب جہاں ہاروت نے رقاصہ کو کھڑے دیکھا تھا۔ کاہن شمیل ان کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔

"کاہن ہے؟" رقاصہ کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں ۔۔۔ کاہن شمیل"

"یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"معلوم نہیں!" یہ کہکر ہاروت اٹھا۔ اور دبے پاؤں اُدھر جانے لگا۔ کاہن شاخ پر ہاتھ رکھ کر امرائیل کے لپٹے ہوئے سفید بالوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر مڑکر ہاروت کو دیکھنے لگا۔

"کہاں گئی ہے وُہ رقاصہ؟" شمیل نے کہا۔ اس کی آنکھیں غصّے سے سُرخ تھیں۔ "یہاں اُس نے محترم کاہن کے بال لپیٹ دیئے ہیں۔ اور میری نظریں "چاہِ بابل" کے پاس اس کے بالوں کو ایک شاخ سے لپٹے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔"

ہاروت کانپ گیا۔ "چاہِ بابل" کے پاس درخت کی شاخ سے اس شخص کے بال لپیٹے جاتے تھے۔ جو بابل کا سب سے بڑا مجرم ہوتا تھا۔ اور جسے کنوئیں میں ڈال کر انتہائی ذلّت و مصیبت سے مارا جاتا تھا۔

"فاحشہ عورت!" کاہن نے کہا۔ اور چلنے لگا۔ ہاروت وہیں کھڑا تھا متحیّر و مبہوت ۔۔۔۔۔۔

"چلا گیا ذلیل گدھ!" یہ آواز رقاصہ کی تھی۔ ہاروت نے مڑ کر دیکھا۔ رقاصہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ مگر اب اُسکے چہرے پر خوف و وحشت کے آثار نمایاں تھے۔

"میرے مکان تک میرے ساتھ چلوگے؟" اس نے پُوچھا!

"بسر و چشم!"

یہ کہکر ہاروت نے اُس کا نرم، پیارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور دونوں چپ چاپ چلنے لگے!

(۳)

آبادی سے دُور ایک اجاڑ اور ویران مقام پر ہاروت متفکرانہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب خلش اسکی رُوح پر اور ایک خاص بے چینی اس کے دل پر مسلّط تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ گوشۂ مغرب میں شفق کی سرخی میں نہائے ہُوئے آفتاب کے قریب ایک سیاہ ابر پارہ اس طرح نظر آ رہا تھا۔ گویا کوئی خونخوار گدھ لاش کے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاروت مٹی کے ایک تودے پر دایاں ہاتھ رکھ کر ٹھہر گیا۔ اور مضطربانہ ایک طرف دیکھنے لگا۔ اپنے قریب ہی۔ وحشی

کا ایک مختصر سا مضمحل سا حلقہ دیکھ کر اُس نے تودے سے ہاتھ اٹھایا۔ اور جدھر سے روشنی آ رہی تھی۔ اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد مرحوم کاہن اُمرائیل کی ضعیف بیوی شمرطی ہاتھ میں مشعل لئے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہاروت کی نگاہیں دلی بے چینی کی غمازی کر رہی تھیں۔ اس کے برعکس بوڑھی عورت کی آنکھوں میں ایک خاص جوش موجزن تھا۔

"میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" بوڑھی کاہنہ نے مشعل کو دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم بہت جلد آ گئیں!"

"یہ بھی ہو سکتا ہے!"

اس کے بعد چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر کاہنہ نے متجسسانہ اردگرد دیکھا۔ اور کہنے لگی۔ "ہاروت! میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا ہے۔ اور جانتے ہو میں نے تم پر کتنے احسان کئے ہیں!"

"میں جانتا ہوں۔"

"گزشتہ مصیبت میں جب کہ آدھا شہر تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک معزز آدمی کو مایوس کر کے معبد میں تمہیں پناہ دی تھی۔ یہ میں نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ اب میں چاہتی ہوں۔ کہ تم بھی اپنا فرض ادا کرو!"

"کونسا فرض؟ میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ کہو"

بوڑھی عورت نے گھور کر ہاروت کو دیکھا۔ "تمہیں وہ دن یاد ہے۔ جب "فاحشہ سمیرا" نے بزرگ امرائیل کو نہایت بےعزتی کے ساتھ ہلاک کیا تھا۔ محترم کاہن نے فاحشہ عورت کے جام کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور ایسا کرنا اُس پر واجب تھا۔ تم جانتے ہو۔ رقاصہ کتنی ذلیل عورت ہے۔ اس لئے ربُ الشمس کا کاہن اسے کیونکر عزت بخش سکتا تھا۔" شمرطی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُس کے بوڑھے کمزور ہاتھ فرطِ خفگی سے لرزنے لگے۔ "کاہن کیا کوئی معزز آدمی بھی اُسے منہ لگانا پسند نہیں کریگا۔ مگر اُس دن اس فاحشہ عورت نے انتہائی بےعزتی کے ساتھ محترم کاہن کو ہلاک کر دیا۔ اور لوگ خاموشی سے یہ توہین آمیز منظر دیکھتے رہے۔ گویا وہ چلنے سے معذور زخمی کتے ہیں۔ میرے بیٹے! کیا اس وقت لوگوں کا فرض نہیں تھا۔ کہ رقاصہ کی بوٹیاں نوچ لیتے ــــــ لیکن افسوس سب خاموش رہے۔ ان کتوں نے اسے کوئی سزا نہ دی۔ اور آج رقاصہ بدستور اہلِ بابل کی جوانی اور دولت پر تباہی لا رہی ہے۔"

بوڑھیا کہے جا رہی تھی۔ اور ہاروت اس کے پر غضب چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

"لوگوں نے اُسے عیش کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ مگر میں مرحوم کاہن کی بیوی اُسے زندہ نہیں دیکھ سکتی۔" یہ الفاظ شمرطی نے ہاروت کے شانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہے۔" بہادر بیٹے! تم بھی تعجب کرنے لگے۔ اپنے شوہر کا انتقام لینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ——— بابل کو ایک ذلیل ساحرہ کے وجود سے پاک کرنا کوئی حیرت انگیز بات ہے؟"

"کیوں نہیں!" ہاروت کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"تم بھی دیوانے ہو گئے بیٹے!"

"مَیں دیوانہ نہیں۔ مگر تمہاری باتیں دیوانوں کی سی ہیں ——— رقاصہ کے اقتدار سے بے خبر ہو؟"

"یہ اقتدار سراب صحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ رقاصہ اہل بابل کے لئے دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نہیں؟ کتنے نوجوانوں کو اس نے انتہائی سنگدلی کے ساتھ ہلاک کیا؟ کتنے معزز انسانوں کی توہین کی؟ اور تو اور رب اعظم کا محترم کاہن بھی بے عزتی کے ساتھ اس کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"رقاصہ کاہن کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی تھی ——— یہ مجھے اس نے خود بتایا تھا ——— اور میں جانتا ہوں یہ درست ہے۔"

بوڑھیا نے خشمناک نظروں سے ہاروت کو دیکھا۔ اور خفگی انگیز لہجے میں کہنے لگی۔" اس نے تم کو دھوکا دیا ہے۔ تم اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے جال میں پھنس گئے ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ رقاصہ کے قبضے میں دو خوفناک ہتھیار ہیں۔ ایک اُس کا حُسن اور دوسرا اقتدار۔ اور وہ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ہر انسان پر حملہ کرتی ہے۔ تم پر بھی اُس نے حملہ کیا۔ اور تم نے شکست کھائی ——— یہی بات ہے نا؟"

"تم غضبناک کیوں ہو گئیں معزز ماں؟"

کاہنہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور وہ نرم لہجے میں کہنے لگی۔" مَیں غضب ناک نہیں ہوں۔ مگر تمہاری سادہ لوحی پر غصہ آتا ہے۔ اُس نے تم سے دو تین میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ اور تم اس کے ہو گئے۔ میرے عزیز بیٹے! رقاصہ ہزاروں انسانوں کی قاتلہ ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ مگر انجان بنتے ہو۔ کون بے وقوف اپنے قابل احترام کاہن کے مقابلے میں ایک ذلیل عورت کو ترجیح دے گا؟ اگر تمہارے دل میں میری عزت ہے، رب الشمس کے کاہن کا احترام ہے۔ تو اس فاحشہ عورت کو موت کے

گھاٹ اتارنے میں میری مدد کرو!

"مگر ——!" ہاروت نے متعجبانہ کہا:

"تم ایک بہادر انسان ہو۔ اس لئے ایک بہادر انسان کی طرح ایک کمزور وضعیف عورت کی مدد کرو!"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں بتاتی ہوں۔ رقاصہ نے انتہائی بے عزتی کے ساتھ کاہن کو ہلاک کیا تھا۔ اس لئے اسے بھی سخت بے عزتی کے ساتھ مارنا چاہیئے۔ ایک معمولی سا کام کرنے سے اس کی ذلت انگیز موت کا سامان پیدا ہو سکتا ہے"!

شمرطی خاموش ہو گئی۔ ہاروت کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ قریب ہی آتشیں شعلے بھڑک رہے ہیں جن کی خوفناک آواز متواتر اُس کے کانوں میں آ رہی ہے۔

کاہنہ نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیئے" مادر بابل کی یادگار کے دن اس نے میرے محترم شوہر کو ہلاک کیا تھا۔ اور مادرِ بابل ہی کا غیض وغضب اُسے ذلت کی موت مار سکتا ہے۔ ہمیں صرف اُس کے سینے سے "شارہ" لا کر رقاصہ کے مکان میں رکھ دینا ہے"۔

ہاروت کانپ گیا۔ بوڑھی کاہنہ کتنے خوفناک الفاظ اپنی زبان سے نکال رہی تھی۔ "شارہ" مخمل کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا جس میں نہایت قیمتی موتی اور جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ اور بابل کے معزز ترین آدمی کے مرنے پر اس کے سینے پر رکھا جاتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی۔ کہ رب الشمس نے اس پر انتہائی مہربانی کی ہے۔

"میری تجویز کو سُن لیا تم نے؟"

"اس قدر خوفناک کام!"

"اسی طریقے سے وہ ذلت کی موت مر سکتی ہے"!

"لیکن مربیقی کے سینے سے "شارہ" لانا کتنا بڑا جرم ہے —— بابل میں سب سے بڑا جرم!"

"اسی لئے تو میں کہہ رہی ہوں "شارہ" اٹھا کر ہم رقاصہ کے مکان کے ایک محفوظ گوشے میں رکھ دیں گے۔ اور لوگوں کو خبر کر دینگے۔ کہ مربیقی کا تابوت کھلا ہوا پایا گیا ہے۔ اور کسی طریقے سے کاہنوں کو بھی بتا دیں گے۔ کہ "شارہ" رقاصہ کے مکان میں ہے۔ یقیناً جرم کی مرتکب فاحشہ عورت سمجھی جائے گی۔ اور پھر —— میری آرزو پوری ہو جائیگی!"

"ہاروت پھٹی پھٹی نظروں سے کاہنہ کو دیکھنے لگا۔ کس درجہ خوفناک اور لرزہ خیز تجویز اُس کے ذہن میں آئی تھی؟"

"اگر چوری کرتے ہوئے ہم پکڑے گئے تو؟"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پجاری اور کاہن معبد کے عقب میں سوتے ہیں۔ ایک آدھا پجاری باہر ہوا تو کیا؟ تمہارے بازوؤں میں کافی قوت ہے۔ اور یہ بھی سنو۔ میں آنے سے پیشتر ستاروں کی زبانی آنے والے واقعہ کی اطلاع پا چکی ہوں۔ بابل میں کوئی اہم واقعہ ہونے والا ہے۔ اور اِس کا مطلب رقاصہ کی موت نہیں تو اور کیا ہے؟ تم صرف اپنے ہاتھوں کو حرکت دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں کمزور ضعیف عورت ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت نہیں۔ اور اِس کام کے لیے طاقت کی ضرورت ہے ـــــ کیا سوچ رہے ہو میرے بیٹے! بےکس بوڑھی عورت کو مدد نہیں دو گے؟ چپ کیوں ہو؟"

کاہن شمیل کی پیشین گوئی کے الفاظ ہاروت کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"تم انکار کرتے ہو؟ میرے احسانات کو بھول گئے ـــ محترم کاہن کی عزت تمہارے دل سے جاتی رہی؟"

"نہیں!"

"تو پھر لیت و لعل کا مطلب؟ شاید تم پر رقاصہ کا جادو چل گیا ہے۔ مکار عورت نے بھولے بھالے انسان کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو چلتے کیوں نہیں۔ میرے عزیز بیٹے! رقاصہ کسی کی نہیں بنتی۔ ہزاروں کے ساتھ اُس نے محبت کا اظہار کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں ہلاک کر دیا۔ ان لوگوں کی مثال تمہارے سامنے موجود نہیں؟"

"مگر یہ تو سوچو، کتنا خوفناک جرم؟"

"اِس خوفناک جرم کی مرتکب وہ ہوگی۔"

"لیکن دیوتاؤں کا غضب ہم پر بھی نازل ہوگا۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ ہم ایک قابلِ احترام انسان کا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہم لوگوں پر یہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ ربّ الشمس کے کاہن کو بےعزتی کے ساتھ ہلاک کرنیوالا خود انتہائی بےعزتی کے ساتھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سمجھ گئے۔ آؤ میرے ساتھ ـــــ آہ میرے کمزور بازو۔"

کاہنہ نے ہاروت کا ہاتھ پکڑا۔ اور چلنے لگی۔ بوڑھیا کے آخری الفاظ نے اُس پر بہت اثر کیا تھا۔ واقعی رقاصہ نے ہزاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ اور اب اپنی محبت کا انجام بھی ہاروت کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا تھا۔

آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ دونوں کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ زہرہ کے معبد کے قریب پہنچ گئے۔ کاہنہ تیزی سے ایک طرف گئی۔ اور پھر جلدی سے واپس آکر کہنے لگی۔ "پجاری اور کاہن سوئے پڑے ہیں چلو آگے چلیں"۔

دونو معبد میں داخل ہو گئے۔ کاہنہ آگے آگے جا رہی تھی۔ اور ہاروت اُس کے پیچھے پیچھے۔ آہستہ آہستہ دونوں سیڑھیوں سے اُترے۔ اور چند قدم ہی چلے ہونگے۔ کہ ان کے سامنے مضبوط دروازہ آ گیا۔ کاہنہ نے مشعل آگے بڑھائی۔ اور ہاروت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ قفل کھلا پڑا ہے۔ اس نے دروازے کو حرکت دی۔ اور ایک پٹ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ چند قدم کے فاصلے پر تابوت نظر آ رہا تھا۔ کاہنہ نے بعجلت اس کا ڈھکنا اُٹھانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ذرہ بھر جنبش بھی پیدا نہ ہو سکی۔ ہاروت خاموش و ساکت کھڑا تھا۔ اور مشعل کی روشنی میں کاہنہ کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"عزیز بیٹے! کیا سوچ رہے ہو۔ ہاتھوں کو حرکت دو!"

ہاروت نے تابوت کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ اور زور لگا کر اسے اٹھانے لگا۔ کاہنہ نے جلدی سے تابوت میں ہاتھ ڈالا اور یک لخت اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"یہ کیا ہاروت؟"

ہاروت نے تابوت میں نظر ڈالی۔ مشعل کی روشنی میں نعش کا سینہ ننگا نظر آ رہا تھا۔

"ستارہ کدھر گیا؟"

دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ جلدی چلو ورنہ ہمیں مجرم سمجھا جائیگا" ہاروت نے گھبرا کر کہا۔

"مگر ستارہ؟" یہ کہتے ہوئے کاہنہ نے نعش کے سینے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

"چلو جلدی یہاں سے نکلو" ہاروت نے کہا۔

"یہ غضب ہو گیا" کاہنہ کے چہرے پر مایوسی کے اثرات ہویدا تھے۔

ہاروت نے ڈھکنا بند کر دیا۔ دونوں باہر نکلے۔ چاند ہر طرف مدھم روشنی پھیلا رہا تھا۔ ہاروت تیزی کے ساتھ ایک طرف

چلنے لگا۔ کاہنہ دوسری جانب آہستہ آہستہ مایوسانہ قدم اٹھانے لگی ——!

(۳۴)

ہاروت جب گھر پہنچا۔ رات کا کافی حصہ گذر چکا تھا۔ تھکاوٹ کے باوجود وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے، گھناؤنے درختوں کے پاؤں میں جھیل "بلبورا" کا صاف پانی ایک سفید لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ ادھر سیاہ بادلوں میں گھرا ہوا مضمحل چاندیوں نظر آتا تھا۔ گویا ایک حسین شہزادی قید خانے میں دکھ بھری زندگی گزار رہی ہے۔ فضا میں ایک سحر آلود کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ ہاروت کے ذہن میں تفکرات کا ہجوم بے قرار تھا۔ "ثمارہ کی پر اسرار عدم موجودگی کے واقعے کے گرد اس کے خیالات گھوم رہے تھے۔ آخر اسے کون لے گیا اور کیوں؟ میں حقیقتاً رہمفی کے معبد میں پہنچا؟" یہ سوالات بار بار اس کے دماغ میں آتے تھے۔ آخر خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور سونے کی غرض سے اُٹھا۔ کہ اسے اپنے مکان کے قریب ہی ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ وہ اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ اجنبی عورت اس کے مکان کے نیچے پہنچی۔ اور دروازے کو دستک دینے لگی۔ "ممکن ہے یہ کاہنہ کی طرف سے آئی ہو" اور اسی خیال کو دل میں لئے وہ سیڑھیوں سے اُترا۔ اور دروازے کو کھول دیا۔ عورت نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "ہاروت تمہارا نام ہے؟"

"ہاں!" ہاروت نے جواب دیا

"میں دو بار یہاں آچکی ہوں۔ کل قصر احمریں میں آنا۔"

"کیوں؟"

"سمیرا نے بلایا ہے —— اور کہا۔" یہ کہہ کر اجنبی عورت نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

"مگر تم کون ہو؟"

"میں سمیرا کی خادمہ۔" وہ دوبارہ مسکرائی اور چلنے لگی۔ ہاروت اوپر آیا۔ اور کھڑکی میں سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ سمیرا کی خادمہ ایک سائے کی طرح جھیل کے پُل پر سے گزر رہی تھی۔ جب اُس نے رقاصہ کا نام سُنا تھا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ گزشتہ واقعات تصویروں کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے —— مگر جب وہ رقاصہ کا سلوک یاد کرتا۔ اسے رقاصہ کی محبت کا یقین ہو جاتا۔ تمام رات گوناگوں خیالات اس کے دماغ میں آتے رہے۔ صبح جبکہ سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنا بہترین لباس پہنا۔ اور قصر احمریں کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ خیال کر کے کہ علی الصبح پہنچ جانا شاید رقاصہ کی طبیعت پہ ناگوار گزرے

اس نے وہ راستہ پکڑا، جو دوسرے راستوں سے لمبا تھا۔ جیسے جیسے منزلِ مقصود قریب آتی جاتی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ قصرِ احمریں کے دروازے پر پہنچ کر اُسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ وہ کسی پُراسرار عمارت میں داخل ہو رہا ہے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اور اس کی شعاعیں قصرِ احمریں کی سُرخ، اُونچی اُونچی دیواروں پر نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ دروازے کی دونوں جانب محافظ دیوتا کے سنگین مجسمے کھڑے تھے۔ یہ ایک قسم کے پردار بیل تھے۔ جن کے چہرے انسانوں کے سے تھے۔ وہ ایک مجسمے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر ایک فوری جذبے کے زیرِ اثر اندر داخل ہو گیا۔ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر سیڑھیاں تھیں۔ اور پھر ایک بڑا میدان، جس کے وسط میں ربّ الشمس کا عظیم الشان مجسمہ نصب تھا۔ اس میدان کے دائیں بائیں کمرے تھے۔ وہ میدان میں پہنچ گیا۔ اس جگہ وہ کئی بار آ چکا تھا۔ مگر یہاں سے آگے کبھی نہیں جا سکا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ وُہی خادمہ جو اسے رات کو ملی تھی۔ اس کے پاس آئی۔ "تم اتنی جلدی آ گئے؟" خادمہ نے متحیرانہ کہا۔

ہاروت نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

"آؤ میرے ساتھ" یہ کہہ کر خادمہ چلنے لگی۔ اور اُس کے ساتھ ہاروت بھی روانہ ہو گیا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے گئی۔ "میرا تم کو خود بلائے گی ـــــ تم بہت جلد آ گئے ہو۔" اتنا کہہ کر خادمہ چلی گئی۔ ہاروت خیالات کے ہجوم میں غرق، کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اسے قریب ہی سے رقاصہ کی دلنواز آواز سنائی دی۔ اس کا سلسلۂ خیالات ٹوٹ گیا۔ دل دھڑکنے لگا ـــــ کئی لمحے گذر گئے۔ مگر وہاں کوئی نہ پہنچا۔ اسی اثناء میں دوسرے کمرے سے شور سنائی دینے لگا۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک کرخت آواز کہہ رہی تھی:-

"یہ موتی ـــــ تمہارے دشمن ہیں۔"

"میرے دشمن؟" یہ آواز رقاصہ کی تھی۔

"میرے دشمن، کون؟"

"اس کا جواب آنے والے واقعات دیں گے" ـــــ یہ وُہی کرخت آواز تھی۔

"مجھے بتاؤ ـــــ میں ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گدھوں کے سامنے پھینک دوں؟"

وہاں کھڑا رہنے کی ہاروت میں تاب نہ تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اور دُوسرے کمرے کے دروازے میں سے اندر جھانکا۔ کمرے کے وسط میں کاہن کے لباس میں ایک شخص کھڑا تھا۔ جس کے ہاتھ ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ اس کے پہلو میں رقاصہ کھڑی تھی۔

دونوں لنجو رپیالے کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پیشتر کہ رقاصہ کی نظر اس پر پڑے۔ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑکر دیکھا۔ وہی خادمہ خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"تم کمرے سے باہر کیوں آ گئے ——" خادمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے لے جاتے ہوئے کہا۔ "سمیرا نے تمہیں دیکھ تو نہیں لیا؟"

"نہیں!" ہاروت نے جواب دیا۔

یکایک خادمہ کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ اُس کے ہونٹ مرتعش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ رقاصہ ہاروت کے سامنے موجود تھی۔

"تم آ گئے ہاروت!" رقاصہ نے شیریں آواز میں کہا۔

"ہاں میں سویرے آ گیا ہوں ——"

"نہیں —— تم بالکل وقت پر آئے ہو —— ہاں رطبیں" رقاصہ نے خادمہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "ہاروت کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اُسی کمرے میں چلی۔ خادمہ نے ہاروت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور دونوں قدم اٹھانے لگے۔ رقاصہ کی دلنواز آواز ہاروت کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور اُس کی محبت پاش نگاہیں اس کے خیالات کی دنیا میں نشہ برسا رہی تھیں۔ زندگی میں دوسری بار سمیرا نے توجہ کی تھی۔ اور وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھنے لگا تھا۔ خادمہ اُسے ایک نہایت شاندار آراستہ و پیراستہ کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ ہاروت نے تکیے پر سر رکھا۔ اور نیم دراز ہو گیا۔ کمرہ اپنی جاذبیتوں کے لحاظ سے، ایک خواب حسیں بنا ہوا تھا۔

ہاروت کے قریب ایک ریشمیں گدیلہ پڑا ہوا تھا غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ گدیلے کو لگا۔ جو اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یکایک فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں —— اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی مبہوت و ششدر نگاہیں مادر بابل کا تعویذ دیکھ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر۔ اس پراسرار چیز کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ "یہ کام شمرطی کا ہے" یہ خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے ذہن میں آیا۔ اور ساتھ ہی رقاصہ کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس وقت رقاصہ بابل کی حسین ترین، متمول ترین —— عورت کی ذلت انگیز موت کا سامان اس کے ہاتھ میں

تھا۔ اس نے بے اختیارانہ شمارہ کو تہ کیا۔ اور جیب میں ڈال لیا۔ خیالات و تفکرات کا بے پناہ ہجوم اس کے ذہن میں بے قرار ہو گیا۔ اسی کشمکش میں کچھ دیر گذر گئی۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ تو اپنے پاس رقاصہ کو کھڑے ہوئے پایا۔

"کس خیال میں غرق ہو ہاروت!" رقاصہ نے مسکرا کر کہا۔

"کسی خیال میں نہیں"۔ ہاروت نے کہا۔ اور رقاصہ کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں خوف کا کوئی اثر نہیں تھا۔ رقاصہ بیٹھ گئی اور گلدستے کو زانوؤں پر رکھ لیا۔

"اس دن ——— جب پلید کاہن مرا تھا تم نے مجھ سے ہمدردی کی باتیں کی تھیں ——— اور میں بہت خوش ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی۔ کہ تمہیں بھی خوش کروں۔ اس لئے آج بلایا ہے"۔

"تمہاری توجہ مجھے خوش کرنے کے لئے کافی ہے"۔

"یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے گلے سے موتیوں کا ہار اتارا۔ اور ہاروت کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ "تم یہ لے لو"۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔

"مگر میری خوشی ——— ہاروت!"

"آخر یہ کیوں؟ میں صرف تمہاری توجہ چاہتا ہوں"۔

"توجہ کی یہ بھی ایک صورت ہے"۔

"مگر ایسی مہربانی خادموں سے کی جاتی ہے!"

"اوہ تمہیں بڑی غلط فہمی ہوئی ——— میں اور تمہیں خادم سمجھوں۔ کتنی افسوسناک بات؟ ——— میری خاطر تم یہ لے لو"۔

ہاروت کو لینے کے سوا، اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں ——— تم یہاں ضرور آیا کرو"۔ رقاصہ نے مسکرا کر کہا۔ "آیا کرو گے؟"

"ہاں"۔

ہاروت کو ایسا محسوس ہوا۔ گویا وہ نور و نکہت کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ رقاصہ کی مسکراتی ہوئی بڑی بڑی خوبصورت

آنکھوں سے نشے کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ہاروت کے دل کی فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔

"بہت کم شخصوں نے میرے دل کو متاثر کیا ہے —— مگر یہ اثر بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔" رقاصہ نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ بابل میں تو بڑے بڑے حسین و جمیل اور دولت مند آدمی موجود ہیں۔"

"ہاں! ایسے آدمیوں کی کمی نہیں۔ مگر ان خصوصیتوں نے میرے دل پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ آہ میں کچھ اور چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا ہے؟" ہاروت نے متعجبانہ کہا۔

"یہ میں خود بھی اچھی طرح نہیں بتا سکتی۔"

"تو ایسا انسان تمہیں نہیں ملا۔ جو ——"

دونوں کی نگاہیں متصادم ہوئیں۔

"مل گیا ہے ——" یہ کہتے ہوئے رقاصہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی لہریں تیرنے لگیں۔

"وہ کون ہے؟" ہاروت نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں مسرت آمیز اضطراب موجزن تھا۔ رقاصہ نے مسکراتی ہوئی نظروں سے نوجوان کو دیکھا۔ اور اس کا چہرہ ہاروت کے قریب آگیا۔ "وہ تم ہو!" رقاصہ کے لبوں سے نکلا۔

"میں ——" ہاروت کے جذبات میں گدگدی سی ہونے لگی "تم مجھے اپنا سچا محب پاؤ گی —— سمیرا! میری سمیرا!" اور پھر دھڑکتے ہوئے دلوں کے تاروں سے محبت کا نغمہ لرز لرز کر لہرا لہرا کر اٹھا۔ اور ہونٹوں کے تصادم جمیل میں تبدیل ہو گیا۔

"کاش ہماری محبت ہمیشہ قائم رہے!" ہاروت نے کہا۔

"سمیرا کی محبت تغیر پذیر ہونا نہیں جانتی!"

"مگر آج تک تم نے ہزاروں ——"

"میں نے ان سے محبت نہیں کی۔" رقاصہ نے ہاروت کے الفاظ کاٹ کر کہا۔ "وہ میری محبت کے قابل نہیں تھے۔"

یکایک ہاروت کو سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی —— اور اسے فوراً ثمارہ کا خیال آیا۔ کیونکہ اسی خوفناک چیز

کے موتی اس کے سینے میں چبھ چبھ کر اُسے موقعہ کی نزاکت کا احساس دلا رہے تھے۔

"میں اب جاتا ہوں۔" ہاروت نے کہا۔ اور اُٹھ بیٹھا۔

"میں تمہیں روک نہیں سکتی —— تم جس وقت چاہو یہاں آسکتے ہو۔"

ہاروت کمرے سے نکلا۔ اور چلنے لگا۔ قصرِ احمریں سے نکل کر وہ ابھی قریب ہی ایک باغ میں پہنچا تھا۔ کہ اس نے دیکھا ایک مجسمہ کے نزدیک مشہور رقاصہ زمورت کھڑی ہے۔ اور اس کے پہلو میں وہ متمند نوجوان "ہاروت" نظر آرہا ہے —— وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ راستے میں اُس نے سنا کہ مادرِ بابل کا "ثمارہ" چوری ہو گیا ہے۔

(۵)

تمام شہر میں یہ حیرت زا خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ کہ مادرِ بابل کا مقدس ثمارہ چوری ہو گیا ہے۔ چور کون ہے؟ اس کے متعلق مختلف افواہیں تھیں جس دن ہاروت ثمارہ لیکر قصرِ احمریں سے نکلا تھا۔ اُس دن رقاصہ کے خلاف شہر بھر میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ کیونکہ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا۔ کہ وہ چور ثابت ہو گئی ہے۔ مگر جب کاہنوں کو قصرِ احمریں کا گوشہ گوشہ، کونا کونا چھاننے کے باوجود ثمارہ کا نشان تک نہ ملا۔ تو بڑی شد و مد کے ساتھ اس خبر کی تردید ہونے لگی۔ اس قسم کی افواہیں غلط ہوتے ہوئے بھی ایک مدت تک لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے شہر کے بعض حلقوں میں یہ بات بدستور مشہور تھی۔ کہ چور رقاصہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ ہر روز کاہن کسی نہ کسی بہانے قصرِ احمریں میں جاکر مختلف ذرائع جستجو کو بروئے کار لاکر گم شدہ شے کو ڈھونڈتے تھے اور ہاروت سب کچھ دیکھ رہا تھا سب کچھ سن رہا تھا۔ مگر اس کا دل بالکل مطمئن تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا۔ کہ "رقاصہ پر یہ الزام ذرہ بھر صداقت حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ چیز جو اس کی ذلت انگیز موت کا سامان لیکر آج سے دو دن پیشتر اُس کے تکیے کے نیچے پڑی تھی۔ آج ایک اُجاڑ اور بیابان جگہ پر ایک سنگِ گراں کے نیچے پوشیدہ ہے۔ اور اس کا علم اس کے سوا بابل میں کسی کو بھی نہیں —— کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔"

شام ہو چکی تھی۔ لوگ بازاروں میں میدانوں میں "ثمارہ" کی عدم موجودگی کے لرزہ خیز واقعے پر اظہارِ خیالات کر رہے تھے۔ ہاروت بھی ایک بارونق بازار میں کھڑا ایک گروہ کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک کہہ رہا تھا۔

"آج تک اتنا لرزہ خیز واقعہ تمام بابل میں نہیں ہوا۔ دیکھ لینا مجرم عنقریب ذلت انگیز موت مریگا۔"

"دوسرے کی رائے تھی" میرے خیال میں تو چور رقاصہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ دولت کی ترقی کے ساتھ انسان کی ہوس میں بھی

ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ثمارہ پر بے شمار قیمتی موتی اور جواہرات لگے ہیں۔"

تیسرے کا خیال تھا "مگر رقاصہ کو دولت کی کیا ضرورت۔ اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔"

ہاروت نے آگے قدم اٹھایا۔ اس کے دماغ میں ایک اور خیال پیدا ہوا "ممکن ہے رقاصہ نے خود چوری کی ہو۔" اتنا خیال کرتے ہی اس کے دل میں ایک نئی خلش، ایک نئی کشمکش اور ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی۔ واقعی یہ بات ابھی تک اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی —— مگر بہت جلد اس کی رائے بدل گئی۔ وہ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ آبادی سے دور ایک کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں پہنچکر وہ واپس ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ اس نے مڑکر دیکھا۔ تو اپنے سامنے بوڑھی شمرطی کو موجود پایا۔

"سنا ہے شہر میں کیا ہو رہا ہے" کاہنہ نے ہاروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہاں کتنا عجیب واقعہ!"

"تمہیں یقین ہے ثمارہ رقاصہ نے ہی چرایا ہے؟" شمرطی نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں!"

"مگر مجھے یقین ہے۔ اپنی دلچسپیوں کو قائم رکھنے کے لئے اسے دولت کی از حد ضرورت ہے۔ اور اس ذریعے سے بے شمار دولت اس کے قبضے میں آسکتی ہے —— تم دیکھ لینا فاحشہ عورت عنقریب چاہ بابل میں دم توڑ رہی ہوگی۔"

ہاروت نے غور سے کاہنہ کو دیکھا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار تھی۔

"شمرطی!"

"کہو کیا بات ہے!"

"سچ سچ بتاؤ۔ یہ واقعہ کیا ہے؟"

"کون سا واقعہ میرے بیٹے! جو مجھے معلوم ہے۔ میں وہ ضرور بتاؤں گی۔ دنیا میں صرف تمہیں میرے ہمراز ہو" یہ الفاظ شمرطی نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہے۔

"یہ واقعہ کیا ہے! ثمارہ اس کے ہاں تم ہیں لے گئی تھیں —— اور مجھے دھوکا دیا تھا؟"

یہ الفاظ سنتے ہی کاہنہ نے ہاروت کو متعجبانہ دیکھا۔ اور اس کے قریب تر ہو گئی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو ـــــ کیا مطلب ہے تمہارا؟" کاہنہ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ ثمارہ تم نے تابوت سے نکالا۔ اور پھر اُسے قصرِ احمریں میں لے گئیں؟"

"یہ کیونکر ہو سکتا ہے میرے بیٹے؟ اگر میں یہ کام خود کر سکتی۔ تو ہرگز تمہیں مدد کے لئے نہ کہتی ـــــ کیا پتہ ہمارے جانے سے پہلے ہی رقاصہ نے ثمارہ چرا لیا ہو۔"

"یہ بات ماننے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ رقاصہ کو ثمارہ چرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تمہیں نے ثمارہ چرایا۔ اور اُسے رقاصہ کے کمرے میں رکھ دیا تاکہ وہ ذلت کی موت مرے ـــــ مگر یاد رکھو! تم اپنے ذلیل مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں!"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے میرے عزیز بیٹے! تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں تمہیں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ پہلے تم نے رقاصہ کی ذلت آفریں موت کا سامان پیدا کیا۔ اور پھر مجھے تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی۔"

کاہنہ متحیر و ششدر نگاہوں سے ہاروت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کہے جا رہا تھا "تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ـــ لیکن تم اپنے مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکو گی!"

"ثمارہ رقاصہ کے کمرے میں ملا ہے؟" کاہنہ نے پوچھا۔

"بڑی بھولی بھالی ہو تم۔"

یہ کہکر ہاروت چلنے لگا۔ شمرطی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرے بیٹے! ذرا ٹھہرو!"

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں وہ اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میرے بیٹے! میرا ذرہ بھر خیال بھی تمہارے دل میں نہیں ـــــ میرے احسانات کو بھول گئے؟"

"میں ان احسانات کا بدلہ ضرور دونگا۔ مگر یہ بھی سوچو۔ ایک دفعہ تم نے مجھے موت سے بچانے کی کوشش کی۔ اور دوسری دفعہ مجھے ذلت انگیز موت کے غار میں دھکیل دیا۔ ثمارہ کی چوری!"

"تمہاری غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی ـــــ!" شمرطی ذرا ٹھہری۔ پھر کہنے لگی "میرے بیٹے! تمہیں مادرِ بابل کے عریاں سینے کی قسم مجھے اس کا جواب دو!"

"کس کا؟"

"یہ تم کیونکر کہہ سکتے ہو۔ کہ ثمارہ میں نے رقاصہ کے کمرے میں رکھدیا۔ اور پھر بھی میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی؟"

"کیا تم نے ثمارہ چرا کر اس کے کمرے میں نہیں رکھا؟"

"فرض کر لیا یہی بات ہے۔ پھر"—

"تو اس کا بھی یقین کر لو۔ کہ تم اپنے ذلیل مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتیں!"

"اور رقاصہ کو اس کی ذلت انگیز موت سے بچانے والے تم ہو؟"

"ہاں — کوئی بھی اس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم نے اسے انتہائی ذلت سے بچایا۔ مگر جب تک ثمارہ غائب ہے۔ رقاصہ ملزمہ ہی سمجھی جائے گی۔"

ثمرطی نے نفرت سے ہاروت کو دیکھا۔ اور تیزی کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گئی۔ ہاروت سر جھکائے کھڑا تھا۔ یقیناً اس نے رقاصہ کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ مگر لوگوں کا شک کیونکر دور کر سکتا تھا؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ثمارہ مادر بابل کے سینے پر رکھدیا جائے؟ یہ خیال آتے ہی اس کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دور زہرہ مغنی کا معبد گنجان درختوں کے عقب میں کھڑا بزبان حال اس کی تائید کر رہا تھا۔ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی سایہ کھنڈر سے نکل کر ایک طرف چلا گیا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس چیز کو وہم پر محمول کر کے وہ دائیں طرف چلنے لگا۔ جب وہ سوچتا۔ کہ یہ تکلیف وہ رقاصہ کے لئے اٹھا رہا ہے۔ تو اس کا دل جذبۂ مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ اور وہ مسرورانہ قدم اٹھانے لگتا۔ راستے میں کئی بار اسے احساس ہوا۔ کہ کوئی سایہ اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن جب غور سے دیکھتا۔ تو کوئی دکھائی نہ دیتا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اس نے چھوٹے سے چشمے کے کنارے پڑے ہوئے سنگِ گراں کو ہٹایا۔ اور زمین کو کھودا۔ اب اس کے ہاتھ میں مادر بابل کا مقدس ثمارہ چاند کی مدھم روشنی میں چمک رہا تھا۔ ایک سایہ نے اس کے قریب حرکت کی۔ وہ ذرا جھجکا ——— یکایک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر پڑا۔ اور وہ گر پڑا۔ عالم بے ہوشی میں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کوئی اس کے ہاتھ سے ثمارہ چھین رہا ہے۔

---

(۶)

دریائے فرات کے کنارے ہزارہا لوگ انبوہ در انبوہ کھڑے مضطرب و بیقرار نگاہوں سے دور افق پر دو سنہری، متحرک نقطوں کو دیکھ رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا۔ اور اس کی کرنیں پانی کی سطح پر رقص کرتی ہوئی یوں نظر آتی تھیں۔ گویا مینائے نیلگوں میں شراب کی موجیں مچل رہی ہیں۔ اب وہ سنہری نقطے دو بجروں کی صورت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور تیزی کے ساتھ کنارے کی طرف آ رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتے جاتے تھے۔ تماشائیوں کی بے قراری و بے تابی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ایک بجرا جو دوسرے بجرے سے ہر لحاظ حسین و دل آویز تھا۔ کنارے پر آ لگا۔ اور اس میں سے بابل کی سب سے بڑھ کر حسین و جمیل عورت سمیرا مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔ لوگ ایک طرف ہٹنے لگے۔ یہ اس کے لئے راستہ بنایا جا رہا تھا۔ سمیرا نے مڑ کر حقارت انگیز نظروں سے دوسرے بجرے کو دیکھا۔ جو کنارے کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ ہجوم میں سے کچھ لوگ اس کی طرف لپکے۔ ایک خاص دلربایانہ انداز میں زموُرت دوسرے بجرے سے نکلی۔ دونوں رقاصاؤں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ دونوں کی نگاہیں مسکرا رہی تھیں۔ مگر سمیرا کی مسکراہٹ کے پیچھے حقارت کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور زموُرت کے تبسم میں حسد و بغض کروٹیں لے رہا تھا۔

"ماروتؔ بابل کا حسین و دولتمند نوجوان راستے سے لوگوں کو ہٹاتا ہوا زموُرت کے قریب پہنچا۔ اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ زموُرت کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ سمیرا اب بھی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ جب ماروت اور اس کی محبوبہ چلے گئے۔ تو وہ بھی ہجوم کے سمندر میں ایک موج رنگین کی طرح بڑھی اور غائب!

ماروت و زموُرت جب کمرے میں پہنچے۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ دونوں کی نظریں بے تابانہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اور دونوں کی ہر ہر ادا، ہر ہر حرکت سے دلی اضطراب مترشح تھا۔ زموُرت قالین پر بیٹھ گئی۔ اور اس کے پہلو میں ماروت بھی بیٹھ گیا۔ خادمہ نے شربت خوش رنگ سے لبریز دو جام اُن کے آگے رکھ دیئے۔ اور خود مؤدبانہ کھڑی ہو گئی۔ زموُرت نے آنکھ کے اشارے سے اُسے باہر جانے کا حکم دیا۔ اور جب وہ چلی گئی۔ تو اس نے ایک گلاس اٹھا کر ماروت کے لبوں سے لگا دیا۔ جسے ماروت نے تین چار گھونٹوں میں خالی کر دیا۔

"میرا دل بہت بیتاب ہے۔ اب راز بتاؤ!" رقاصہ زموُرت نے کہا۔

ماروت نے خالی گلاس قالین پر رکھ دیا۔ اور لبوں سے ایک لفظ کہے بغیر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور جب اُسے نکالا تو اس میں مادرِ بابل کا تارہ نظر آ رہا تھا۔ زموُرت کے منہ سے فرطِ حیرت کے عالم میں ہلکی سی چیخ نکلی ——— اُس نے

ثمارہ ہاتھ میں لے لیا۔ اور مستفسرانہ ماروت کو دیکھنے لگی۔

"یہ سب تمہارے لئے ہے!"

"میں جانتی ہوں —— مگر"

"یہ پوچھنا چاہتی ہو۔ کہ میں اسے کیونکر حاصل کر سکا؟"

"ہاں!"

"کل رات کا واقعہ ہے۔ میں نانا خا کے کھنڈر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ کہ دیکھا۔ کہ ہاروت، مرحوم امرائیل کی بیوی۔ شمرطی کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ اگرچہ میں ان کی زیادہ گفتگو نہ سن سکا۔ مگر مجھے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ثمارہ کے غائب کرنے میں ہاروت کا ہاتھ ہے۔ جب شمرطی چلی گئی۔ تو میں وہیں کھڑا ہاروت کی نقل و حرکت کو دیکھتا رہا۔ وہ آبادی کی طرف جانے کی بجائے جنگل کی طرف چلا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ ایک نہایت ویران جگہ پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک بڑے سے پتھر کو ہٹایا۔ زمین کو کھودا۔ اور اس میں سے ایک چیز نکالی یہ چیز —— ثمارہ کے سوا اور کچھ نہ تھی؟"

"ثمارہ" زمورت نے متحیرانہ کہا۔ "اس کے ہاتھ میں کیونکر آیا؟ —— اسے وہاں جا کر کون رکھ آیا؟"

"معلوم نہیں، آج کل ہمیرا ہاروت پر نظر توجہ کر رہی ہے۔ ممکن ہے۔ اس کے کمرے میں ہاروت نے ثمارہ کو دیکھ لیا ہو۔ اور اسے اٹھا کر خود ہی اُجاڑ جگہ پر رکھ دیا ہو —— یا یہ کام رقاصہ کے ایما سے ہوا ہو۔"

"حیرت ہے!"

خیر تم سنو جب میں نے ہاروت کے ہاتھوں میں ثمارہ کو دیکھا۔ تو فوراً موقعہ سے فائدہ اٹھایا —— پتھر اس کے سر پہ مارا جس سے وہ مر گیا۔ اور ثمارہ میرے قبضے میں آ گیا؟"

"تم بڑے خوش نصیب محبوب ہو؟" یہ کہتے ہوئے زمورت نے اپنی مرمریں باہیں ماروت کی گردن کے گرد حمائل کر دیں۔

"یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا ہے!"

"اس میں کیا شک ہے —— میرے محبوب! تم کتنے اچھے ہو۔ رب الشمس کی عظمت ہمیشہ ہماری محبت کو

قائم رکھے!"

"اب پھر تم؟"

"ہاں" زمورت نے اس کے الفاظ کاٹ کر کہنا شروع کیا۔ "پہلے کی طرح سمیرا کی ذلت انگیز موت کا سامان اس کے کمرے میں کسی محفوظ جگہ پر رکھ آؤں گی ـــــ آج شام کو میں اپنا فرض ادا کر دوں گی۔ اور کل صبح اس کی ذلت انگیز موت اپنا فرض ادا کرے گی!"

"شام کو جاؤ گی؟"

"ہاں یہ بہترین موقعہ ہے۔"

"سخت احتیاط کی ضرورت ہے!"

"پہلے میں نے احتیاط نہیں کی تھی ـــــ بنا بنایا کام ہاروت نے بگاڑ دیا ـــــ مردار!"

"لیکن اب بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے!"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو ـــــ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی ـــ آہ میرے محبوب وہ وقت کتنا خوش گوار ہوگا۔ جب میں بابل کی سب سے بڑی رقاصہ ہونگی اور تم میرے محبوب؟"

"تو اب میں تمہارا محبوب نہیں رہا ابھی تک مردہ ہاروت ہی کو اپنا محبوب سمجھ رہی ہو۔"

"اس مردار کا ذکر چھوڑ دو۔ اور یہ گلاس پی لو!"

"تم نہیں پیو گی؟"

"نہیں ـــ میرا دل آنے والی مسرت کی شراب سے سرشار ہے!"

"کہیں اب کے بھی کام نہ بگڑ جائے!"

"اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاروت مردہ پڑا ہے!"

دونوں کے چہرے سرخ تھے۔ زمورت نے جام اٹھا کر ہاروت کے لبوں سے لگا دیا۔

~~~~~~~~ (۷) ~~~~~~~~

آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ کاہن حمورا اپنے کمرے میں سنگِ مرمر کی میز کے اوپر رکھے ہوئے ایک بڑے سے پیالے
~~~~~~~~

کو بنظر غور دیکھ رہا تھا پیالہ شفاف و مصفا پانی سے لبریز تھا جس کی سطح پر مختلف رنگ و شکل کے متعدد موتی چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک موتی، جو سب سے بڑا تھا اپنے اندر خاص جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک روشندان کھلا تھا جس میں سے ہوا کے جھونکے ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے اندر آ کر دیواروں پر لٹکتے ہوئے سیاہ پردوں کو جنبش دے رہے تھے چھت سے بڑا سا شمعدان لٹک رہا تھا جس کی روشنی فضا میں چھائی ہوئی تھی۔ کاہن کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور آنکھیں پیالے کی سطح پر جمی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ، لحظہ بہ لحظہ اس کی محویت بڑھتی جاتی تھی یکایک دروازے کو دستک ہوئی۔ کاہن نے پیالے سے نظریں ہٹائیں۔ اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ اور رقاصہ سمیرا مضطربانہ اندر داخل ہوئی۔

"اب کیا ہے کاہن؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھ لو!" یہ کہہ کر کاہن پیالے پر جھک گیا۔ رقاصہ اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی اضطراب در آغوش نگاہیں پیالے کی سطح پر عجیب و غریب منظر کو دیکھنے لگیں۔ کاہن کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ اور وہ کچھ پڑھنے لگا۔ پانی کی سطح پر سیاہ دھبے نمودار ہو گئے۔ دونوں کا اضطراب بڑھنے لگا۔

"دیکھ لیا!" کاہن نے کہا۔

"تین دشمن؟"

"ہاں، وہ ذرا ٹھہرا اور پھر کہنے لگا: "ان میں سے ایک کسی نہ کسی بات میں تم سے غیر معمولی مشابہت رکھتا ہے"؟

چھوٹے چھوٹے موتی بڑے موتی کے بالکل قریب آ گئے۔ اور وہ تاریک دھبے میں ڈوبنے لگا۔

"بہت بڑی مصیبت اور عنقریب!"

"عنقریب؟" رقاصہ کے لبوں سے نکلا۔

"عنقریب —— دیکھو تمہارا موتی کس طرح تاریکی میں ڈوب رہا ہے؟"

"میں انہیں نیست و نابود کر دوں گی!"

"مگر وہ معمولی نہیں۔ بہت خطرناک دشمن ہیں!"

"کون ہیں یہ مردود کتے؟"

کاہن نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے موتی کو دیکھ رہا تھا۔ رقاصہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"دُنیا کی کوئی طاقت میرا بال بیکا نہیں کر سکتی"!

اسکے جواب میں کاہن نے غور سے رقاصہ کے چہرے کو دیکھا۔ اور خاموش رہا۔

"موتی نصف سے زیادہ تاریکی میں ڈوب چکا ہے۔" رقاصہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے غرق ہوتے ہوئے موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اور ابھی ڈوبتا جا رہا ہے ——— کیا خبر ———؟"

"دشمن کی کوششیں قریباً قریباً کامیاب ہو چکی ہیں"؟

"اس میں کیا شک ہے! رب الشمس تم پر رحم کرے"!

اب موتی کا بہت کم حصہ تاریکی سے باہر نظر آ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں اس پر گڑی تھیں۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اور منظر میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہ ہوا۔

"اتنا خوفناک منظر!" کاہن نے کہا۔ "تمہاری زندگی انتہائی خطرے میں ہے"۔

"میں دیکھ رہی ہوں، مگر کاہن!" اس کی آواز پرجوش ہو گئی تھی۔ "وہ ذلیل کتے ایک دوسرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینگے"!

"ایسا ممکن ہے ——— مگر دشمن معمولی دشمن نہیں۔ اور دیکھ لو۔ ان کی کوششوں نے کہاں تک کامیابی حاصل کر لی ہے"!

"کامیابی ——— یہ کوئی کامیابی نہیں"!

"تو پھر کامیابی کیا ہو سکتی ہے ———؟ مگر گھبرانے کی قطعاً ضرورت نہیں"۔

"میں اور گھبراؤں ———؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ——— ایسا کبھی نہیں ہوگا"۔

یہ کہکر رقاصہ دروازے کی طرف بڑھی۔ جلدی سے اُسے کھولا۔ اور باہر نکل گئی۔ کاہن نے ایک سیاہ پردہ پیالے پر ڈال دیا۔ اور اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھکر متفکرانہ انداز میں کھڑا ہو گیا ———!

——— (۸) ———

ماروت اپنے عالیشان مکان کے عقب میں، باغیچے کے آخری گوشے میں بیٹھا ہوا کچی اینٹ پر پتھر کے ایک ٹکڑے کے ساتھ مختلف قسم کی چھوٹی چھوٹی شکلیں بنا رہا تھا۔ قریب ایک مشعل رکھی ہوئی تھی۔ جس سے روشنی کا مختصر سا حلقہ نور لرز رہا تھا۔ ماروت

کی نگاہیں اینٹ کی مختلف شکلوں پر جمی تھیں۔ اور اس کا دل آنے والی مسرتوں کے دلآویز و نشہ ریز تصور کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب چھوٹی چھوٹی شکلیں ایک لرزہ خیز اور خوف آور راز کا انکشاف اپنے سینے میں لئے ہوئے تھیں۔ یہ چند لکیریں جہاں ایک طرف بابل کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عورت، سب سے بڑھ کر ماہر فن رقاصہ کی ذلت انگیز موت کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہاں زموُرت کی بہت بڑی آرزو کے پورا ہونے کا مژدۂ جانفزا بھی سنا رہی تھیں۔

جو کچھ لکھنا تھا۔ وُہ لکھ کر ماروت نے پتھر کے ٹکڑے کو ایک طرف رکھ دیا۔ اور نگاہیں اینٹ پر جمائے زیر لب بولنے لگا:۔

"ثمارہ رقاصہ سمیرا ہی نے چرایا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ وُہ اِس وقت اُس کے خاص کمرے میں ایک سنہری گدیلے کے نیچے پڑا ہوُا ہے"۔

اب اس نے دوسری اینٹ اُٹھائی۔ اور اس پر بھی یہ عبارت لکھدی۔ جب یہ کام ختم ہو گیا۔ تو اس نے دونوں اینٹوں کو اپنے سامنے رکھدیا۔ اور ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھکر سوچنے لگا۔ ایک اینٹ اس نے پوشیدہ طور پر ربعنی کے کاہن اعظم کے پاس پہنچائی تھی۔ اور دوسری شاہی محل میں۔ اُمید کی روشنی اس کی آنکھوں میں چمکنے ہی لگی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس کا ارادہ یقیناً کامیاب ہوگا۔ اس نے اپنی دائیں طرف دیکھا جہاں ایک سنہری تھیلا نظر آرہا تھا۔ یکایک اس کے کان میں خادم کی آواز آئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر پودے کی ایک ٹہنی پکڑے اس کا غلام کہہ رہا تھا۔

"رقاصہ سمیرا آئی ہے"!

"کیا کہا"؟

"رقاصہ سمیرا آئی ہے۔ اور آپ سے ملنا چاہتی ہے"!

خادم کی اس مداخلت پر اُسے غصّہ تو بہت آیا کیونکہ اس نے منع کر رکھا تھا۔ کہ کوئی بھی وہاں نہ آئے۔ مگر جب اس نے رقاصہ کی آمد کی خبر سُنی۔ تو متعجبانہ خادم کو دیکھنے لگا۔ رقاصہ کی اس سے کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ وُہ زموُرت کا عاشق تھا۔ اور اُسی کا عاشق رہنا چاہتا تھا۔ وُہ ابھی سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کرے۔ کہ دُور سے رقاصہ سمیرا کی شیریں آواز آئی۔

"ماروت! تم کہاں ہو"؟

ماروت نے بعجلت پھولوں اور ٹہنیوں کو توڑا اور انہیں اینٹوں پر ڈال دیا۔ رقاصہ تیزی سے چل کر اُس کے قریب

آگئی۔

"کیا کر رہے ہو ماروت؟"

ماروت کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی نگاہیں متصادم ہوئیں۔

"تم میری آمد پر حیران ہو رہے ہو شاید؟" رقاصہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ماروت چپ چاپ کھڑا تھا۔

"بات بھی حیران ہونے کی ہے ـــــــ آج پہلی دفعہ یہاں آئی ہوں"۔

"اور اس وقت میں کسی سے ملنے کے لئے تیار بھی نہیں!"

"یہ عجیب قسم کی مہمان نوازی ہے ماروت!"

"درست ہے ـــــ مگر اس وقت مجھے بہت ضروری کام انجام دینا ہے!"

"اوہ بہت ضروری کام ـــــــ تاہم میرا خیال ہے۔ کہ بابل کی سب سے بڑی رقاصہ کا احترام اس سے زیادہ ضروری ہے!"

"اس قسم کی باتوں کی ضرورت نہیں!"

"شاید اس وقت تم رب الشمس کو مہمان بنانا بھی گوارا نہ کرو؟" سمیرا نے یہ الفاظ خاص انداز میں کہے۔

"ایسا ہو سکتا ہے!"

"تم ناراض ہوتے ہو۔ تو میں چلی جاتی ہوں ـــــــ بابل کے امراء، وزراء تو میری ایک نظر کو ترس رہے ہیں۔ اور تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟"

ماروت نے اُسے پُر غضب نظروں سے دیکھا۔ اور چپ رہا۔

"تمہارے اس سلوک پر مجھے ـــــــ"

"آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" ماروت نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی کوئی راز ہے؟"

"راز نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تم اسے راز اس لئے سمجھتے ہو۔ کہ تم نے مجھے سمجھا نہیں ـــــــ آہ بابل میں سے کسی نے بھی مجھے نہیں سمجھا۔ یہ کتنی

تاسف خیز بات ہے؟"

ماروت نے غور سے رقاصہ کے چہرے کو دیکھا۔

"مجھے سمجھنے کے لئے ایک خاص دل، ایک خاص دماغ کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں میں نے کسی شخص میں آج تک نہیں پائیں!"

"سمیرا! میں زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

"مگر خوبصورت نوجوان! میں ایک راز تمہیں بتانے آئی ہوں!"

"کیا راز؟"

"بیٹھ جاؤ ــــ سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور دونوں بیٹھ گئے۔ ماروت کے دل میں نشے کی ایک لہر دوڑ گئی!

"کیا راز؟ ماروت نے دوبارہ پوچھا۔

"سب سے بڑا راز یہ ہے۔ کہ میں تمہارے پاس آئی ہوں ــــ اور دوسرا راز یہ کہ میں نے اپنے دل کی بات تمہیں بتا دی۔" یہ کہتے ہوئے رقاصہ اس کے بالکل قریب ہو گئی۔ اور نوجوان اس کی گرمی تنفس محسوس کرنے لگا!

"بس یہی بتانے آئی ہو؟" ماروت نے پوچھا۔

"اس کے سوا اور بھی!"

"وہ کیا؟"

"وہ ــــ سُن کر کیا لو گے؟"

ماروت کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ رقاصہ کی گرمی تنفس اُس کے جذبات میں گدگدی سی پیدا کر رہی تھی:

"میں تمہیں سمجھنا چاہتا ہوں سمیرا!"

"کیا ابھی تک نہیں سمجھے؟ ماروت! میرے ماروت!!"

ماروت نے گھور کر سمیرا کے چہرے کو دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد رقاصہ کے ہاتھ، ماروت کی گردن کے گرد حمائل ہو گئے۔

"میری رقاصہ! آج سے تم میری ہو!"

"تمہاری!" رقاصہ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "مگر وہ حسد کی آگ میں جلتی ہوئی کبڑی رقاصہ!"

"زموّرت؟"

"ہاں ـــــ وہ ہماری محبت کب برداشت کریگی؟"

"اس کا خیال چھوڑ دو ـــــ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی!"

سمیرا ذرا خاموش رہی پھر کہنے لگی "میرے ماروت! اگر میں بابل کے تمام امیروں کو چھوڑ کر اپنا آپ تمہارے سپرد کر دوں۔ تو کیا تم ایک ہستی کو بھی میرے لئے نہیں چھوڑ و گے!"

"میں نے آج سے اسے چھوڑ دیا ہے!"

"تاہم اس کا وجود ہماری محبت کے راستے میں حائل رہے گا ـــــ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کریگی۔ کہ میں تم سے محبت کروں یا تم مجھے چاہو!"

"اگر یہ بات ہے تو میں اس کی زندگی ختم کر دونگا!"

رقاصہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ماروت! میں نے کہا تھا۔ کہ مجھے سمجھنے کے لئے ایک خاص دل اور دماغ کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں تم میں موجود ہیں۔ تم کتنے خوش قسمت ہو میرے محبوب! کاش تم میرے ہی رہو!"

"تمہیں اس میں شک ہے؟"

"جب تک وہ کبڑی رقاصہ زندہ ہے۔ مجھے اپنی اور تمہاری زندگی کا خطرہ رہے گا۔"

"میں اس کی زندگی ختم کر دوں گا ـــــ میری محبوبہ!"

رقاصہ نے اپنا سر ماروت کی گود میں رکھ دیا ـــــ "میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی ـــــ ہمیشہ!"

کچھ دیر گذر گئی ـــــ رقاصہ تڑپ کر اُٹھی۔ "میں جاتی ہوں۔ جس وقت چاہو۔ میرے پاس آؤ ـــــ میرے محبوب!"

"میں آج بہت خوش ہوں۔" ماروت نے مسرورانہ لہجے میں کہا۔

رقاصہ باغیچے سے باہر نکلی ـــــ چلنے لگی ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور رخساروں

پر بیٹھ گئے۔

سمیرا ماروت کو ایک عجیب عالم میں چھوڑ کر اپنی اداؤں کی ساحرانہ دلآویزیوں اور اپنے حسنِ خوں آشام کی جاذبیتوں کے ساتھ جا چکی تھی۔ حسن پرست نوجوان کے لبوں سے جن پر ابھی وہ نازک اور گلاب آسا ہونٹوں نے محبت کے سحر پاش جذبے کو ایک نکھتے ہوئے خوابگوں نقش کی صورت میں ثبت کیا تھا۔ نشہ و لذت کی لہریں اٹھ اٹھ کر اس کے دل و دماغ کی فضاؤں، اس کے روح و سینہ کی گہرائیوں میں تیر رہی تھیں۔ اور وہ اسی پُرنشہ کیفیت میں رہنا چاہتا تھا ـــــ اسی پُرنشہ کیفیت میں کھو جانا چاہتا تھا۔ زہرہ کی محبت اس کے لئے خوابِ خیال بن چکی تھی۔

انسانی زندگی کتنی جلد متغیر ہو جاتی ہے۔ جس محبوبہ دلنواز کے واسطے ماروت نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی تھی۔ اب اس کی جان لینے کا خیال اس کے ذہن میں قوت حاصل کر رہا تھا۔ اور جس ہستی کی ذلت انگیز موت کا سامان پیدا کرنے میں وہ مسرت محسوس کرتا تھا۔ اب اس پر جان دینے کے واسطے بھی تیار تھا۔ حالات کی گردش پر ناچتی ہوئی انسان کی مجبور و معذور زندگی استقامتِ طبع کا دعوےٰ کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے؟

ماروت نے مضطربانہ پھولوں اور پتوں کو ہٹایا۔ اور دونوں اینٹیں اٹھا کر انہیں زور سے زمین پر دے مارا۔ اینٹیں بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر گھاس پر نظر آنے لگیں۔ اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے مکان کے اندر گیا۔ چند منٹ گذر گئے۔ پھر مکان سے نکلا۔ اور اپنی سابق محبوبہ کے مکان کی طرف چلنے لگا۔ وہاں پہنچکر خادماؤں کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ زہرہ کہیں باہر چلی گئی ہے۔ اتنا سنتے ہی اسے محسوس ہوا۔ کہ اس کے سینے میں آتشیں شعلہ بھڑک رہا ہے۔ وہ تیزی سے نیچے اترا۔ اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس کا ذہن عجیب عجیب خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اور جیسے ہی قصرِ احمریں کے قریب آیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

ہوا کے جھونکے تیزی سے چل رہے تھے۔ فضا میں ہلکا سا شور برپا تھا۔ ماروت دروازے پر پہنچ گیا۔ اچانک اسے قریب ہی قہقہوں کی آواز آئی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ چند شخص اندر گئے ـــــ مگر بہت جلد واپس آ گئے۔ اب ماروت نے اندر قدم رکھا۔ پہلی سیڑھی پر پہنچتے ہی اسے محسوس ہوا۔ کہ کوئی پرندہ اس کے قریب پھڑپھڑا رہا ہے۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یکایک اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ زہرہ اس کے قریب کھڑی ہوئی ایک زخمی چیل کو دیکھ رہی تھی۔ جو فرش پر خون میں شرابور پڑی تھی۔ زہرہ کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ زہرہ اس کے قریب آ کھڑی

ہوئی۔

"بہت بُرا شگون۔ میرے محبوب!" اس نے کہا۔

ماروت خاموش کھڑا تھا۔

"اچھا ہوا جو تم آ گئے۔ میں ڈر رہی ہوں۔ زخمی چیل ——!"

ماروت اب بھی خاموش تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں —— میں اپنا فرض ضرور انجام دوں گی —— تمہارے آنے سے میرا خوف جاتا رہا ہے۔"

ماروت قمیض میں ہاتھ ڈال کر سینے کے پاس کوئی چیز ٹٹولنے لگا۔

"تم باہر چلے جاؤ۔ دروازہ ابھی بند ہو جائے گا —— اس طرح گھور کیوں رہے ہو میرے محبوب!" اتنا کہکر وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ماروت جلدی سے اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اور ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ زمورت مبہوت و ششدر اُسے دیکھنے لگی دو تین لمحے گذر گئے۔ یکایک ماروت کے دوسرے ہاتھ میں خنجر چمکا اور زمورت کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ بدنصیب رقاصہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اور ایک زخمی پرندے کی طرح جو بالکل کمزور ولاچار ہو کر خود کو شکاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس نے زندگی کی حرارت سے محروم ہوتے ہوئے جسم کو ماروت کے بازوؤں کے سپرد کر دیا۔

"آہ ماروت!" یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے۔ اور یہ آخری الفاظ تھے۔ زخمی چیل تڑپتے تڑپتے ماروت کے پاؤں پر آ پڑی تھی۔ اور دردناک آواز پیدا کر رہی تھی۔ زمورت کے جسم نے آخری حرکت کی اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی حسین وجمیل آنکھیں جو ہر طرف نشہ بکھیرتی تھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ اس کا مخملیں، گدازاور خون میں شرابور جسم ماروت کے بازوؤں پر پڑا تھا۔ ہوا کی تیزی وتندی میں کافی فرق آ گیا تھا مغموم چاند حسرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ ماروت بے جان جسم کو بازوؤں پر اٹھائے دروازے سے باہر نکل کر دریائے فرات کی طرف چلنے لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے خنجر لاش کی پشت سے نکالا۔ اور اسے ایک طرف رکھ دیا —— پھر پانی میں کافی دور جا کر لاش کو پھینک دیا۔ خنجر کو دھویا۔ اور اسے قبا میں چھپا لیا درختوں کی لمبی لمبی شاخیں سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ ماروت نے ایک نظر پانی پر ڈالی۔ اور پھر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۹)

صبح جب سورج نکل چکا تھا۔ ہاروت کو قدرے ہوش آیا۔ فرطِ درد سے اس کا دماغ قریباً قریباً سن ہو چکا تھا۔ اور اعضا شل۔ بمشکل سر اُٹھا کر اس نے اپنے ارد گرد تھکی ہوئی حیرت زدہ نظر ڈالی۔ اور اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھ دیا۔ سر کے زخم سے خون بہہ کر اس کے چہرے، گردن اور کپڑوں پر جم گیا تھا۔ چند لمحے اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر خون کے زیادہ بہ جانے سے بےحد کمزور ہو چکا تھا۔ اس لئے لڑکھڑایا اور اس کا زخمی سر پھر پتھر سے ٹکرایا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ درد محسوس کر کے وہ بیہوش ہو گیا۔ کافی دیر تک اسے مطلقاً ہوش نہ آیا۔ اور جب ذرا ہوش آیا۔ تو خیالات کی رو اس کی نگاہوں کے سامنے عجیب غریب مناظر لانے لگی۔ وہ نیم بیہوشانہ حالت میں محسوس کرنے لگا۔ کہ اس کے ارد گرد گدھ منڈلا رہے ہیں۔ اور وہ ایک طرف جا رہا ہے یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گیا ہے۔ جہاں ایک سڑی ہوئی بدبودار عریاں لاش پڑی ہے۔ گدھ اپنی نوکدار، تیز چونچوں سے اسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اور فضا میں ان کی خوفناک چیخ پکار گونج رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگتا ہے۔ یکایک اس کے سر پر کوئی چیز آ کر گرتی ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہے۔ یہ ایک خون آلود گوشت کا ٹکڑا ہے۔ خوف و دہشت سے اس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر لیتا ہے۔ فضا میں جا بجا چیلیں اور گدھ اُڑ رہے ہیں۔ اور اُن کے ارد گرد سیاہ اور بھیانک غار کی تاریک فضا میں منڈلاتے ہوئے چمگادڑوں کی طرح نظر آ رہے ہیں اب وہ ایک غار کے منہ پر کھڑا ہے۔ ایک سیاہ بلی اس پر جھپٹتی ہے۔ وہ پیچھے ہٹ کر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر لڑکھڑاتا ہے ——— اور گر پڑتا ہے۔ اسے اپنے سینے پر بوجھ اور گردن میں شدت کا درد محسوس ہوتا ہے ——— اس کی نیم کشادہ آنکھیں دیکھتی ہیں۔ کہ وہ سیاہ بلی اس کی چھاتی پر بیٹھ کر اس کی گردن کا خون چوس رہی ہے۔ وہ چیخ مار کر اُٹھنا چاہتا ہے۔ مگر بلی کے تیز و ظالم ناخن اس طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئے ہیں اور کمزوری اس قدر ہے۔ کہ وہ ذرہ بھر حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کے کانوں میں برابر چپڑ چپڑ کی آواز آتی ہے۔ اور نظروں کے سامنے بلی کی خوفناک و شعلہ فشاں آنکھیں اپنی موت کا اسے پورا یقین ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کے مضطربانہ ہاتھ ایک اکڑی ہوئی چیز پر پڑتے ہیں۔ پھر خود میں زندگی کی حرارت محسوس کر کے آنکھیں کھول کر وہ اپنے پہلو کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ ایک عریاں سینہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہوں کے سامنے ریمنی کا عریاں سینہ آ جاتا ہے۔ وہ کانپ کر، ڈر کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

جب تک وہ پوری طرح ہوش حاصل نہ کر سکا۔ اسی قسم کے خوفناک تصورات اس کے ذہن میں آتے رہے۔ اسی قسم کے لرزہ خیز مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے پھرتے رہے۔ کئی گھنٹے گذرنے کے بعد اسے ہوش آگیا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر

دیکھنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چل کر وہ چشمے کے کنارے پہنچا۔ زخم کو دھویا۔ اور قمیص کا دامن پھاڑ کر اس پر باندھ دیا۔ گذشتہ واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ ان واقعات کی تہ میں کسی دیوتا کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

سورج کے غروب ہوتے ہی ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی۔ درخت سائیں سائیں کرنے لگے۔ وہ چشمے کے کنارے لیٹ گیا۔ رقاصہ سمیرا کا دلآویز چہرہ اس کے سامنے پھرنے لگا۔ اور اس کی تکلیف بہت حد تک دور ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ رقاصہ کی مسکراتی ہوئی آنکھیں جن میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنے چہرے کے قریب لے آتا ہے۔ رقاصہ کی مخمور نگاہیں معطر زلفیں اس پر نشہ کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ یہ تورات کے حصۂ اوّل کے تصورات تھے۔ اس کے بعد پھر وہی خوفناک، دہشت انگیز اور لرزہ خیز مناظر اس کے سامنے پیش ہونے لگے۔ منڈلاتی ہوئی چیختی ہوئی، لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہوئی گدھیں، سیاہ بلی کی شعلہ افشاں آنکھیں۔ اس کے سینے کی طرف بڑھتے ہوئے لمبے لمبے، تیز تیز ناخن۔ رہبانی کا عریاں بدن۔ یہ سب لرزہ خیز مناظر کسی صورت بھی اس کی نگاہوں سے دور نہیں ہوتے تھے۔

آخر کار وہ چیخ کر اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر مضمحل چاند، دم توڑتے ہوئے وحشی جانور کی بے نور آنکھ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک بے برگ و بار درخت کی سوکھی سوکھی ٹہنیاں مٹی کے تودے پر پڑی ہوئی یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا موت اپنے مجبور و بے کس شکار پر ہاتھ رکھ کر اپنی طاقت و قوت پر فخر کر رہی ہے۔ ندی کا پانی ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر یوں شور پیدا کر رہا تھا۔ گویا ارواحِ خبیثہ ایک ساتھ چیخ چیخ کر غار کے منہ سے نکل رہی ہیں۔ اس کے جوڑ جوڑ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ آخر کار رات جب دم توڑنے لگی۔ تو اس کی آنکھوں میں نیند آ گئی۔ اور وہ لیٹ کر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی۔ سورج کی تیز شعاعیں اس کے چہرے پر چبھ رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ پیاس کا علاج تو بالکل سہل تھا۔ مگر بھوک دور کرنے کا کیا انتظام ہو سکتا تھا۔ پہلے سیر ہو کر اس نے پانی پیا۔ اور پھر قدم اٹھانے لگا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ کدھر جا رہا ہے۔ آخر جب بہت دور چلا گیا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ غلط راستے پر چل رہا ہے۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور شام کی تاریکی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ وہ واپس چلنے لگا۔ مگر تاریکی میں قدم اٹھانا قریباً ناممکن تھا۔ وہ ایک پہاڑ کے دامن میں لیٹ گیا۔ اور گھڑیاں گننے لگا۔ تمام رات بے خوابی میں گذر گئی۔ صبح اٹھ کر اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ سمیرا کا پیارا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اور اس منظر نے اس کی تکلیف میں بہت حد تک کمی کر دی۔ شام کے قریب وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے شہر کی فصیل نظر آ رہی تھی۔ اس کے قدم تیزی کے ساتھ اٹھنے لگے۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا۔ کہ اس کے پاؤں پانی میں جا رہے

ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ دریائے فرات میں طغیانی آ گئی تھی۔ اور یہ اس کا اثر تھا۔ قریب ہی جھاڑی کے پاس لومڑ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ جھاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے سامنے چند ہڈیاں جن پر تھوڑا تھوڑا گوشت چپٹا ہوا تھا پڑی تھیں۔ یکایک فرط حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ ہڈیوں کے پاس "مادر بابل" کا مقدس "تمارہ" پڑا تھا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔ تصوّر نے اس کے سامنے ربّہ مئی کے عریاں سینے کا منظر پیش کر دیا۔ اس نے "تمارہ" اٹھایا۔ اور اسے تہ کر کے اندر سینے کے ساتھ باندھ دیا۔

(۱۰)

رقاصہ سمیرا کے حسن کی سحر طرازیوں، کرشمہ سازیوں اور عشوہ نمائیوں نے ماروت کے دل پر اس درجہ اثر کیا تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس وقت بھی، جبکہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دریائے فرات کے کنارے رقاصہ کے باغ میں ایک دلکش و رنگین قالین پر بیٹھا ہوا اپنی نئی محبوبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد رقاصہ ایک کنج سے ہرنی کی طرح نکلی۔ اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم کیا جانو میں تمہارے لئے کتنا بے قرار رہتا ہوں؟" ماروت نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں!"

"اس کا ثبوت؟"

"دیکھ لو۔ میں اپنے بے شمار چاہنے والوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟"

"تمہارے چاہنے والے؟ —— بھوکے کتے۔"

رقاصہ نے منہ پھیر لیا۔ شاخوں سے چند پھول توڑے۔ اور انہیں ماروت پر گرا دیا۔

"آج تو تم مجھے دیوتا بنا رہی ہو!" ماروت نے ہنس کر کہا۔

"میرے باغ میں بے شمار خوبصورت پھول ہیں —— ایک قسم کا پھول تو بے حد دلآویز ہے ——!"

"وہ کونسا پھول ہے؟"

"اگر تم کہو تو تمہارے لئے ایک پھول لاؤں؟"

"مجھے پھول کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ اس پھول کی خصوصیت سے تم واقف نہیں؟"

یہ کہہ کر رقاصہ اٹھی اور تیزی سے ایک طرف غائب ہوگئی۔ باغ کے ایک گوشے میں اُس کا خادم ہاتھ میں ایک پیالہ لئے کھڑا تھا جس میں پانی کی سطح پر ایک بڑا سا سُرخ پھول تیر رہا تھا۔ رقاصہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر خادم دو قدم آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر پیالہ اس کے قریب کر دیا۔ رقاصہ نے اچٹتی ہوئی نظر پیالے پر ڈالی۔ پھول کو پکڑا۔ اور واپس ماروت کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"اس میں کیا خصوصیت ہے، خوبصورت تو بہت ہے!"

"خوبصورتی ہی اس کی خصوصیت نہیں" یہ کہتے ہوئے رقاصہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ماروت نے اس کے زانوؤں پر سر رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے پر بکھری ہوئی سنہری زلفوں سے کھیلنے لگا۔

"سمیرا! مجھے وہ نغمہ نہیں سناؤ گی۔ جو اس دن تم نے تاجر عمانوس کے ہاں گایا تھا!"

"وہ نغمہ ——— ہاں سنو" رقاصہ کے لبوں سے ایک نہایت دلآویز نغمہ نکل کر فضا میں تیرنے لگا۔ ماروت ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ رقاصہ کے ہونٹ نازک پتی کی طرح جنبش میں تھے۔ وہ بھیگا ہوا پھول کبھی ماروت کے کانوں پر رکھتی تھی۔ اور کبھی اس کی آنکھوں پر۔ نوجوان کے چہرے پر جابجا قطرے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد رقاصہ چپ ہوگئی۔

"خاموش کیوں ہوگئیں" ماروت نے قدرے بے قرار ہو کر کہا۔

"اس لئے کہ جو کچھ مجھے کرنا تھا۔ وہ کر چکی ہوں!"

"کیا کرنا تھا تمہیں ——— یہ میری آنکھوں اور کانوں میں درد سا کیا ہونے لگا ہے ——— تم گائے جاؤ میری محبوبہ!"

"میں قدرے تھک گئی ہوں ——— اپنا سر اُٹھانا!"

"یہ میری زندگی کے زریں لمحات ہیں ———"

"میں تھک گئی ہوں ——— سر اٹھانا!"

رقاصہ نے اُس کا سر اُٹھایا۔ اور گھاس پر رکھ دیا۔

"درد ترقی کیوں کرتا جاتا ہے سمیرا!" ماروت نے آنکھوں کو زور سے ملتے ہوئے کہا!

"یہ درد ابھی ختم ہو جاتا ہے ---- اور اس کے ساتھ"!

"مگر یہ کیا ---- اندھیرا ---- اُف میرا دماغ پھٹا جاتا ہے سمیرا ---- سمیرا"!!

سمیرا دُور جا کر کھڑی ہو گئی ---- اور وہیں سے کہنے لگی "کیا تمہارا خیال تھا میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بدبخت انسان!"

"سمیرا ---- مجھے دھوکا دیا"!

"مجھے جو کچھ کام لینا تھا وُہ تم سے لے لیا ---- !"

"اس قدر دھوکا ---- مَیں اندھا ہو رہا ہوں ---- ذلیل عورت!"

"مَیں نے کچھ نہیں کیا ماروت! یہ پھُول کی خصوصیّت ہے"!

"مگر تم بھی زندہ نہیں رہ سکتیں!" یہ کہہ کر ایک زخمی درندے کی طرح وُہ بھاگا۔ مگر ایک درخت سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اس کے منہ آنکھوں اور کانوں سے خون بہنے لگا۔ رقاصہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے قریب پہنچی۔ اور جھک کر اسے دیکھنے لگی۔ ماروت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ رقاصہ نے تالی بجائی ---- فوراً دو تین ملازم آئے۔ اور ماروت کو اُٹھا کر لے جانے لگے ان کے جانے کے بعد وُہ پیشانی پہ ہاتھ رکھکر مغمومانہ کھڑی ہو گئی ---- اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فضا میں نکہت باآغوش جھونکے چل رہے تھے۔

(۱۱)

ہاروت نے غصے سے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کو توڑ ڈالا۔ اور اپنا ہاتھ مٹی کے تودے پر رکھکر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو اسے محسوس ہوا۔ گویا اس نے ایک بھیانک اور خوفناک خواب دیکھا ہے۔ مگر جب بیداری کا احساس ہوا۔ تو اس کے جسم کا ذرہ ذرہ عضو عضو اور ریشہ ریشہ غم و غصہ کی آگ سے جلنے لگا۔ اپنی محبوبہ کی گود میں دشمن کے سر کو دیکھنا کتنا رُوح فرسا، زندگی کش اور جگر گداز منظر ہے۔ اور یہ منظر اس کی آنکھوں نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا۔ کہ اس نے عورت کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ پہلی دفعہ شکست دینے والی زہرہ تھی ---- زہرہ جو چند سال پیشتر اس کی محبوبہ تھی۔ اور جو اسے یکلخت چھوڑ کر ماروت کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اور اب شکست دینے والی وُہ عورت تھی۔ جس کی فریب کاری کا خیال بھی اُس کے

ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی۔ کہ اس کا پہلا رقیب ـــــ اب بھی اس کا کامیاب رقیب تھا۔ ممکن تھا۔ وُہ باغ کی طرف لوٹ جاتا۔ اور کوئی خطرناک اقدام کر دیتا۔ مگر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"کیوں ہاروت! اپنی محبوبہ کی محبت کا اندازہ لگانا چاہتے ہو؟"

ہاروت نے اپنی دائیں طرف دیکھا کاہنہ طنز آمیز نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ "رقاصہ سمیرا کے جال میں پھنس کر تم نے مجھے سخت مایوس کیا۔ مگر آج تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ جس طرح بھنبھناتی ہوئی مکھیاں زخم پر بیٹھنے کے لئے بیتاب ہوتی ہیں۔ اسی طرح رقاصہ سمیرا بھی عزت و دولت کے لئے بے قرار ہے۔ تم نے کچھ سُنا؟ تمہاری سمیرا تمہارے دشمن ماروت کی محبوبہ بن چکی ہے۔"

یہ الفاظ سوئیاں بن کر ہاروت کے دل میں چُبھے۔

"اگر میں تم کو اس کا ثبوت بھی ـــــ"

"مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"

"اور پھر بھی ـــــ ہاروت تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اس کے جواب میں ہاروت نے گھور کر کاہنہ کی طرف دیکھا۔

"کیا اب بھی تم اس ذلیل عورت سے انتقام نہیں لوگے۔ سوچو کس طرح اس نے محترم کاہن کو بے عزتی کے ساتھ ہلاک کیا۔ اور پھر کس طرح تمہاری محبت کو ظالمانہ فریب دیا۔ بیوقوف نوجوان! کیا تمہاری رگوں میں خون نہیں کھولتا۔ تمہارے ہاتھ اس مکار عورت کی گردن دبوچنے کے لئے بے قرار نہیں؟ میں بوڑھی عورت ہوں۔ مگر اس کے فریب کو دیکھکر میری بوڑھی رگوں میں غم و غصہ کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ مگر تم خاموش کھڑے ہو!"

ہاروت کے سامنے خون اچھلنے لگا۔ اور اس کے قدم خود بخود اُٹھنے لگے۔

"مگر ٹھہرو میرے بیٹے!" اب اس کا لہجہ نرم تھا۔ "عجلت سے کام نہ لو۔ پہلے میری بات کا جواب دے لو۔"

"مجھے چھوڑ دو ـــــ چھوڑ دو منحوس عورت!"

"صرف چند لمحے ٹھہرو! ابھی میرے بوڑھے ہاتھ بھی تمہارے ساتھ اس ذلیل رقاصہ کی گردن کو دبوچ رہے ہونگے

— میں تمہیں سچ کہتی ہوں — رب الشمس کی قسم کھا کر کہتی ہوں — مگر پہلے ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے۔ کہ تمہیں دھوکا دینے والی عورت بابل کی ذلیل ترین موت مرے؟ یقیناً تمہاری یہ خواہش ہے!"

ہاروت کے قدم رُک گئے۔ کاہنہ کے کمزور و ضعیف ہاتھوں نے اُس کے بازوؤں کو اس طرح پکڑ رکھا تھا۔ گویا سانپ درخت کی موٹی موٹی ٹہنیوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔

"رب الشمس کی قسم ہم رقاصہ کو ذلیل ترین موت ماریں گے۔ مگر یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ثمارہ —!"

"ثمارہ؟" ہاروت کے لبوں سے نکلا۔ فرطِ غم و غصہ سے اسے یہ خبر بھی نہ رہی تھی۔ کہ ثمارہ اس کے سینے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وُہ اس حالت میں سمیرا سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وُہ ربیقی کے معبد کی طرف اس راستے سے جا رہا تھا۔ جہاں رقاصہ کا باغ تھا۔ اور غیر ارادی طور پر اس کی نگاہوں نے یہ روح فرسا منظر دیکھ لیا تھا۔

"تمہیں سب کچھ معلوم ہے میرے بیٹے! پھر بتانے سے کیوں دریغ کرتے ہو۔ کیا اس ذلیل سلوک پر بھی سمیرا سے محبت کرتے رہو گے۔ اگر یہ بات ہے۔ تو تم انتہائی بے غیرت انسان ہو!"

"خاموش رہو — نہیں"

"میرا گمان بالکل درست ہے۔ تمہارے عضو عضو میں غصے کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔"

"ثمارہ موجود ہے۔" یہ سن کر کاہنہ کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اُٹھیں۔ "کہاں ہے؟"

"میرے پاس!"

"تو وہ — میرے عزیز بیٹے!"

ہاروت نے بے اختیارانہ ثمارہ نکال کر اس کے سامنے رکھدیا۔ اندھیرے میں اس کے موتی چمکنے لگے۔ کاہنہ نے ثمارہ جلدی سے اٹھا لیا۔ اور کہا۔ کل صبح رقاصہ کی زندگی ختم ہو جائیگی — میرے پیارے بیٹے رب الشمس تم پر ہمیشہ خوش رہے گا۔ چلو اب گھر چلیں!"

"میں گھر نہیں جاؤنگا!"

"میرے عزیز بیٹے! سب کام میرے سپرد کر دو — تم اپنے گھر جاؤ! صبح دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

کاہنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دونوں اندھیرے میں ایک طرف غائب ہو گئے۔

(۱۲)

آج پھر عیش پسند دولت مند تاجر عمانوس نے اپنے احباب و رفقاء کو محفلِ عشرت میں مدعو کیا ہوا تھا۔ وسیع میدان میں انسانی زندگی غمِ امروز کو بالکل فراموش کر کے فکرِ فردا سے یکسر بے نیاز ہو کر جی کھول کر دادِ عیش دینے میں مصروف تھی۔ طرح طرح کے کھیل کود ہو رہے تھے۔ پے بہ پے شراب کے جام چل رہے تھے۔ اور رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ مسرتوں، خوشیوں اور عیش پرستیوں کے ہجوم میں صرف چند چہرے ایسے نظر آتے تھے۔ جو مضطرب و بیقرار تھے۔ مضطرب و بے قرار چہروں والے کون تھے۔ ہاروت، شمرطی اور کاہن شمیل۔ ہاروت دور ایک گوشے میں کھڑا ٹکٹکی باندھے رقاصہ سمیرا کو دیکھ رہا تھا۔ کاہن شمیل اور شمرطی رقاصہ سے کچھ فاصلے پر کھڑے سرگوشی کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میدان کا درمیانی حصّہ خالی کر دیا گیا۔ اور رقاصہ سمیرا نے اپنا بہترین رقص شروع کیا۔ لوگوں پر جادو سا چل گیا رقص کے دوران میں رقاصہ کی نگاہیں ہاروت کی نگاہوں سے ملیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے رقص ختم کر دیا۔ اور ایک گوشے کی طرف چلی گئی۔ پھر دَور پر دَور چلنے لگا۔ مگر اب کئی لوگ شمرطی اور کاہن شمیل کے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ ہاروت اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا، سیڑھیوں پر چڑھ کر اس جگہ کھڑا ہو گیا۔ جہاں رقاصہ سمیرا نے چند دن پیشتر کاہن اسرائیل کو دھکا دے کر ہلاک کیا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اپنے خیالات میں محو تھا۔ کہ قریب ہی سے شیریں آواز آئی۔

"ہاروت!"

ہاروت نے پلٹ کر دیکھا۔ رقاصہ سمیرا اس کے قریب کھڑی تھی۔

"تم ہو مکار عورت!"

رقاصہ نے متحیرانہ ہاروت کو دیکھا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"ابھی سمجھ جاؤ گی؟"

"آج تم مغرور لہجے میں بول رہے ہو ہاروت! کیا بات ہے؟"

"ابھی گھبرا گئیں — وہ ذلت —"

"ذلت، کونسی ذلت — تمہارا دماغ چل گیا ہے!"

"یہی سمجھ لو!"

"ہاروت! شاید تم بھول گئے ہو کہ میں کون ہوں؟"

"میں جانتا ہوں تم کون ہو —— اور یہ بھی جانتا ہوں۔ کہ ابھی تم کیا بن جاؤ گی!"

"میں کیا بن جاؤنگی؟"

"ابھی ظاہر ہو جائے گا۔ تم نے مجھے انتہائی ذلیل فریب دیا۔ اب میرے انتقام کے لئے تیار رہو!"

"میں نے کونسا انتہائی ذلیل فریب دیا؟"

"کیا تم نے مجھے نہیں کہا تھا۔ کہ ہمیشہ تمہاری رہونگی؟"

"تو اب بھی میں یہ کہتی ہوں میرے ہاروت! میں تمہاری ہوں۔ ہمیشہ تمہاری رہوں گی!"

"تو ماروت کے لئے کون ہے۔ کس کا دل وجگر اس کے لئے وقف ہے؟"

"ماروت ——؟ اوّل تو میں اسے اپنا دشمن سمجھتی رہی ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہے۔ کہ وہ مر چکا ہے!"

ہاروت نے گھور کر رقاصہ کو دیکھا۔ "مر چکا ہے؟"

"ہاں۔ اُس کی لاش میرے باغ میں دفن ہے۔ اگر تم دیکھنی چاہو۔ تو ابھی دیکھ لو۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم —— میں نے کل اس کو تمہاری گود میں دیکھا ہے!"

رقاصہ نے اپنے بازو ہاروت کی گردن میں حائل کر دیئے اور کہنے لگی "میرے ہاروت! تمہیں سخت غلط فہمی ہوئی ہے میں ماروت کو اپنے جال میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں مجھے اپنی سب سے بڑی دشمن زمورت کو ہلاک کروانا تھا۔ اور میں اس مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں —— اس وقت دونوں مُردہ ہیں!"

"زمورت بھی؟؟"

"زمورت بھی ہلاک ہو چکی ہے۔ اور اُس کا ذلیل چاہنے والا بھی۔ بس اتنی سی بات پر تم نے اتنا قابلِ نفرت لہجہ اختیار کیا؟"

"ہاروت کو ایسا محسوس ہؤا۔ کہ کوئی بلند عمارت سمع خراش شور پیدا کرتی ہوئی منہدم ہو گئی ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر سیڑھیوں کے نیچے لوگ سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

"اب تک میں نے تمہیں سے محبت کی۔۔۔ اور تمہیں سے محبت کرتی رہوں گی!" رقاصہ نے کہا۔

لوگوں کی نظریں گھور گھور کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ رقاصہ نے ہاروت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ میری بات پر اعتبار نہیں؟"

"یہاں سے چلو۔۔۔ لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں" ہاروت نے کہا۔ اور رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے چلنے لگا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں سمیرا نے درخت کی ٹہنی سے کاہن امرائیل کے بال باندھے تھے۔ بال ابھی تک موجود تھے۔ ہاروت نے شاخ کو۔۔۔ شاخ پر لپٹے ہوئے بالوں کو دیکھا۔ اور کاہن کی خوفناک پیشگوئی اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

"تم خوفزدہ کیوں ہو ہاروت؟"

"خوفزدہ۔۔۔؟ ہاں"

"وہ کیا ہے۔۔۔ کاہن کے بال"۔۔۔ رقاصہ نے ڈر کر اپنا چہرہ ہاروت کے بازو کے قریب کر دیا۔

"سمیرا چلو۔۔۔ سخت خطرہ ہے؟"

خطرہ کونسا۔۔۔ لوگوں کو ماروت کی ہلاکت کا پتہ نہیں چل سکتا۔۔۔ اُس کی لاش اسی وقت دفن کر دی گئی تھی!

"یہ کیا۔۔۔ لوگ آ رہے ہیں۔ جلدی چلو سمیرا!"

"تم ڈرتے کیوں ہو؟ فکر کی کوئی بات نہیں!"

"تم انتہائی خطرے میں ہو میری سمیرا۔۔۔ انتہائی خطرے میں۔ مادر بابل کے ستارہ کی چوری کا الزام تم پر لگایا گیا ہے!"

"یہ ذلیل افواہ ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو!"

"مگر یہ الزام ثابت ہو جائے گا! ستارہ تمہارے گھر ہی سے برآمد کیا گیا ہے۔۔۔ کتنا بڑا ظلم!"

رقاصہ ایک بت کی طرح خاموش، ساکت وصامت کھڑی ہو گئی۔۔۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"میری سمیرا چلو اب جان بچائیں۔ بابل کے بھیڑیئے ہمیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔۔۔!"

سمیرا ساکت و صامت کھڑی تھی۔

"میں نہیں کیونکر بتاؤں۔ کہ اس ظلم میں میں نے سب سے بڑا حصّہ لیا ہے؟"

"تم نے ۔۔۔ ہاروت؟"

"ہاں ۔۔۔ سمیرا! غلط فہمی نے ہمیں موت کے غار میں دھکیل دیا ہے!"

رقاصہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لوگوں کا شور اب بڑھ گیا تھا۔ اور چند تو ان میں سے قریب بھی پہنچ گئے تھے۔

"چلو سمیرا"۔

مگر سمیرا نے کوئی حرکت نہ کی۔

"ذلیل چور پر لعنت" کہتے ہوئے لوگ ان کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ کاہن شمیل کے ہاتھ میں ثمارہ چمک رہا تھا۔

"بدبخت رقاصہ تو نے مقدس ثمارہ چرایا ہے!" یہ آواز کاہن شمیل کی تھی۔

رقاصہ اب بھی خاموش بے جان مورتی کی طرح کھڑی تھی۔ ہاروت نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔

"تو ثمارہ کی چور ہے ذلیل ترین عورت!" یہ الفاظ کہنے والی شمرطی تھی۔ مجمع رقاصہ کی طرف بڑھنے لگا۔

"وہیں ٹھہرو ۔۔۔ ہاروت نے گرج کر کہا۔ "ثمارہ اس نے نہیں چرایا"۔

"تم کون ہو؟" مجمع سے غضبناک آوازیں آئیں ۔۔۔ "چوری ثابت ہو چکی ہے"۔

"خبردار! آگے کوئی نہ بڑھے ۔۔۔ چور یہ نہیں ۔۔۔ میں ہوں ۔۔۔ میں ہاروت!"

مجمع میں سے قہقہے کی آواز آئی۔

"پاگل نہ بنو بیٹے!" یہ آواز شمرطی کی تھی۔ جو اس نے ہاروت کو مخاطب کر کے کہی تھی۔

"چور کو چاہِ بابل کی طرف لے چلو ۔۔۔" غضبناک آوازیں کہتی ہوئی سنائی دیں۔

ہاروت نے رقاصہ کو بازوؤں پر اٹھا لیا ۔۔۔ رقاصہ نے اشک بھری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ ہاروت!"

"چور رقاصہ کو پکڑتے کیوں نہیں؟" یہ الفاظ سنتے ہی مجمع بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھا۔ اور دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ چند

اس کے بعد ایک طرف کاہن شمیل اور شمرطی نے رقاصہ کے سنہری بالوں کو پکڑا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف چند آدمیوں نے ہاروت کو جکڑا ہوا تھا۔!

"اب انتظار کس کا ہے؟" مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ کاہن اور شمرطی نازنین رقاصہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ وہ منظر کس قدر دردناک تھا۔ رقاصہ چیخ رہی تھی۔

ہاروت نے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور تیزی سے سمیرا کے پاس پہنچا۔ کاہن کو ایک طرف گرا دیا۔ اور شمرطی کے سینے پر اس زور سے گھونسا مارا کہ وہ لڑھک کر گر پڑی۔ اور وہیں ٹھنڈی ہو گئی ——— مجمع مغلوب الغضب ہو کر ہاروت پر ٹوٹ پڑا۔ بہادر نوجوان اب بھی شیر کی مانند وحشی انسانوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے رقاصہ کو اٹھایا مگر کسی نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ اس نے ایک ہاتھ خنجر پر رکھ دیا۔ اور دوسرا اپنی محبوبہ پر۔ مگر یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ لوگوں نے اسے دھکا دے دیا۔ گر کر وہ اٹھا۔ سینے سے خنجر نکالا۔ اور محبوبہ کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر بے ہوش ہو کر گر پڑا ——— اس کی محبوبہ کی چیخیں اس طرح اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ گویا کوئی بہت دور غار میں سے چلّا رہا ہے۔

کئی گھنٹوں کے بعد اسے ہوش آئی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اور ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ہی شمرطی کی لاش پڑی تھی ——— لوگ اس کی محبوبہ کو لے جا چکے تھے۔ وہ بے تابانہ عانوس کے اصطبل میں پہنچا۔ اور گھوڑے پر چڑھ کر چاہ بابل کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاہ بابل کے قریب کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بعجلت گھوڑے سے اترا۔ اور چاہ بابل کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ یکایک اس کی نظر پاس ہی ایک شاخ پر پڑی جس کے ساتھ رقاصہ کے سنہری بالوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔

سلاخوں کے ساتھ پیشانی لگا کر اس نے آواز دی۔ "سمیرا!"

"ہاروت!" نیچے سے رقاصہ کی کمزور آواز آئی۔ ہاروت کے مضطرب ہاتھ سلاخوں کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ مگر ان میں ذرہ بھر جنبش پیدا کرنا بھی انسانی طاقت سے باہر تھا۔ "ہاروت"! کنوئیں کی تہ سے دوبارہ آواز آئی۔

ہاروت نے زخمی بازوؤں سے سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی ——— اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس کے سینے کا زخم زیادہ پھٹ گیا۔

اس نے آخری بار زور لگایا۔ اور پیکر مردہ ہو کر گر پڑا
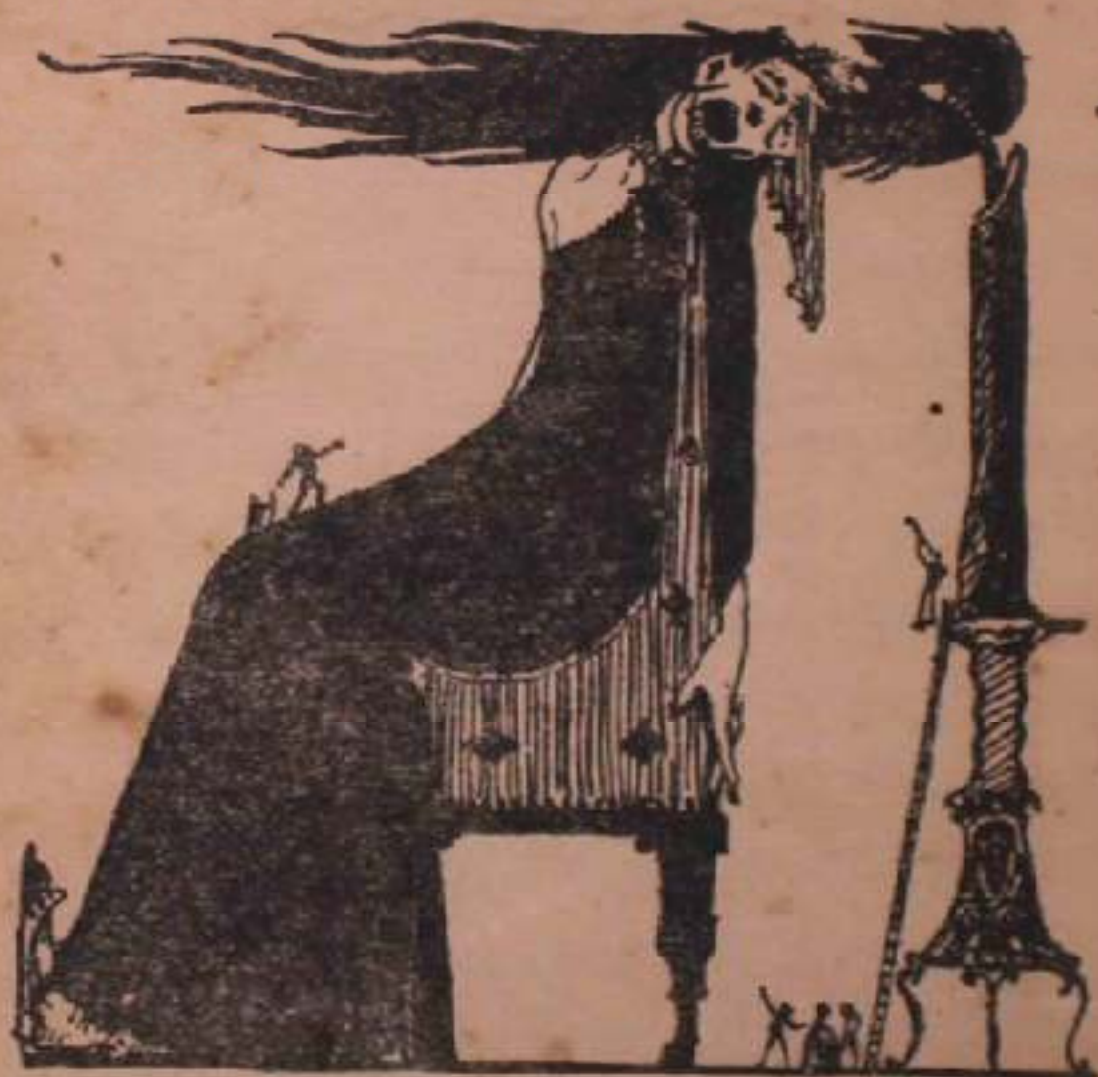
صحرانورد کا چھٹا خط

میرے دوست ————————————————!!

مجھے اعتراف ہے۔ کہ اب کے میں نے وعدہ ایفائی میں کسی قدر تاخیر سے کام لیا ہے۔ تمہیں اس کے متعلق شکایت ہوگی ——— اور شکایت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جیسا کہ تمہاری تحریروں سے مترشح ہے۔ تمہیں میرے بھیجے ہوئے "رومانوں" سے بہت دلچسپی ہے۔ اور جن چیزوں سے دلچسپی ہو۔ ان کے حصول میں معمولی سی تاخیر بھی ناخوشگوار ہوتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں تمہاری شکایت بجا ہے۔ مگر دوست! ذرا یہ بھی تو دیکھو۔ میں کہاں ہوں؟ کن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہوں؟ تم شہر میں ہو جہاں ہر سہولت کا میسر آجانا ایک ایسا امر ہے جسے شہری زندگی کا ادنیٰ ترین کرشمہ کہنا چاہیئے۔ میں صحرا میں ہوں۔ جہاں ہر ضرورت کا پورا ہو جانا ایک ایسی چیز ہے جس کا تصور بھی صحرائی زندگی کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس صورت حالات میں میری طرف سے ہر قسم کی معذرت تمہاری قبولیت کے شرف سے کیوں محروم رہے؟

میں نے گذشتہ خط میں لکھا تھا۔ کہ میرا رفیق سفر آغا بہرام پاؤں کے زخم کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اور اس کے ساتھ میں نے یہ بھی تحریر کیا تھا۔ کہ وہ تحریر دہ روبصحت ہے۔ میں سمجھا تھا۔ کہ اب خدشے کی کوئی بات نہیں مگر تقدیر جو ہر قدم پر انسان کی کمزور زندگی اور اس کی حقیر کوششوں کا مذاق نہ اڑائے، تقدیر کیونکر کہلائی جا سکتی ہے؟ بدقسمتی سے میرا رفیق سفر پھر زخمی ہو گیا۔ ایسے موقعے پر میری پریشانی کا کیا عالم ہو سکتا ہے؟ یہ تم بخوبی جانتے ہو۔ خدا خدا کر کے اب اس کی حالت درست ہو گئی ہے۔ گذشتہ دنوں میں جبکہ ہم ہر وقت ایک جگہ بیٹھے رہتے تھے۔ تمہاری دلچسپی کا سامان وافر پیدا ہوتا رہتا تھا۔ آغا بہرام نے کئی رومان مجھے سنائے ہیں۔ اور ہر رومان نہایت ہی دلچسپ۔ نہایت دلآویز!

میرا ہمسفر جیسا کہ تم جانتے ہو۔ مجھ سے زیادہ "رومان" کا دلدادہ ہے۔ اور یہ اسی "شیفتگی و دلدادگی" کا نتیجہ ہے۔ کہ میں آج ایک دلآویز "رومان" بھیج رہا ہوں۔ آغا بہرام کا بیان ہے۔ کہ عالم شباب میں وہ ہر روز شام کو اپنے مکان سے کچھ دور ایک شاداب وادی میں چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا مطرب اُسے اور اس کے ساتھیوں کو عجیب و غریب داستانیں سنایا کرتا تھا۔ آغا بہرام نے ان میں سے سات داستانیں مجھے سنا دی ہیں۔ اور میں یقین و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ تمام کی تمام میرے بھیجے ہوئے "رومانوں" سے زیادہ دلچسپ ہیں ——

امید ہے۔ تمہارا ذوقِ سلیم بھی میری تائید کریگا۔ آج پہلی داستان بھیج رہا ہوں۔ اس طرح باقی چھ داستانیں بھی تمہارے پاس پہنچ جائینگی!

یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ میرے متعلق بھی ہے اور تمہارے متعلق بھی۔ اب جو لکھتا ہوں۔ اس کا تعلق میری ذات سے ہے۔ میرے دُور افتادہ دوست! تمہیں کیونکر بتاؤں کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں؛ میرے احساسات میرے احساسات ہیں۔ تمہارا ذہن ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اور کیوں نہ قاصر ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان ایک دنیا حائل ہے۔ تم کائنات کے ایسے خطے میں ہو۔ جو شہر ہے۔ جہاں زندگی بجلی کے رنگین قمقموں، آبادی کے مختلف ہنگاموں اور تہذیب و تمدن کی گوناگوں برکتوں میں قہقہے لگا رہی ہے میں کرۂ ارض کے ایسے گوشے میں ہوں جو صحرا ہے۔ جہاں زندگی سورج، چاند اور ستاروں سے جھلکتی ہوئی فضا میں ایک "رومانی خواب" بنی ہوئی ہے فرق ظاہر ہے۔ ہر روز طویل مگر دلچسپ مسافت کے بعد جب ہم شب بسری کے لئے ایک جگہ خیمہ زن ہوتے ہیں۔ تو میں صحرا کی لامحدود فضا میں، دور کہیں نگاہیں جما کر خود کو ایک ایسی کیفیت کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جس کا تجزیہ میری قوتِ تحریر اور وسعتِ زبان سے باہر ہے! مغرب کی جانب جب تاریکیٔ شب اپنے لمبے لمبے خوفناک ناخنوں سے آفتاب کے سینے کو چیر ڈالتی ہے۔ اور پھر اس آغشتۂ بخون نعش کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ تو میں حیران ہوتا ہوں۔ کہ یہ صحرا کی دنیا کیسی دُنیا ہے۔ یہاں آبادی نہیں پھل دار درخت نہیں۔ شہر کے ہنگامے نہیں۔ مگر اس کے باوجود اس میں اتنی جاذبیت کیوں ہے؟ یہ دنیا، یہ ہر طرف پھیلے ہوئے چمکتے ہوئے ذرات، ریگ کی دنیا۔ یہ بڑے بڑے وحشت انگیز دہشت ناک تودوں کی دنیا، یہ سوکھے سوکھے، لمبے لمبے بدنصیب درختوں کی دنیا، کیوں اتنی دلآویز۔ کیوں اسقدر رومان پرور۔ کیوں اس درجہ حسین دنیا ہے؟ میری زندگی دنیائے رومان کا ایک سحر آلود خواب بن جاتی ہے۔ دل سے پوچھتا ہوں۔ ان ذروں کے سینے پر کیا کچھ ہوا ہوگا؟ عشق و محبت کے کیسے کیسے خونناک کھیل کھیلے گئے ہونگے۔ جانبازی کے کون کون سے مظاہرے کئے گئے ہونگے۔ اور پھر موت کے پنجے میں کس کس اذیت سے انسانوں نے جان دی ہوگی۔ یکایک میرے سامنے عالمِ تصور میں عجیب عجیب مناظر رونما ہوتے ہیں۔ اور میں گھنٹوں خاموش، بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہوں۔ اس عالمِ کیف میں میرے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ کہ کاش اس صحرا۔ وحشت و دہشت کو پالنے والی اس مہیب دنیا میں حسن و عشق کا ایک ایسا خونی کھیل بھی کھیلا جائے۔ جس میں ہیرو کے فرائض میں ادا کروں؟ اس وقت جبکہ حسن کی نگاہیں میرے عشقِ جنوں پرور پر مہربان ہو جائینگی۔ میں اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی سمجھونگا۔ انہی خیالات کے طلسم میں میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ میرا سر ایک نازنین آغوش میں ہے —— یہی خواب تمام رات میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے میں دیکھتا ہوں۔ کہ رات کی ملکہ چاند کی بجھی ہوئی مشعل ہاتھ میں لئے عدم کے غار میں داخل ہو رہی ہے۔ پھر ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔ وہ سفر جسے کبھی بھی ختم نہیں ہونا چاہئے!

جوشِ جنوں میں میں نے بہت کچھ لکھ دیا ہے! اب میں پھر رومان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے۔ کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ تو میں ذرہ بھر تامل کئے بغیر کہہ دونگا۔ "انسان" کون شخص اس سے انکار کرسکتا ہے۔ کہ انسانیت کی چھاتی پر انسانوں ہی نے چرکے لگائے ہیں۔ فطرت کی تباہ کاریاں انسانوں کے خون کی ندی بہانے پر ہی اکتفا کرتی ہیں۔ مگر جب انسان کی فطری بربریت انسانوں کا خون بہانے پر تل جاتی ہے۔ تو دنیا کے ہر گوشے میں خون کے دریا بہنے لگتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ طاقتور اور کمزور انسانوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ سنگدل فتحیابوں اور بدنصیب مظلوموں نے کون سا نظارہ پیش کیا ہے۔ اور پھر بہادر افواج نے متمدن ممالک کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے؟ کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہو۔ کہ فتح کی صبح اس وقت نمودار ہوتی ہے۔ جب بے شمار انسانوں کی قیمتی زندگیاں موت کی تاریکی میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہیں یا تم اس امر سے انکار کرسکتے ہو کہ صرف ایک انسان کی عظمت کے چراغ کو روشن کرنے کے لئے بے تعداد انسانوں کے خون کو تیل بنا دیا جاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے چلے آرہے ہیں۔ تکوینِ کائنات سے لیکر ابتک انسانوں ہی کے ظلم کا سیلِ بے پایاں انسانیت کے زخمی سینے سے ٹکرا رہا ہے۔ اور ہمیشہ سے بربریت کے علمبردار انسان بے گناہ انسانوں کی خونچکاں لاشوں کو روندتے ہوئے فتح کے دروازے تک پہنچے ہیں۔ چنگیز، ہلاکو، سکندر، ہملکار، ہنی بال، بخت نصر، طیطس، ابیز، تیمور اور نادر موت کی آگ کے خوفناک شعلے۔ تباہی کے سمندر کے بھنگیں طوفان اور بربادی کی آندھی کے ہلاکت آغوش جھونکے بن کر آباد و شاداب کرۂ ارض پر آئے۔ اور شہروں کو خاکستر کے تودے، آبادیوں کو لق و دق صحرا اور بارونق ملکوں کو ہولناک قبرستان بنا کر عدم آباد کو چلے گئے۔ ہن قوم نے بھی اپنی ظالمانہ شوکت کا مظاہرہ کیا۔ تم اس قوم کے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ یہ خانہ بدوش قوم ۳۷۲ء سے ۴۵۵ء تک یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں اپنے وحشیانہ مظالم سے انسانیت کو چھلنی کرتی رہی جیسا کہ تمہیں خبر ہے۔ یہ قوم دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک فرقہ یورپ بر اعظم میں داخل ہوا۔ اور قیصر وینٹر کی زیرِ قیادت دریائے والگا اور دریائے ڈینیوب کے درمیان پھیلتا رہا۔ ویلنٹر کے بعد "اٹیلا" نے اس کی قیادت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ اور اسے اتنا طاقتور بنا دیا کہ روما اور قسطنطنیہ کے دربار اس کے جنگجویانہ حملوں سے خائف تھے۔

دوسرا فرقہ "سفید ہن" جو ایشیا میں داخل ہوا۔ زیادہ عرصے تک ظلم و ستم کرتا رہا۔ "تورمان" اور "مہرگل" کے مظالم تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ یہ رومان جو میں بھیج رہا ہوں۔ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ ایک ظالم و طاقتور ہن "بلامیر" نے ایران کے سرحدی صوبے "بلخ" پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اور اہلِ بلخ پر عرصۂ حیات تنگ ہوچکا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے اس میں کہیں کہیں تغیر و تبدل کردیا ہے۔ اور اس سے میرا مطلب دلچسپی میں اضافہ ہے —— دوسرا رومان "مستقبل قریب" میں بھیجونگا! تمہارا —— "صحرانورد"

—— (۱) ——

بوڑھا نادر اپنی ہشت سالہ بچی "شیریں" کی انگلی پکڑے "بلخ" کے جنوبی حصے کے وسیع میدان میں آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی کا دور دورہ تھا۔ اُدھر مغربی آسمان کے ہونٹ آفتاب جہاں تاب کے خونِ حیات کا آخری قطرہ تک چوس چکے تھے اور اِدھر دن کی آخری مضمحل روشنی تاریکیوں کے عفریتی پنجوں میں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے ہل کر سائیں سائیں کی آواز پیدا کرتے ہوئے درخت تاریکی کے اس سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوبتے جا رہے تھے۔ اس ہولناک سماں میں نادر اور شیریں گھر کی طرف رواں تھے۔

بوڑھا نادر ایک غریب نقاش تھا۔ جو ہر روز صبح سے لے کر شام تک اپنے گھر سے بہت فاصلے پر ایک چھوٹی سی دکان میں برتنوں پر نقاشی کیا کرتا تھا۔ یہ کام جہاں اس کے لئے ذریعۂ معاش تھا۔ وہاں ذریعہ دلچسپی بھی! کبھی کبھی وہ اپنی اکلوتی بچی —— اپنی آنکھوں کے روشن تارے "شیریں" کو بھی دکان پر لے آتا تھا۔ آج بھی شیریں دن بھر دکان پر رہی تھی۔ اور اب باپ کے ساتھ گھر کو جا رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ ایک چھوٹی سی ندی کے قریب پہنچ کر شیریں نے اپنی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے باپ کو اس انداز سے دیکھا۔ گویا کچھ پوچھ رہی ہے۔ بوڑھے نادر کے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں اس طرح نمودار ہوئیں۔ گویا گدلے پانی کی سطح پر سورج کی آخری شعاعیں لرز رہی ہیں۔ اس نے جھک کر اپنا دوسرا ہاتھ اُسکے سر پر رکھ دیا۔ اور شفقت انگیز لہجے میں پوچھا:۔

"کیوں شیریں! تھک گئی ہو؟"

"نہیں ابا" ننھی شیریں نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر کس کا بیٹی! یہاں کون ہے؟"

بچی باپ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُس کے لبوں سے نکلا "جن" ابا!

"یہاں جن کہاں؟ پاگل ہو گئی ہے بچی!" بوڑھا ذرا ٹھہرا اور پھر کہنے لگا۔ "جلدی چلو، امی تمہاری منتظر ہو گی!"

دونوں چلنے لگے۔ بوڑھے نادر کی رفتار اب پہلے کی نسبت تیز ہو گئی تھی۔ اور ننھی شیریں بار بار اپنی پیشانی اور رخساروں پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے باپ کے قدموں کے ساتھ قدم ملا رہی تھی۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے ہونگے۔ کہ ان کے پاس سے ایک سایہ گزرا۔ ننھی شیریں باپ سے چمٹ گئی۔

"کیا ہوا؟" بوڑھے نادر نے پوچھا۔

"وہی ہیں"

"تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو" نادر نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر، بھویں سکیڑتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "کمینے، ذلیل، بد فطرت جن یہاں نہیں آسکتے، چلو!"

ننھی خاموش رہی۔ اس طرح باپ سے چمٹی ہوئی وہ یوں نظر آرہی تھی۔ گویا ایک چھوٹا سا پودا ہوا کے تند جھونکوں سے تاب مقابلہ نہ لا کر ایک سوکھے سے درخت کے ساتھ لگ گیا ہے۔ یکایک بچی کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے قریب دو خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بوڑھے لکڑہارے نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ صورت حالات سے واقف نہ تھا۔

ہوا میں اب زیادہ تندی، زیادہ تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ستارے چمک رہے تھے۔ بوڑھا نادر تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ ایک تو بوڑھا دوسرے دن بھر کی تھکاوٹ۔ کچھ دور جا کر اس کے قدم ہلکے پڑ گئے۔ ننھی شیریں آنکھیں بند کیے باپ کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔

"تم تو ــــ یونہی ڈر جاتی ہو شیریں!" نادر نے کسی قدر ہانپتے ہوئے کہا۔

شیریں نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر خاموش رہی۔ بوڑھا چلتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بچی کو گود سے اتارا۔ اور اس کی انگلی پکڑ کر مکان کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ دروازہ کھلا تھا۔ نادر کی آنکھوں میں آثار حیرت پیدا ہوئے۔ اور اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر قدم رکھا۔ شیریں تیزی سے اندر چلی گئی۔ اور اس کی "امی! امی!!" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ اندر قیامت کا اندھیرا تھا۔

"سائرہ!" بوڑھے نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی شیریں کی آواز آئی۔ "امی! تو کہاں ہے؟" چند لمحوں کے بعد نادر نے پھر "سائرہ" کہتے ہوئے آواز دی۔ مگر اس کے جواب میں بھی "امی! تو کہاں ہے؟" سنائی دیا۔

نادر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے ناخن دیوار کی کچی مٹی میں دھنستے جا رہے تھے۔

"شیریں! تو دیا کیوں نہیں جلاتی!" نادر نے کہا۔ اور دیوار کو چھوڑ کر ایک طرف چلنے لگا۔ یکایک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ پیچھے ہٹا اور شیریں کو آواز دی۔ "کہاں ہو تم شیریں! جلدی دیا جلاؤ!"

تاریک فضا میں کھڑ کھڑ کی آواز پیدا ہوئی۔ نقاش آگے بڑھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، گویا کسی نرم چیز پر کھڑا ہے۔

ننھی شیریں دیا لئے ہوئے آئی۔ فضا میں روشنی کا ننھا سا دائرہ تاریکی کے جبڑوں میں تھرتھرانے لگا۔

"امی کہاں ہے ابا!" شیریں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ یکایک اس کی نگاہیں باپ کے پاؤں پر جم کر رہ گئیں۔ منہ کھل گیا۔ اور ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ نادر نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ۔۔۔۔۔ وہ اپنی خون آلود بیوی کے سینے پر کھڑا تھا ۔۔۔۔۔!

بچی کے ہاتھ سے چراغ گر پڑا۔ اور وہ امی کہتی ہوئی ماں کی نعش سے چمٹ گئی۔ نادر بعجلت نعش سے اترا اور بیوی کے خون میں بھیگے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ "سائرہ! کیا ہوا تمہیں ۔۔۔ تم ..... تم" اس کی آواز بچی کی دردناک چیخوں میں ڈوب گئی۔ کتنا دردناک سماں تھا۔ اندھیرے میں باپ بیٹی کے ہاتھ بے حس و حرکت اور خون میں تر اور جسم سے مس کر رہے تھے۔ یکایک دروازے سے روشنی نمودار ہوئی۔ ایک شخص مشعل لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ نووارد کے چہرے پر خشونت کے آثار بدرجۂ اتم نمایاں تھے۔ اس درد انگیز نظارے کو دیکھ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور کرخت آواز میں کہا۔ "کیوں بوڑھے نقاش! ہن قوم کا ظلم دیکھ لیا؟"

باپ بیٹی کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ خوفزدہ بچی کا سر جھک کر مردہ ماں کے سرے سے لگ گیا۔ نادر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"یاد ہے بوڑھے نقاش! تم نے ابھی ابھی ہنوں کو ذلیل، کمینہ اور بد فطرت کہا تھا!" آنے والے نے گرج کر کہا۔

"تو تم ہو کون؟" نادر نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "کمینے، پاجی ظالم!"

"اتنی جرأت!" نووارد نے گرج کر کہا۔

"یہ ظلم کرتے ہوئے تیرے ہاتھ ٹوٹ نہ گئے ۔۔۔۔۔ مردود!" یہ کہتے ہوئے نادر کھڑا ہو گیا۔

"ایک سزا تیرے لئے کافی نہیں۔ اس لئے دوسری سزا دیتا ہوں۔" ہن نے یہ کہا۔ اور تیزی سے آگے بڑھ کر شیریں کو

اُٹھالیا۔ نادر کو ایسا محسوس ہُوا گویا کوئی اُس کا دل نکال رہا ہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہن کی جانب بڑھا۔ ہن پیچھے ہٹ گیا۔ بچی کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔

"ظالم! یہ ظلم نہ کر۔ میری زندگی کا یہ آخری سہارا ہے۔ میری بچی دیدے۔ میں تیرا یہ ظلم برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں ــــ"

ہن نے قہقہہ لگایا۔ اور چشم زدن میں دروازے سے نکل گیا۔ کمرے میں پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ بدنصیب باپ دروازے کی جانب بڑھا۔ باہر سے ابا! ابا! کہتی ہوئی شیریں کی آواز آ رہی تھی۔ نادر پدرانہ محبت کی دیوانگی میں عجلت کے ساتھ باہر نکلا ــــ اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹھکرایا۔ اور وہ دھم سے گر پڑا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ جسم پر کئی زخم آئے۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اسے محسوس ہوا۔ کہ کسی نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

شیریں نے دو تین بار کمزور، خوفزدہ اور لرزتی ہوئی آواز میں "ابا! ابا!" پکارا۔ اور پھر خوف و دہشت سے بیہوش ہو گئی۔ ظالم ہن اسے اپنی گود میں اُٹھائے گھوڑے کے قریب پہنچا۔ اور بعجلت اس پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا ہنہنایا۔ اور روانہ ہو گیا۔ معصوم بچی کا بے حس و حرکت جسم ہن کے آہنی بازوؤں میں جکڑا ہُوا یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک مردہ پرند ہے۔ جسے پانی کی لہر بہائے لیجا رہی ہیں۔ گھوڑا سائیں سائیں کرتے ہوئے درختوں میں سے گذرتا، تاریکی کی کثیف چادر کو چیرتا، اُڑا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف لمبی لمبی سلاخیں نظر آنے لگیں۔ ہن نے ادھر نگاہیں جما دیں۔ یکایک اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو ٹھہرایا۔ نیچے اترا اور سلاخوں کی طرف چلنے لگا۔ سلاخوں کے قریب ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کے سامنے ایک بوڑھی عورت، ایک ہاتھ میں مشعل پکڑے اور دوسرا سلاخوں پر رکھے کھڑی تھی۔ ہن کی آنکھیں خون آلود ہو گئیں اور اس نے بوڑھیا کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے گرج کر کہا۔ "شمہ!"

بوڑھیا کے ہاتھ سے مشعل گر پڑی اور اس کا بدن لرزنے لگا۔ "بدبخت! تجھ میں اتنی جرأت آ گئی!" ہن نے مشعل پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

شمہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی سلاخوں کو، اور کبھی خونخوار ہن کو دیکھنے لگی۔

"بولتی کیوں نہیں؟" ہن نے غضبناک آواز میں پوچھا!

"خونخوار شیر کے سامنے کیا بولوں؟" بوڑھی عورت نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"تو بول نہیں سکتی۔ مگر خونخوار شیر کو دھوکا دینا چاہتی ہے؟"

"یہ دھوکا نہیں ——— یہ ہرگز دھوکا نہیں ——— آپ فرمائیں۔ اگر آپ سے آپ کا لختِ جگر چھین لیا جائے۔ تو آپ کیا کریں گے ——— میری مانند بے تاب نہیں ہونگے ———؟" بوڑھیا نے غمگین آواز میں پوچھا۔

"خاموش! فریب کار عورت! اپنے خاوند اور بیٹے کی طرح تو بھی سازش کر رہی ہے!"

"یہاں کونسی سازش ہو سکتی ہے؟"

"تو پھر؟"

"تو پھر ——— پھر سوچئے۔ بیوی اپنے شوہر کو کیونکر چھوڑ سکتی ہے؟ ماں اپنے بیٹے سے کیسے علیحدہ ہو سکتی ہے؟"

"اگر تو سازش نہیں کر رہی۔ تو پھر رات کی تاریکی میں یہاں آنے سے مقصد؟"

"اس لئے کہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ ان لمبی لمبی سلاخوں کے پیچھے میرا دل اور میرا جگر ہے!"

"تو اس وقت کیا کرے گی۔ جب تیرے دل اور تیرے جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائیگا؟"

شمسہ کے لبوں سے چیخ نکلی۔ اس نے انگلی اپنے ہونٹ پر رکھدی۔ اور فوراً آگے بڑھ کر بولی۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا!"

"ایسا نہیں ہو سکتا ——— کیوں؟ سازشیوں کی سزا موت ہے۔ اور تمہارا خاوند اور بیٹا سازش کے جرم میں یہاں قید ہیں!"

"انہوں نے قطعاً سازش نہیں کی!"

"انہوں نے سازش نہیں کی۔ مگر انہوں نے سازشیوں کا ساتھ ضرور دیا۔ اور یہی ان کی سزا ہے۔ اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ——— پکڑ و اسے" ہن نے بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بوڑھیا کے ہاتھ بچی کی طرف اٹھنے لگے۔ اور دو تین لمحوں میں وہ اس کی گود میں تھی ہن ایک طرف چلا گیا۔ بوڑھیا کی نگاہیں سلاخوں پر جمی تھیں۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے چل رہے تھے۔ آسمان پر چاند خزاں رسیدہ درخت کے ایک زرد پتے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ایک دو منٹ کے بعد ہن گھوڑے کی لگام پکڑے آگیا۔ اور شمسہ کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر چلنے لگا۔ بوڑھیا بھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بوڑھیا نے پہلی بار شیرین کے چہرے کو دیکھا۔ اور دو بڑے بڑے آنسو اس کی آنکھوں سے

نکل کر شیریں پر گر پڑے۔

"جلدی کیوں نہیں چلتیں بد بخت!" ہن نے مڑ کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ بوڑھیا کی رفتار میں تیزی آگئی۔

اسی اثنا میں شیریں نے آنکھیں کھول دیں۔ ہلکی سی آواز ــــ "ابا" کہتی ہوئی اُس کے لبوں سے نکلی۔ شمسہ نے بیتاب ہو کر اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"کیا ہو رہا ہے بوڑھیا!" ہن نے دوبارہ پلٹ کر پوچھا۔

"بچی!" اس سے آگے بوڑھیا کچھ نہ کہہ سکی۔

"ہوش میں آگئی ہے؟"

"ہاں اور پکار رہی ہے ابا!"

یہ سنتے ہی شیریں چیخ چیخ کر پکارنے لگی۔ "ابا۔ امی، امی!!"

ہن کے لبوں پر تبسم کی لہریں پیدا ہوئیں۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ اور تیزی سے چلنے لگا۔ کچھ دیر گذرنے پر وہ ایک مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہن نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔

"اس بد بخت بڑھیا کا تم خیال نہیں رکھتیں۔" ہن نے دروازے میں سے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔

"شمسہ!" اندر سے کرخت آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک کریہہ المنظر عورت دروازے پر آکھڑی ہوئی۔

"یہ دوسری طرف سے نکل گئی ہوگی بد بخت کہیں کی!" اسی عورت نے کہا۔

"مگر تمہیں احتیاط رکھنی چاہیئے تھی!"

"اس کی گود میں یہ کون ہے؟"

"ایک باغی کی بیٹی!" ہن نے کہا۔ اور گھوڑے کی لگام پکڑے ایک طرف چلا گیا۔ شمسہ اندر داخل ہوئی۔ شیریں زور زور سے چیخنے لگی۔ مگر جونہی دو خشمناک گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی آواز رک گئی۔ جیسے کسی نے اس کا گلا دبوچ لیا ہو۔

"تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آنے کی لومڑی؟ اگر یہی حالت رہی۔ تو مجھے سختی کرنی پڑیگی!" کریہہ المنظر عورت نے کہا۔

شمسہ نے لمبی آہ بھری اور شیریں کو پلنگ پر لٹا کر ایک گوشے میں کھڑی ہوگئی۔

"اسے اپنے ساتھ لے جا۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ بد بخت بوڑھیا!"

یہ سُنکر شمسہ نے مبہوت و خوفزدہ بچی کو پھر گود میں اُٹھا لیا ــــ اور دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگی۔

"جا، دفع ہو!"

یہ سنکر وہ شیریں کو اٹھائے کمرے سے نکل گئی!

چند لمحوں کے بعد ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ شمسہ شیریں کو لئے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں آئی۔ بچی نے ہلکی سی چیخ لگائی اور شمسہ کے بازوؤں کو زور سے پکڑ لیا۔

"ڈر کیوں رہی ہے بچی؛ اب تو ظالموں کے پنجے میں نہیں"۔ بوڑھی شمسہ نے خوفزدہ شیریں کے سر پر مادرانہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ایک دو منٹ کے بعد شیریں کو ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگی شمسہ نے شیریں کو ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لٹا دیا۔ اور بتی جو ایک گوشے میں جل رہی تھی۔ اٹھا لائی۔ اور اُسے چارپائی کے قریب لکڑی کی میز پر رکھدیا۔ اور پھر شیریں کو شفقت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تو کون ہے بچی؟"

"ابا، کہاں ہے؟" خوفزدہ بچی نے اُس کے جواب میں کہا۔

"ظالم تجھے تیرے ابا سے چھین کر لایا ہے؟"

یہ سُنکر شیریں کی مبہوت و ششدر نگاہیں شمسہ پر پڑیں۔ اور اس کے سامنے وہی خوفناک منظر پھرنے لگا، جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ اس کی ماں خون میں شرابور ــــ اور اس کا باپ مردہ ماں کے سینے پر پاؤں رکھے ــــ کھڑا ہے۔ وہ مضطربانہ اٹھ بیٹھی۔ اور چارپائی سے نیچے اُترنے ہی لگی تھی کہ شیریں نے اُسے پکڑ لیا۔

"حوصلہ کرو میری بچی؛ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں!" بوڑھیا نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"میں کہاں آگئی ہوں۔ ابا، امی کہاں ہیں؟" شیریں نے پہلی بار شمسہ کو مخاطب کر کے کہا!

"تو میرے پاس ہے بچی!"

"مگر میرا ابا، میری امی؟"

شمسہ نے شیریں کو بے تاب ہو کر گلے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اتنے میں باہر سے زور کی آواز آئی۔ جیسے آہنی دروازے کو زور سے بند کیا گیا ہے۔ شمسہ آنسو پونچھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا ہاتھ چہرے کے پاس آ کر رک گیا۔ اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بالکل خاموشی طاری رہی۔ پھر شمسہ نے شیریں کو دوبارہ چارپائی پر لٹا دیا۔ اور خود بھی

لیٹ گئی۔

موم بتی کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ تاریکی کا اژدہا روشنی کے مختصر سے، مدھم سے حلقے کو نگلتا جا رہا ہے۔ دونوں مظلوم ہستیاں چپ چاپ، بے حس و حرکت لیٹی رہیں۔ یہاں تک کہ بھبکتے ہوئے شعلے نے دم توڑ دیا۔

"اب سو جاؤ بچی!" شمسہ نے شیریں کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے ظالموں کے پنجے سے نکالنے کی کوشش کروں گی!"

شمسہ کا خیال تھا۔ کہ بچی اس دلاسے سے خاموش ہو کر سو جائے گی۔ مگر جب اس نے دیکھا۔ کہ شیریں سسکیاں بھر رہی ہے۔ تو اس کا دل بھی بھر آیا۔ غم و غصہ کا وہ طوفان جو اس کے سینے میں موجزن تھا۔ آنسوؤں کا سیلاب بنکر آنکھوں کی راہ سے نکلنے لگا۔ شیریں کو قدرے تسلی ہوئی۔ اور وہ شمسہ کے بازو پر سر رکھکر خاموش ہو گئی۔ تمام رات، ایک لمحے کے لئے بھی اسکی آنکھوں میں نیند نہ آسکی۔ کبھی وہ محسوس کرتی۔ کہ گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ یکایک آتی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکلتی اور بے چاری شمسہ اٹھ کر اسے پیار دلاسا دیتی۔ پھر وہ دیکھتی۔ کہ ظالم ہن تیزی کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس پر وہ شمسہ سے چمٹ جاتی۔ غرض اسی کشمکش میں رات ختم ہو گئی۔ صبح شیریں کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں نشتر سے چبھ رہے تھے۔ شمسہ نے اسے کمرے میں رہنے کے کہا۔ اور خود باہر نکل کر اپنے فرائض ادا کرنے لگی۔ ہن کے گھر میں شمسہ کی حیثیت ایک ذلیل خادمہ کی سی تھی۔ اور ہن اور اس کی بیوی کے ہر سخت سے سخت حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا اس کا فرض!

اس دن، موقعہ پا کر کئی بار شمسہ شیریں کے پاس آئی۔ اور اسے تسلی دے کر پھر چلی گئی۔ مظلوم بچی کی جدید زندگی کا یہ پہلا دن تھا۔ اسی طرح دن پر دن گزرنے لگے۔

بیکس پرندہ جب دیکھتا ہے۔ کہ اس کے پھڑ پھڑانے سے آہنی پنجرے اور آہنی پنجرے سے زیادہ سخت دل والے صیاد پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تو وہ ایک حد تک اپنے "قید خانے" سے مانوس ہو جاتا ہے۔ یہی حالت شیریں کے ساتھ بھی پیش آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا زخم دروں بھی مندمل ہوتا گیا۔ اور جب اس نے ہن کی زبانی سنا کہ اس کا باپ بھی مر چکا ہے۔ تو رہی سہی امید بھی اسکے دل سے نکل گئی۔ اور وہ پے در پے مظالم برداشت کرتی، بار بار مصیبتوں کی ٹھوکریں کھاتی زندگی بسر کرنے لگی۔ اس طرح تین سال گزر گئے

اس عرصے میں شمسہ نے شیریں کو اپنے اور ہن کے تمام حالات سنا دیئے تھے۔ شیریں کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ شمسہ بلخ کے

ایک اعلےٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا شوہر اور بیٹا سازش کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اور وُہ ہن کے ہاں ایک ذلیل خادمہ کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیونکہ وُہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ شیریں یہ بھی جان گئی۔ کہ جس ہن کے ہاں وُہ اور شمسہ مصائب انگیز زندگی بسر کر رہی ہیں، سلطنت کا بہت بڑا رکن ہے۔ اُس کا کام سازشیوں اور باغیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ اور اس کا نام "دریاس" ہے۔

شمسہ کو شیریں سے مادرانہ محبت ہو گئی تھی۔ اور اسی مادرانہ محبت کا نتیجہ تھا۔ کہ مظلوم لڑکی زندہ تھی۔ ورنہ پے در پے، صدمات و مصائب کے حملے اس کی کمزور و نحیف زندگی کے پودے کو اکھاڑ پھینکتے!

ہن ظالم تھا مگر اس کی بیوی ظلم کرنے میں اس سے بھی دو قدم آگے تھی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جس دن وُہ شمسہ اور شیریں کو پیٹتی نہ ہو۔ اس ظالمانہ سلوک، اس بیرحمانہ برتاؤ کے باوجود دونوں خادمائیں وہاں رہنے پر مجبور تھیں۔

(۲)

ہن "دریاس" کے مکان کے عقب میں ایک بہت لمبا چوڑا دریا تھا۔ شمسہ اور شیریں موقعہ پا کر اسی دریا کے کنارے پہنچ کر دُکھ سُکھ کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ شیریں کو پڑھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ اور وُہ وہیں بیٹھ کر شمسہ سے سبق بھی لے لیا کرتی تھی۔ اس دن وُہ تمام کام کرنے کے بعد جب حسبِ معمول ساحل پر پہنچی۔ تو شمسہ کو مٹی اور ریت کے تودے پر ملول و غمگین بیٹھے ہُوئے دیکھا۔

"کیوں امی! آج مجھے خبر کیے بغیر یہاں پہنچ گئیں؟" شیریں نے شمسہ کے قریب پہنچکر، اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا تھا" شمسہ نے جواب دیا۔

"تو میرا دل کب وہاں لگا رہتا ہے؟"

یہ سُن کر شمسہ کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ اُس نے آنسو پونچھے۔ اور شیریں کو اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"امی! معلوم ہوتا ہے۔ آج کوئی خاص بات ہے —— ورنہ تم یہاں تنہا نہ آتیں۔ کہو قیدیوں کا کیا حال ہے؟" شیریں نے پوچھا۔

"میں وہیں سے آ رہی ہوں۔ بیچارے سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں —— ایک تو قید، دوسرے ظالموں کی وحشیانہ زد،

کوب۔ سوکھ کر کانٹا نہ ہوں اور کیا ہوں؟

"اتنے مظالم تو آج تک کسی نے نہیں توڑے۔ یہ ہیں انسان نہیں وحشی درندے ہیں"۔ شیریں نے آہ بھر کر کہا۔ دونوں خاموش ہو گئیں۔ شیریں کے ہاتھ کا سایہ پانی کی سطح پر لرز رہا تھا۔ اس سائے میں ایک لکڑی جس کا کچھ حصّہ ریت میں دھنسا تھا۔ پانی سے قوت آزمائی کر رہی تھی۔ شمسہ کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ اور وہ غمگین آواز میں کہنے لگی۔ "میں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنے عزیز شوہر اور اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا۔ وہ پہچانتے بھی نہیں جاتے تھے۔ چند لمحے میں ان جیتی جاگتی لاشوں کو دیکھتی رہی پھر کسی نے مجھے دھکا دیا۔ اور میں دھم سے گر پڑی۔ جب اٹھی تو وہ جا چکے تھے"۔

"تم گر پڑی تھیں امی"! شیریں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اور شمسہ کے زخمی ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ "ظالم۔ سفاک"۔ اس کے لبوں سے نکلا۔

"کیوں نہ گرتی" شمسہ نے کہنا شروع کیا۔ "آخر ——— وہ یک دم رک گئی۔ پانی کی رو کمزور لکڑی کو بہا کر لیجا چکی تھی۔

"ہم بیکسوں پر کتنے ظلم ہوتے ہیں"! شیریں نے مغموم آواز میں کہا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

"ظالم ظلم نہ کریں تو اور کیا کریں"؟ شمسہ نے کہا۔

"تو امی! وہ معافی کیوں نہیں مانگ لیتے"؟

"وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے ——— وہ ایسا ہرگز نہیں کرینگے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں۔ معافی مانگ کر ظالم حکومت کا ساتھ دینا وطن کے ساتھ غداری کرنا ہے"۔

"اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دینگے"؟

"وہ کہتے ہیں جان دے دیں گے۔ مگر اصول کو نہیں چھوڑیں گے"۔ شمسہ نے کسی قدر پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔

"اصول ...... مصیبتیں ...... جان ...... مگر امی! یہ ظالم ہیں تو کبھی رحم نہیں کریں گے"!

"وہ حکومت کے دل میں رحم پیدا کرنے کے لئے قربانیاں نہیں کر رہے"!

"تو پھر اور کس لئے"؟ شیریں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اصول کے لئے"!

"کونسا اصول"؟

"وطن پرستی!"

"لیکن امی! تم نے تو کئی بار ظالم دریاس سے قیدیوں پر رحم کرنے کی درخواست کی ہے؟"

"کیونکہ...... کیونکہ...... اس ظالم نے کہا تھا۔ اگر تو خادمہ بن کر میرے ہاں رہے۔ تو میں تیرے بیٹے اور شوہر کو رہا کر دونگا!"

"اور میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے!" قریب سے کرخت آواز آئی۔ شیریں بے اختیار شمسہ سے چمٹ گئی۔ دونوں کی خوفزدہ نگاہوں نے دیکھا۔ کہ دریاس اُن کے قریب کھڑا غضبناک نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا ہے۔

"سُنا تم نے! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تمہارا شوہر اور بیٹا ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے ہیں۔" دریاس نے بلند آواز میں کہا۔

"آزاد ہو گئے ہیں ——؟" شمسہ نے متحیرانہ پوچھا۔

"ہاں میں نے انہیں قیدِ حیات سے آزاد کر دیا ہے۔" یہ کہکر دریاس نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔ اور اپنے ہاتھ میں چابک کو گھمانے لگا۔ شیریں خوف سے لرزنے لگی۔ مگر شمسہ بے حس و حرکت نظر آ رہی تھی!

"معلوم ہوتا ہے۔ تم بھی قیدِ حیات سے آزاد ہونا چاہتی ہو۔" دریاس نے آگے بڑھکر کہا۔ "تم سمجھتی ہو۔ میں تمہاری حرکتوں سے ناواقف ہوں۔ حالانکہ ——"

"وُہ مر گئے؟" شمسہ نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تو اور کیا وہ زندہ رہتے۔ مگر تمہارے لئے کیوں زندگی ناقابلِ برداشت بوجھ بن رہی ہے ——؟" یہ کہتے ہوئے دریاس نے ہاتھ کو حرکت دی۔ چابک میں سے "شاں" کی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی بوڑھی عورت کے چہرے پر نیلا نشان پڑ گیا۔ شیریں پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے کھڑے ہوئے جلاد کو دیکھ رہی تھی۔ ظالم کے ہاتھ کو دوبارہ حرکت ہوئی۔ اور شیریں کے لبوں سے دردناک چیخ نکل کر فضا میں تھرتھرائی!

"اب اُٹھتی ہو یا تمہیں مرنا چاہتی ہو؟" دریاس نے گرج کر کہا۔ اور چابک کو گھمانے لگا۔ شمسہ اور شیریں اُٹھیں۔ اور چلنے لگیں۔ شیریں کے قدم جلدی اُٹھ رہے تھے۔ لیکن شمسہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

تمام رات بدنصیب بوڑھیا خاموش رہی۔ شیریں نے کئی بار بلایا۔ مگر اس کے لبوں سے ایک لفظ تک بھی نہ نکلا۔ صبح وہ اُٹھی۔ اور حسبِ معمول کام انجام دینے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کو کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ شام کے قریب شیریں اپنی

کوٹھڑی میں پہنچی ـــــ اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اُسے چند منٹ ہی گزرے تھے۔ کہ شمسہ آگئی۔ اور آتے ہی مادرانہ شفقت سے شیریں کی پیشانی چوم کر کہنے لگی۔ "میری بیٹی! میرا کہا مانو گی؟"

"ہاں امی! کہو ـــــ تمہاری خوفناک خاموشی سے تو میں بہت مایوس ہو گئی تھی۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے۔ کہ تم میری خاموشی سے رنجیدہ ہوئیں ـــــ مگر میں کیا کرتی۔ دل ہی بات کرنے کو نہیں، چاہتا تھا!"

"اب وہ بات بتاؤ امی!"

"سنو میری بچی!" شمسہ نے محبت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اسوقت سو رہو۔ نصف رات گذرنے پر میں تمہیں جگا دوں گی۔ اور تم بغیر کسی خدشے کے یہاں سے چلی جانا!"

"میں چلی جاؤں اور تم؟" شیریں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"میں جو کہتی ہوں سنتی جاؤ۔ پچھلی طرف کا دروازہ کھلا ہوگا۔ تم اس میں سے گذر کر دریا کے کنارے اس جگہ پہنچ جانا۔ جہاں ہم کل بیٹھے تھے۔ سمجھ لیا نا؟ وہاں ایک کشتی آئے گی۔ تم اس میں بیٹھ جانا۔ ملاح تمہیں اپنے گھر لے جائے گا ـــــ گھبراؤ نہیں بیٹی میں نے سب انتظام کر لیا ہے!"

"مگر تم؟"

"میں نے اپنا انتظام بھی کر لیا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو!"

"تو تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلو گی! ـــــ یہ ظالم خونخوار ہیں ـــــ"

"سب انتظام ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ علیحدہ جاؤں گی؟"

"مگر میں تمہارے بغیر کیا کروں گی امی!"

"تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو ـــــ پہلے یہاں سے تو نکلو۔ بعد میں اور چیزیں بھی دیکھ لی جائیں گی ـــــ دیکھو میری بات کو بھولنا نہیں ـــــ"

شیریں خاموش رہی۔

"میری بیٹی! تم مجھے امی کہتی ہو ـــــ کیا اپنی امی کا کہا نہ مانو گی؟"

"مانوں گی! ضرور مانوں گی!"

"پھر رات کو تیار رہنا" یہ کہہ کر شمسہ باہر نکل گئی۔ شیریں لیٹنے کو تو چارپائی پر لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں! رہ رہ کر اسے خیال آتا تھا۔ شمسہ کیا چاہتی ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بہت دیر تک اس قسم کے پریشان خیالات اس کے دماغ میں آتے رہے۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی۔ تو اسے محسوس ہوا۔ کہ کوئی اسے ہلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی!

"شیریں! جاؤ جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔" یہ شمسہ کی آواز تھی۔ "جلدی کرو جلدی!" یہ کہکر شمسہ نے شیریں کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔

دیوار کے ایک بڑے سے سوراخ میں سے چاند کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس روشنی میں شیریں نے دیکھا۔ کہ شمسہ کی آنکھیں سُرخ ہیں۔ چہرہ کسی قدر خوفناک ہوگیا ہے۔ وہ کچھ سہم سی گئی۔

"اب تم جاؤ!" شمسہ نے آخری بار کہا۔

شیریں کوٹھڑی میں سے نکلی۔ اور دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ اس میں سے گزری اور دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ وہاں بیٹھے اُسے ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی۔ کہ اس نے دریا کی سطح پر بے شمار سائے لرزتے ہوئے دیکھے۔ سر اٹھایا اور اُوپر دیکھنے لگی۔ دھوئیں کے لکّے ہوا کے تیز و تند جھونکوں کی سیڑھیوں کو نہایت تیزی کے ساتھ طے کرتے ہوئے فضا کی لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ شیریں نے پلٹ کر دیکھا۔ ناگاہ اس کی نظر ہن کے مکان پر پڑی۔ اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ ہن کا مکان جل رہا ہے۔ وہ مکان کی طرف دوڑی۔ اور اس کے قریب پہنچکر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ وہ حیران تھی۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے — مکان میں کس نے آگ لگائی؟ — ہن اور اس کی بیوی کہاں ہیں؟ شمسہ کدھر گئی؟ — کیا وہ اندر تو نہیں جل رہے — اس خیال کے آتے ہی مسرت کی ایک ہلکی سی لہر اس کے دل میں دوڑ گئی۔ مگر جب اس نے سوچا۔ کہ شمسہ ... بھی نذرِ آتش ہو جائے گی۔ تو اس کے چہرے پر حزن و ملال کے اثرات چھا گئے۔ وہ دو قدم آگے بڑھی۔ یکایک دروازے کا ایک پٹ کھُلا۔ ہن کا گھبرایا ہوا، سراسیمہ چہرہ نظر آیا — اور اس کے ساتھ ہی شمسہ کی صورت دکھائی دی — پھر پٹ بند ہوگیا۔ یہ سب کچھ دو تین لمحوں میں ہوا۔ پھر بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شیریں حیران و سراسیمہ کھڑی تھی۔ اس کے سامنے، چند قدموں کے فاصلے پر آگ کے شعلے خوفناک دیووں کی مانند ہر ایک چیز کو چیخ چیخ کر اپنے آتشیں جبڑوں میں نگلتے دھوئیں کے کثیف بادل اُگلتے مکان کو خاکستر کی صورت میں تبدیل کر رہے

تھے۔ شیریں تھوڑی دیر وہاں ٹھہری۔ اور پھر ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ دور پانی کے سینے پر ایک کشتی نظر آرہی تھی۔ شیریں نے ایک طرف کھڑے ہو کر اپنی نگاہیں اس پر جما دیں۔ کشتی کچھ دیر کے بعد ساحل سے آلگی۔ اس میں سے ایک آدمی نکل کر شیریں کی طرف آنے لگا۔

"شمسہ نے تمہیں کو میرے ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا؟" اس نے پوچھا:

"ہاں!" شیریں نے جواب دیا۔

"تو پھر چلو!" اجنبی نے کشتی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ شیریں نے آخری بار ہن کے مکان کی طرف دیکھا۔ فضا میں کہیں کہیں دھوئیں کے بادل لہرا رہے تھے۔ شاید مکان جل چکا تھا۔ ایک لمبی آہ اس کے منہ سے نکلی۔ اور چپ چاپ کشتی میں بیٹھ گئی۔ اجنبی نے چپوؤں کو حرکت دی۔ اور کشتی سینۂ آب پر چلنے لگی۔

(۱۳)

کشتی بہے چلی جا رہی تھی۔ اور شیریں سیاہ فام اجنبی کے سامنے بیٹھی ہوئی پانی کی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا کا جھونکا چلتا تھا۔ اور چمکتے ہوئے پانی میں ایک عجیب و غریب تموج پیدا ہو جاتا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شیشے کی چھوٹی چھوٹی قندیلوں میں پگھلی ہوئی چاندی چھلک رہی ہے۔ کائنات اس طرح خاموش، اس طرح بے حس و حرکت تھی۔ گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اجنبی نے چند لمحے شیریں کے چہرے پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ پھر اپنی کرخت آواز میں پوچھا۔ "گھبرا تو نہیں رہی بیٹی؟"

"میں گھبراؤں تو کیا ہے، نہ گھبراؤں تو کیا ہے؟" شیریں نے بدستور لہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"حوصلہ کرو بیٹی! اب تو ہن کے قبضہ میں نہیں ہے۔" اجنبی نے داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

شیریں خاموش رہی۔ اس کی نگاہیں اٹھیں اور ساحل کے قریب سطح آب پر لرزتے ہوئے درختوں کے سایوں کو دیکھنے لگیں۔ دھوئیں کے کثیف بادل اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے۔ پھر شعلوں کی ایک چادر پھیل گئی —— اس میں ہن اور شمسہ کے چہرے ایک لمحے کے لئے نظر آئے۔ اور پھر یہ منظر غائب ہو گیا۔ شیریں نے ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اور پہلی بار غور سے اجنبی کے چہرے کو دیکھا۔ اجنبی شکل و شباہت سے حبشی تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ ایک حد تک خوفناک تھا۔ کچھ دیر بعد کشتی کنارے سے جا لگی۔ دونوں ساحل پر آئے۔ اجنبی آگے آگے چلنے لگا۔ اور شیریں اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگی۔ چند منٹ کے بعد وہ ایک شکستہ مکان میں پہنچ گئے۔ اجنبی نے شیریں کو ایک ٹوٹی پھوٹی سی چارپائی پر سو جانے کے لئے کہا۔ اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔ شیریں چارپائی

پڑ لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں؟ صبح ہوئی۔ اس کے جسم کا ہر عضو دکھ رہا تھا۔ سر میں شدت کا درد تھا۔ اس نے چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اٹھ نہ سکی۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد ایک بوڑھیا اس کے لئے معمولی سا کھانا لائی۔ جسے کھا کر اُس کے بدن میں بولنے کی قوت پیدا ہوئی۔ اور اُس نے بڑھیا سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں —— اور میں کہاں ہوں؟

"تم ہمارے گھر میں ہو۔ اور میرا بیٹا رات تمہیں لایا تھا۔"

"وہ تمہارا بیٹا ہے؟"

"ہاں۔ اب تو یہاں خوشی خوشی رہ۔"

"جب آئی ہوں تو رہنا ہی ہوگا" شیریں نے جواب دیا۔ چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر شیریں نے پوچھا "آپ لوگ ملاح ہیں؟"

"ہاں بیٹی —— ہمارے باپ دادا بھی ملاح رہے ہیں۔"

"اور شمسہ آپ کی رشتہ دار تھی؟"

"کیوں اُس نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"نہیں اس کا موقعہ نہیں ملا!"

"ٹھیک ہے کیونکر موقعہ مل سکتا تھا" بوڑھیا نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"دُور کی رشتہ دار تھی؟" شیریں نے دوبارہ استفسار کیا۔

"ہاں بیٹی دُور کی ہی رشتہ دار ہے —— !

اس کے بعد چند باتیں کر کے بوڑھیا چلی گئی۔ اور شیریں چارپائی کے قریب کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ دور تک ہرے ہرے کھیت لہرا رہے تھے۔ عورتیں بھیڑوں کو لئے جا رہی تھیں۔ ایک طرف چند گھوڑے کھڑے تھے۔ وہ دیر تک ان مناظر کو دیکھتی رہی۔ اور معلوم نہیں کب تک دیکھتی رہتی۔ کہ وہ بوڑھیا پھر آ گئی۔ اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ شیریں نے محسوس کیا۔ کہ بوڑھیا کی باتیں ہمدردی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اور وہ خوف و دہشت جو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ایک حد تک دور ہو گیا۔ وہ گھر والوں کے ساتھ بے تکلف ہونے لگی۔ گھر میں تین افراد تھے۔ ایک بوڑھیا، دوسرا اس کا بیٹا، اور تیسرا ایک ایسا شخص تھا۔ جسے بوڑھیا اپنا رشتہ دار

بتاتی تھی۔ اور جو شکل وصورت سے ظالم معلوم ہوتا تھا۔ شیریں اس سے خوف کھاتی۔ اور بساط بھر اس کے ساتھ بات کرنے سے احتراز کرتی۔ مگر اس کی یہ خواہش کہاں تک کامیاب ہو سکتی تھی، وہ شخص اس گھر میں رہتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بوڑھیا اور اس کا بیٹا اس سے کسی قدر مرعوب بھی تھے۔

وقت گزرتا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ شیریں جوان ہوتی جا رہی تھی۔ ہن کے مکان سے آئے ہوئے اُسے دو سال گزر چکے تھے۔ اور اب اُس کی عمر چودہ سال کے قریب تھی۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا۔ کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ کبھی ہن کے قبضہ میں چلی گئی۔ تو پھر کیا ہوگا۔ یہی خیال تھا۔ جو اس کے راستے میں حائل تھا ——!

ایک رات بوڑھیا کا بیٹا اور دوسرا شخص بہت دیر سے آئے۔ بوڑھیا سو رہی تھی۔ مگر شیریں جاگ رہی تھی۔ اگرچہ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

"اب وقت آگیا ہے کہ اس کا سودا کر دیا جائے؟"

"جیسی تمہاری مرضی!" یہ بوڑھیا کے بیٹے کی آواز تھی۔

"میرا خیال ہے پرسوں یہ کام کر دیا جائے"۔

"بہتر ہے مگر کہاں؟"

"کہاں! اس کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اس قسم کا کام تو میرے لئے اتنا آسان ہے۔ جتنا بہاؤ کے ساتھ کشتی لے جانا۔ اور تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں!"

"پھر بھی!"

"ہم اسے اپنے پاس ہی کیوں نہ رکھیں؟"

دوسرے نے قہقہہ لگایا ——"سٹھیا تو نہیں گئے بدمعاش! ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟"

"تو پھر مال ہاتھ آئے۔ وہ لڑکی خوبصورت ہے۔ خوب مال ملے گا؟"

شیریں کے سینے میں دل تڑپنے لگا۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ اسی وقت اس کے پر لگ جائیں۔ اور وہ کہیں اُڑ جائے —— اُڑ کر کہیں دور پہنچ جائے جہاں ظالم انسانوں کا وجود ہی نہ ہو۔

دو تین منٹ اور گفتگو کرنے کے بعد ملاح سو گئے۔ اس نے آہستہ سے سانس روک کر پہلو بدلا۔ اور موجودہ حالات پر غور کرنے لگی۔

صبح بوڑھیا اس کے لئے طرح طرح کے کپڑے لے آئی۔ اور اسے ہنس ہنس کر پہنانے لگی۔ شیریں نے خوشی کے اظہار کی کوشش کی۔ تاکہ ان کو یہ نہ معلوم ہو جائے۔ کہ وہ ان کے ظالمانہ ارادے سے مطلع ہو چکی ہے۔ تمام دن اس کے ذہن میں یہ خیال پرورش پاتا رہا۔ کہ وہ کیوں نہ بھاگ جائے۔ اس طرح کم از کم فروخت ہونے سے تو بچ جائے گی۔ مبادا اسکا مالک کوئی ہن ہو ـــــ ہنوں سے وہ بے حد خوفزدہ تھی ـــــ!

شام کے وقت اس کا فراری کا ارادہ عزم صمیم کی قوت حاصل کر چکا تھا۔ دونوں ملاح ابھی نہیں آئے تھے۔ بوڑھیا لیٹ چکی تھی۔ اس نے موقعے کو غنیمت جانا۔ چپکے سے باہر نکلی اور تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ اکی رفتار میں بھی ترقی ہو رہی تھی۔ بہت دور چلنے کے بعد، تھک کر وہ ایک چشمے کے کنارے لیٹ گئی۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں ظالم ملاح وہاں نہ پہنچ جائیں وہ جلد اٹھ بیٹھی ـــــ اور پھر چلنے لگی۔ یکایک ایک غمگین آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ وہ ٹھہر گئی اور آواز کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دو منٹ کے بعد وہی آواز پھر آئی۔ وہ تیزی کے ساتھ اس طرف بھاگی۔ کچھ دیر بعد ـــــ اس نے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھے کو دیکھا۔ جو ایک ہاتھ میں دف اور دوسرے میں لاٹھی پکڑے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ شیریں کو معلوم ہو گیا۔ کہ بوڑھا اندھا ہے۔ رحم کا جذبہ اس کے دل میں موجزن ہوا۔ اور وہ بوڑھے کے قریب پہنچی۔ اور اپنا ہاتھ اس کی لاٹھی کی جانب بڑھایا۔ یکایک اسے ایک طرف گرد و غبار اڑتا دکھائی دیا۔ پھر دفعتہً گھوڑوں کی گردنیں نمودار ہوئیں۔ وہ اندھے سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہ اس کے لبوں سے ہائی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور وہ ایک طرف بھاگنے لگی۔ کچھ دور جا کر ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔

کافی دیر گذر گئی۔ اب اس نے دیکھا۔ کہ گھوڑے گزر گئے ہیں۔ وہ وہاں سے نکلی اور تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔ اندھے بوڑھے کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ قریب ہی کوئی شخص حرکت کر رہا ہے۔ وہ بعجلت وہاں پہنچی۔ اور حیرت انگیز نظروں سے دیکھا۔ کہ بوڑھے کی خون میں شرابور۔ لاش پڑی ہے۔ مگر اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں آہستہ آہستہ دف پر حرکت کر رہی ہیں۔ شیریں نے جھک کر دیکھا۔ دف پر سرخ نشان نظر آئے۔ وہ خون آلود نعش کے پاس بیٹھ گئی ـــــ اب اندھے کا جسم بالکل سرد ہو چکا تھا۔ شیریں نے اسے ہلایا۔ مگر بے سود۔ اُسکی آنکھوں

میں آنسو بھر آئے۔ اور دل میں غم و حسرت کا طوفان موجیں مارنے لگا۔ دو تین منٹ تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پھر اٹھی اور ایک طرف قدم اٹھانے لگی۔ یکایک اسکی نگاہیں دف پر پڑیں۔ وہ بے اختیار نعش کے پاس دوبارہ پہنچی۔ آہستہ سے دف کو اٹھایا۔ یاس انگیز نگاہیں نعش پر ڈالیں۔ ادھر چلنے لگی۔ ایک تو تھکاوٹ اور اس پر بھوک مستزاد۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ نڈھال ہو کر ایک چشمے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اور اپنے پاؤں پانی میں ڈال دیئے۔

چاند کی شعاعیں درختوں میں سے چھن چھن کر اس پر گر رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دف کو دیکھنے لگی۔ دف پر خون کے نشان نظر آ رہے تھے۔ یکایک اس کی مبہوت وششدر نگاہوں نے دیکھا۔ کہ وہ خون کے نشان ایک لفظ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اور وہ لفظ ہے "وطن"۔ کئی لمحے وہ حیرت سے اس لفظ کو دیکھتی رہی۔ اور اس کے لبوں سے آہستہ آہستہ "وطن وطن" کہتی ہوئی آواز نکلتی رہی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا۔ کہ بوڑھے اندھے کی انگلیاں دف پر کیوں حرکت کر رہی تھیں۔ ایک مسرت انگیز اضطراب اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے پاؤں پانی سے نکال لئے۔ اور درختوں کی قطار کے پیچھے مکانات کو دیکھنے لگی۔ وہ حیران تھی۔ کہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ اسی اثنا میں قریب آواز آئی:۔

"کون ہو تم؟"

شیریں نے سر اٹھا کر ایک طرف دیکھا۔ اس کے سامنے ایک نحیف و نزار شخص کھڑا تھا۔

"ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں"۔ شیریں نے زمین پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"مصیبت، مصیبت، ہر جگہ مصیبت" اس شخص نے قدرے جوش سے کہا۔ "زندگی میں مصیبتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں؟"

وہ شخص شیریں کے پاس پہنچا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اور ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"میرا کوئی گھر نہیں!"

"تو پھر؟"

"اگر کوئی گھر ہوتا۔ تو پھر مصیبت زدہ کیوں ہو سکتی تھی؟"

"تو اب کہاں رہتی ہو؟"

"کبھی کہیں — کبھی کہیں"۔ یہ کہتے ہوئے شیریں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس شخص نے پیار اور شفقت سے اپنا ہاتھ

اس کے سر پر رکھدیا۔ اور کہنے لگا۔

"تو چلو۔ میرے گھر میں!"

شیریں نے ممنونانہ اسے دیکھا۔ اور اجنبی کے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک ٹوٹے چھوٹے مکان میں تھی۔ اور اس کا محسن اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"بھوکی ہو تم کیا؟"

"ہاں!" شیریں نے اپنے محسن کے استفسار پر کہا۔

اس شخص نے معمولی سا کھانا اس کے سامنے رکھدیا۔ جسے کھا کر شیریں اپنی داستان حیات سنانے کے قابل ہو سکی۔ وہ شخص بڑی ہمدردی کے ساتھ اس کی مصیبتوں کی کہانی سنتا رہا۔ شمسہ کے بعد یہ پہلا شخص تھا۔ جس نے اس کے ساتھ واقعی ہمدردانہ سلوک کیا تھا۔ اور جس کی طرف اس کا دل بے اختیار کھنچا جاتا تھا۔ آدھی رات تک وہ باتیں کرتے رہے۔ اس شخص نے بتایا۔ کہ وہ بلخی ہے۔ اور ہنوں کے مظالم کا شکار۔ اس کا نام "شمدس" ہے۔ اور پیشہ ماہی گیری" —— انہی باتوں میں نصف سے زیادہ رات گزر گئی۔ پھر شیریں تھکاوٹ سے مجبور ہو کر سو گئی۔

شیریں کو شمدس کے ہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس عرصے میں لمحہ بھر کے لئے بھی اس نے گھر سے باہر قدم رکھنے کی جرات نہ کی۔ وہ ڈرتی تھی مبادا پھر مصائب میں گرفتار ہو جائے۔

ایک دن وہ دف پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کہ اچانک ایک خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اور اس نے دف بجا کر گانا شروع کر دیا۔ نہ معلوم کیوں اسے اپنی آواز میں اتنی جاذبیت محسوس ہوئی۔ کہ دیر تک گانے کے باوجود اس کی تشنگی دور نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہر روز وہ کئی کئی گھنٹے اس شغل میں محو رہنے لگی جسب معمول وہ ایک شام دف بجا بجا کر گا رہی تھی۔ کہ شمدس گھر آیا۔ اور چپکے سے اس کا گانا سنتا رہا۔ شیریں نے جونہی اسے دیکھا۔ گانا بند کر دیا۔

"گاتی رہو شیریں! خاموش کیوں ہو گئیں" شمدس نے مسکرا کر کہا۔

شیریں نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"مجھے معلوم نہ تھا تم میں اتنی بڑی خوبی موجود ہے!" شمدس نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کونسی خوبی چچا!"

"تمہاری آواز تو بے حد پیاری ہے۔ اگر تم چاہو۔ تو اس آواز سے بہت فائدہ اُٹھا سکتی ہو!"

"فائدہ!" شیریں کے لبوں سے نکلا۔ اُس نے دف کو گود میں رکھ لیا۔ "وطن" کا لفظ اُس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

"تم غمگین سی ہو گئیں شیریں!" شمدس نے قدرے بے چینی سے کہا۔

"بچچا! ہن ہمارے وطن پر کتنا ظلم کر رہے ہیں"

"ظالم لوگوں کا یہی کام ہے۔ اسمیں تعجب کی کونسی بات ہے؟"

"تو یہ ظلم کب تک ہوتا رہے گا!"

"جب تک ہن ہم پر حکمران ہیں" یہ کہتے ہوئے شمدس نے سرد آہ بھری۔ "ہمارا بدنصیب وطن خون میں نہا رہا ہے"

"وطن!" شیریں نے کہا۔ اور اس کی نگاہیں دف پر جم کر رہ گئیں۔ خون میں لکھا ہوا لفظ "وطن" شعلے کی مانند اس کے سامنے پھرنے لگا۔ ایک آنسو اس کی آنکھوں سے نکلا۔ اور دف پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد شمدس چلا گیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔

اب تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس نے اس نے دیا جلایا۔ اور چارپائی پر بیٹھ کر شمدس کے الفاظ پر غور کرنے لگی۔

"اگر میں چاہوں۔ تو اپنی آواز سے بہت فائدہ اُٹھا سکتی ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" اس کے دل میں سوال پیدا ہوا "میری آواز بہت اچھی ہے۔ مگر اس سے فائدہ کیونکر اُٹھاؤں؟ ——— بازار میں گویّے گا گا کر کافی رقم پیدا کر لیتے ہیں۔ تو میں کیوں نہ ——— ؟" اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیئے کی روشنی کے باوجود گھر میں کافی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

"چچا کی محدود آمدنی میرے اخراجات کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ میں آخر کیوں اس پر بوجھ بنوں۔ میں خود دولت پیدا کروں گی۔ مگر ہن ——— ؟" اس کا دل لرز گیا۔ لیکن ایک غیر معلوم قوت نے اس کا دل بڑھایا۔ اور وہ پھر دف پر گانے لگی ——— !

جب شمدس آیا۔ تو اس نے اپنے ارادے کا تذکرہ اس سے کیا:

"تم ضرور اپنی آواز سے فائدہ اٹھاؤ گی!" شمدس نے خوش ہو کر کہا:

"ہاں چچا ——— کل سے کام شروع کر دوں گی!"

"اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ——— چند دن اور ٹھہر جاؤ"

نہیں چچا! اب میں خوب گا سکتی ہوں۔ کل دیکھو گے کیا ہوتا ہے"

یہ خیال لئے ہوئے وُہ سو گئی۔ اور خواب میں دیکھنے لگی۔ کہ بازاروں میں دف بجا بجا کر گا رہی ہے۔

(۴)

شیریں نے دف بجا بجا کر بلخ کے بازاروں میں گانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل حجاب و خوف نے قدم قدم پر اس کے ارادے کو شکست دی لیکن چند دن کے بعد اس کے اندازِ نغمہ سرائی کو، اتنی مقبولیت، اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ وُہ جہاں ٹھہر کر گانے لگتی۔ لوگ جوق در جوق اس کے گرد آ کھڑے ہوتے۔ اور جب وُہ گھر پہنچتی۔ تو طرح طرح کے سکّوں کا انبار اس کے دامن میں ہوتا۔ اس طرح، آہستہ آہستہ اس کی شہرت بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ صرف شہرت بلکہ اس کی دولت میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہو رہا تھا۔

بے شمار جانگداز مصائب کے بعد زندگی نے اپنا روشن رُخ اس کے سامنے پیش کیا تھا۔ تاہم ایک غیر محسوس خلش اس کے دل و دماغ پر طاری رہتی۔ اور مسلسل کوشش کے باوجود وُہ اس خلش کی نوعیت کو نہ سمجھ سکی۔ وُہ صرف اتنا جانتی تھی۔ کہ اس کا دل بے قرار ہے۔ —— ہر وقت بیقرار ہے!

آج بھی وُہ تنہا بیٹھی اسی بے قراری کی نوعیت پر غور کر رہی تھی۔ فضا میں اودی اودی، نیلی نیلی بدلیاں طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہوا کے آغوش میں اُڑتی چلی جا رہی تھیں۔ شیریں کی نگاہیں دُور ایک درخت پر جمی تھیں جس کے اوپر ایک چیل منڈلا رہی تھی سوچتے سوچتے اس کے خیالات کا رُخ گذشتہ واقعات کی طرف پھر گیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہوں کے سامنے وُہ زمانہ آیا جب وُہ ننھی بچی تھی اور پیارے والدین کے زیرِ سایہ معصومانہ مسرتوں سے لبریز زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ زمانہ اس کی زندگی کا مسرور ترین زمانہ تھا۔ اس زمانے کا ایک ایک واقعہ اُسے یاد آیا —— ایک ایک واقعے نے یاد آ کر اس کے دل میں چٹکی لی۔ اس کے بعد مکان کے جلنے کا منظر اس کے سامنے آیا۔ اور وُہ غور کرنے لگی۔ ان کے مکان کو آگ کس نے لگائی۔ سوچتے سوچتے بجلی کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "نورہ بھی شمسہ پر انتہائی ظلم کئے گئے۔ اس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا گیا۔ دُنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ رہا۔ اس لئے اس نے ظالموں سے انتقام لیا —— کتنا خوفناک انتقام! مکان کو آگ لگا دی۔ اور خود بھی ستمگروں کے ساتھ آگ میں جل گئی۔ ظالموں سے انتقام لینے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے —— مگر میں —— میں تو ظلم برداشت کرتی رہی۔ بُزدل —— میں بزدل ہوں!"

یہ خیال تھا۔ جو اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ اسے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ دف پر پڑی جو چند قدم کے فاصلے پر لٹک رہی تھی۔ دھوئیں کا بادل اس پر منڈلا رہا تھا۔ اور اس میں سے سُرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ سا اُس کا ذہن دف پر لکھے ہوئے لفظ "وطن" کی طرف منتقل ہو گیا۔

"وطن وطن!!" آہستہ آہستہ اس کے لبوں سے نکلا۔ "آج وطن ہنوں کے مظالم کا شکار ہے۔ کب تک یہ ظلم رہیگا؟ کیا معلوم؟"
مایوسی میں اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ رات کو جب لیٹی۔ تو اس کی بے قراری بڑھ چکی تھی۔ مگر اب بھی وہ اس بے قراری کی نوعیت سے ناواقف تھی۔ سوتے میں اس نے دیکھا کہ ایک طویل و عریض میدان میں کھڑی ہے —— ایک طرف بڑی اونچی دیوار ہے۔ یکایک افق سے سرخ آندھی اٹھتی ہے۔ اور دیوار کی جانب بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جھونکے دیوار سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ جب اس کے جھونکے ٹکراتے ہیں۔ تو دیوار پر جابجا خون کے سرخ نشانات پڑ جاتے ہیں۔ یکایک وہ دیکھتی ہے۔ کہ میدان کے ایک حصے میں بے شمار زخمی انسان تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہیں۔ ان کے لب ہل رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ "ظلم ہمیشہ رہیں گے۔ وطن پامال ہوتا رہے گا" اب شیریں سمجھتی ہے۔ کہ آندھی کے دامن میں انہی بدقسمت زخمی انسانوں کا خون ہے جس سے وہ دیوار پر نقش و نگار کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سیاہ بادل ہر طرف چھا جاتے ہیں —— یہ خوفناک خواب دیکھ کر وہ ڈر گئی اور ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔ شمدس چراغ لے کر اس کے سرہانے آیا۔ شیریں کی نگاہ سب سے پہلے جس پر پڑی۔ وہ دف تھی۔ جسے اس نے سرہانے رکھ دیا تھا۔

"کیوں بیٹی! کیا ہوا؟" شمدس نے محبت انگیز لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں!!" شیریں نے آہستہ سے کہا۔

"شاید تم ڈر گئیں!"

"میں ڈر گئی —— ؟ ہاں —— لیکن تم فکر نہ کرو۔ اب میری حالت ٹھیک ہے؟"

شمدس نے تسلی دینے کے بعد چراغ اس کے سرہانے رکھدیا۔ اور چلا گیا۔ رات کا بقیہ حصہ پریشان خیالات کی نذر ہوگیا۔
صبح اٹھ کر اس نے دف اٹھائی اور بازار کو چل گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی طبیعت بیزار ہوگئی۔ اور وہ واپس گھر آنے لگی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی۔ کہ کسی نے اسے آواز دی "مطربہ!"
وہ رک گئی۔ مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص اس کی طرف آرہا تھا۔ شیریں نے اس کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہے "کیا بات ہے؟"
وہ شخص اس کے بالکل قریب آگیا۔ اور دف کو غور سے دیکھنے لگا۔

"کل بھی آج میری طبیعت خراب ہے" شیریں نے کہا۔
میں گانا سننا نہیں چاہتا ——"

"تو پھر!" شیریں نے متعجبانہ کہا!

"یہ رومال تم نے کہاں سے لی؟" اس شخص نے رومال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا!

"یہ میں نے کہیں سے لی ——— آپ کو پوچھنے کا کیا حق ہے؟"

"حق ہے تبھی تو پوچھ رہا ہوں!"

"میں نہیں سمجھتی آپ کو اس قسم کا کوئی حق ہے!"

"شاید حق نہ ہو تاہم تم کو بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"اسے میں نے خریدا تھا!" شیریں نے جواب دیا۔

"خریدا تھا! کہاں سے؟"

"یہ مجھے یاد نہیں رہا کہیں سے خریدا ہوگا آخر!"

"تو کیا آپ یہ رومال مجھے قیمتاً نہیں دے دیں گی ——— میں حسب منشا قیمت ادا کر دوں گا۔" اس شخص نے کہا۔

"نہیں یہ مجھے بہت عزیز ہے!"

"اور مجھے تم سے بڑھ کر عزیز ہے!"

دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اجنبی کی نگاہیں یقین کا جذبہ لئے ہوئے تھیں۔ اور شیریں کی نظریں حیرت کے آثار! دو تین لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے!

"شاید اب تم کو کوئی اعتراض نہ ہو!" اس شخص نے کہا۔

"ہے اور رہیگا!" یہ کہکر شیریں نے قدم اٹھائے۔ اجنبی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ شیریں کے قدم رک گئے۔

"میں آپ کو یہ رومال دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر ایک شرط پر!"

"کہو!" اس شخص نے بیتابانہ پوچھا۔

"آپ کو یہ بتانا ہوگا۔ کہ یہ رومال آپ کو کیوں عزیز ہے؟"

"تم یہ پوچھنا چاہتی ہو!"

"ہاں!"

اجنبی نے کچھ سوچا، غور سے شیریں کے چہرے کو دیکھا۔ اور کہا "میرے ساتھ چلو — میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا"!

شیریں جھجکی — مگر پھر اجنبی کے ساتھ چلنے لگی۔ ایک جذبہ بے اختیار کشاں کشاں اُسے لئے جا رہا تھا!

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک ویران مقام پر پہنچ گئے۔ اجنبی کے قدم رُک گئے۔ اور وہ ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ شیریں بھی اس کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔

"تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہ یہ وقت مجھے کیوں عزیز ہے"؟

"ہاں میں اب بھی پوچھتی ہوں۔ اگر آپ نے حقیقت کا اظہار کر دیا۔ تو میں یقیناً یہ آپ کو دے دوں گی"! شیریں نے کہا۔ اور اجنبی کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ اجنبی چند لمحے خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ "راز کے انکشاف پر ممکن ہے۔ تم مجھے نقصان پہنچا سکو۔ مگر میں اس کی پرواہ نہیں کرتا —"!

"میں آپ کو نقصان پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی"!

"مجھے اس کا یقین ہے۔ تم میرے پیارے وطن ہی کی خاک سے پیدا ہوئی ہو۔ اور یہ راز تمہارے وطن کی حرمت ہی سے تعلق رکھتا ہے ممکن ہے۔ میرے الفاظ سن کر تمہارے دل میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور تم اپنے ہم وطنوں کی مدد کر سکو"!

"تو کہو۔ مجھے تمہاری خاموشی مضطرب کر رہی ہے"۔ شیریں نے مضطربانہ کہا۔ اجنبی نے ایک لمبی آہ بھری اور کہنے لگا!

"ہمارا وطن عزیز اس وقت دُنیا کی ظالم ترین قوم کے وحشیانہ مظالم کا تختۂ مشق بنا ہے۔ اِدھر ظالم حکومت کی قہرمانی طاقتیں بڑھتی جاتی ہیں اور اُدھر مظلوم اہل بلخ کی مظلومیت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ خود سوچو اگر اہل وطن کے دل سے وطن پرستی کا جذبہ مفقود ہو جائے تو پھر ظالم حکومت کے ظلم و ستم کا شکوہ کیا معنے رکھتا ہے"؟

شیریں نے مستفسرانہ اجنبی کو دیکھا۔ اور خاموش رہی۔ اجنبی کہتا گیا۔

"چند سال پیشتر جبکہ اہل بلخ کے دل میں یہ یقین پیدا ہو چکا تھا۔ کہ وہ ظالم ہنوں کے مظالم برداشت کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں ہم میں سے ایک شخص اُٹھا۔ اور اس نے اہل بلخ کے سینوں میں سوئے ہوئے جذبۂ وطن پرستی کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنا چاہا!۔ اور اسی قابل احترام فرض کی ادائیگی میں پہلے اپنی آنکھیں اور پھر اپنی جان دے دی۔ یہ وقت اسی شخص کی ہے"!

"کون اندھا بوڑھا —"؟ شیریں نے سوال کیا۔

"اندھا بوڑھا — ہاں وہی محترم انسان"!

"شیریں کی نگاہوں کے سامنے اندھے کی موت کا منظر پھرنے لگا۔

"تم کچھ سوچ رہی ہو؟" اجنبی نے پوچھا۔

"نہیں — مگر تم کہتے جاؤ!"

"میں نے بتا دیا، کہ دف اس جاں نثار وطن کی ہے۔ اس لئے ہر محب وطن کو اس سے محبت ہے۔ اور —"

"وہ کون تھا؟" شیریں نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"ایک محب وطن!" اجنبی نے شیریں کے ہاتھ سے دف لیتے ہوئے کہا۔

"ایک محب وطن — مگر کون؟" شیریں کے لبوں سے نکلا۔

"میری اس سے سب سے پہلی ملاقات عجیب طریقے پر ہوئی تھی۔ میں شام کی تاریکی میں گھر واپس آ رہا تھا۔ کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان سے دردناک آوازیں میرے کان میں آئیں۔ میں اس طرف بھاگا۔ اور ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ کہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا۔ میری پشت پر گہرا زخم آیا۔ اور میں گر پڑا۔ چند منٹ کے بعد کوئی مجھ سے ٹکرایا۔ اور پھر مجھ پر گر پڑا۔ کافی دیر گذر گئی۔ یکایک میرے کان میں مدھم سی آواز آئی۔

"بیٹی شیریں!"

"بیٹی شیریں؟" شیریں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہاں — میں ناقابلِ برداشت درد کے باوجود اُٹھنے لگا۔ اپنے سینے پر پڑے ہوئے بوجھ کو ہٹایا — پھر آواز آئی۔

"شیریں!"

شیریں کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ سانس رُک گیا۔ اور وہ اجنبی کے بالکل قریب ہو گئی۔ اجنبی کہے جا رہا تھا۔

"میں نے دیکھا۔ کہ ایک شخص مجھ پر گر پڑا ہے۔ میں نے اُسے آہستہ آہستہ اُٹھایا۔ اور سہارا دے کر بٹھایا۔ میں نے دیکھا۔ کہ یہ ایک بوڑھا شخص ہے۔ اور بار بار میری شیریں، میری شیریں پکار رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ اس نے بتایا۔ کہ ظالم ہن نے اس کی بیوی کو ہلاک کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی بیٹی کو بھی لے گیا ہے!"

"اُس کا نام کیا تھا؟"

"اس کا نام نادر تھا۔ اگرچہ وہ شہر میں اندھے گویّے کے نام سے مشہور ہو گیا" اجنبی نے جواب دیا۔

"نادر نقاش!" شیریں کے لبوں سے بیتابانہ نکلا۔

"ہاں وُہ ظروف پر نقش و نگار کیا کرتا تھا!"

"وُہ ——— وُہ؟"

"کیا ہے مطربہ؟" اجنبی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وُہ بوڑھا میرا باپ تھا۔ اور میں اس کی کھوئی ہوئی اکلوتی بیٹی شیریں!" شیریں نے آہستہ آہستہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"تم اس کی بیٹی ——— شیریں؟"

"ہاں میں ہی وُہ بدنصیب لڑکی ہوں!"

اجنبی تعجب انگیز نظروں سے مطربہ کو دیکھنے لگا۔

"تو تم کہاں رہیں؟"

"یہ ایک طویل داستان ہے۔ یہ سمجھ لو۔ کہ جہاں رہی دکھ اٹھاتی رہی۔ سخت جان تھی۔ کہ زندہ رہ سکی ——— ؟"

"کیسا عجیب غریب اتفاق ہے؟"

"پھر کیا ہُوا؟ میرے باپ کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا؟" شیریں نے پوچھا۔

"اجنبی چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"نادر بار بار بہن کے پیچھے جانے کے لئے اُٹھتا تھا۔ مگر میں اسے روک لیتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ کہ طرح جانا موت کے منہ میں جانا ہے۔ صبر کرو۔ اگر قسمت نے یاوری کی۔ تو بیٹی مل جائے گی۔ اس طرح جان گنوانا فضول ہے۔ میری مسلسل کوششوں کا یہ اثر ہوا۔ کہ وُہ رک گیا۔ اس نے میرے زخم پر پٹی باندھی۔ اور ہم نے عہد کر لیا۔ کہ تا دم واپسیں ظالم حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ لگاتار کوششوں کے بعد ہم نے ایک ایسی جماعت بنائی جس کا مقصد اہل وطن کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ ——— انہی کوششوں میں اس کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔"

شیریں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اجنبی کہنے لگا۔ "اس کی آواز انتہائی دلآویز و پُرسوز تھی۔ اس لئے اُس نے گویا بن کر حکمران کے دربار میں گانا شروع کر دیا۔ اور دف بجا بجا کر گانے لگا۔ حکمران کو اس کی آواز بے حد پسند آئی۔ اور وُہ اسے ہر روز طلب کرنے لگا۔ نادر نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اور جس مقصد کے لئے دربار میں جانا شروع کیا تھا۔ وُہ انجام دینے لگا۔ یعنی جاسوسی۔ وُہ ہر روز حکومت کے

ظالم کارندوں کے خلاف حکمران کے کان بھرنے لگا۔ ظاہر ہے۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ کارندے ظالم ہیں۔ کیونکہ اہلِ بلخ پر ظلم کرنا انہوں کا مذہب ہے۔ وہ ان کارندوں پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام لگاتا تھا۔ چونکہ حکمران کو نادر پر پورا اعتماد تھا۔ اس لئے وہ بے چون و چرا ان ظالموں کو قید کر دیتا ——— یا موت کے گھاٹ اتار دیتا ——— نادر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا رہا۔ آخرکار بن اس سے بدگمان ہو گئے۔ اور اس کی موت پر کمربستہ! میں نے حقیقت کا جائزہ لیا۔ اور نادر کو دربار میں جانے سے روکا۔ مگر وہ کہنے لگا۔

"میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اور اسی فرض کی ادائیگی میں میری جان جائے گی۔" میں خاموش ہو گیا۔ آخری دن جب وہ دربار جانے لگا۔ تو راستے میں مجھ سے کہنے لگا۔ "میرے رفیق! جو آگ میں نے جلائی ہے۔ دیکھنا وہ بجھ نہ جائے۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج میری زندگی کا کمزور شعلہ تھرتھرا رہا ہے۔ شاید اس کے بجھنے کا وقت آگیا۔" میں نے اسے تسلی دی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں پہاڑی پر کھڑے ہو کر حسبِ معمول اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ کہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں زخموں سے نڈھال تھا۔ نادر کا خیال آتے ہی میں ہزار مشکل سے نیچے اترا۔ یکایک میری نگاہ نادر کی لاش پر پڑی۔ میں نے سمجھ لیا۔ کہ انہوں نے ہمارے راہنما کو قتل کر دیا ہے۔ اور دشمن لے گئے ہیں۔ معاً میں نے سوچا۔ کہ اپنی غافل جماعت کو خطرے سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنی قیام گاہ کی طرف دوڑا ——— مگر خون کے زیادہ بہہ جانے سے گر پڑا۔ اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ رات کے آخری حصے میں مجھے ہوش آیا۔ میں قدم ہی چلا تھا۔ کہ اطلاع ملی۔ جماعت کے تمام افراد قتل کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور آج پھر ایک وطن پرست جماعت تیار ہو گئی ہے ——— اور جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسی محترم انسان کی کوششوں کا نتیجہ ہے!"

شیریں بڑے غور سے اجنبی کی باتیں سن رہی تھی۔ اجنبی کو خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا: "مگر تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا۔ کہ یہ دف اُن کی ہے؟"

"یہ دیکھو" اجنبی نے دف کے کنارے بندھے ہوئے مختلف رنگ کے دھاگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب ہماری مختصر سی جماعت قائم ہوئی۔ تو ہم میں سے ہر شخص نے اپنا اپنا دھاگا یہاں باندھ کر قسم کھائی۔ کہ وہ مرتے دم تک وطن کا وفادار رہیگا ——— یہ دھاگے ہماری قسموں کی نشانیاں ہیں ——— یہ دیکھو سرخ دھاگا، یہ تمہارے باپ کا ہے!"

شیریں نے دف اجنبی سے بے تابانہ لے لی۔ اور سرخ دھاگے کو چوم لیا۔ اجنبی کی نگاہیں چمکنے لگیں۔ اُس نے پوچھا۔

"اب تم بتاؤ یہ دف کہاں سے حاصل کی؟"

"شیریں نے تمام واقعہ سنایا۔ اور یہ بھی بتایا۔ کہ نادر نے مرتے وقت کس طرح اپنے لہو سے دف پر "وطن" لکھا تھا۔

دونوں کی نگاہیں دف پر پڑیں ——— دف پر سرخ سرخ لکیریں نظر آرہی تھیں۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر شیریں پر جوش لہجے میں کہنے لگی۔

"وطن کے لئے میرے باپ نے جان دی۔ اور اسی فرض کے لئے میں بھی اپنی جان دوں گی!"

"شیریں!" اجنبی کے لبوں سے نکلا۔

"وطن پرست کی بیٹی وطن کو مصائب میں دیکھے۔ اور خاموش رہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؛ میں اپنے وطن کو آزاد کراؤں گی ——— وطن! ——— میرا پیارا وطن!" شیریں نے ولی جوش سے کہا۔

"تو سچ کہہ رہی ہے بیٹی!"

"اس کا جواب میرا عمل دے گا۔ مجھے بھی اپنی جماعت میں شامل کر لو!"

"مجھے تم سے یہی امید تھی شیریں! کل شام کو مجھے یہیں ملنا۔ اب جاؤ!"

"کل شام کو؟"

"اسی جگہ؟"

"ضرور آنا!"

"اس کی فکر نہ کرو بیٹی! اور وہاں یہ دف تمہارے ہاتھوں ہی میں رہے گی!" اس کے بعد اجنبی نے شیریں کو اپنا نام وغیرہ بتایا۔ اور پھر چلا گیا۔ شیریں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہر کی جانب چلنے لگی۔

——— (۵) ———

شیریں جب گھر پہنچی تو اسے محسوس ہوا۔ کہ وہ بے چینی جو ہر وقت اُس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ بہت حد تک دور ہو چکی ہے۔ اور اس کی بجائے ایک قسم کا لذت انگیز درد رگ و پے میں سما رہی ہے۔ دف پہلے ہی اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ اور اس واقعے کے بعد تو وہ اُسے اور بھی زیادہ عزیز ہو گئی اور کیوں نہ ہوتی۔ آخر اس کے جانفروش باپ کی نشانی تھی چنانچہ وہ اسے محبت انگیز نظروں سے دیکھ رہی تھی ——— کہ شمدس آ گیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ "شیریں! تمہیں معلوم ہے۔

باہر کیا کچھ ہو رہا ہے ؟

"کیا ہو رہا ہے ؛ غریب مخلوق پر ظلم" شیریں نے درد انگیز لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور جب تک ہن یہاں ہیں۔ ہوتا رہے گا۔ مگر میں تمہیں ایک اور بات بتانے والا ہوں!"

"کیا بات ہے وہ؟"

"وہ بات یہ ہے۔ کہ تمہارے گانے کی شہرت بلخ کے چپے چپے میں پھیل گئی ہے!"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے" شیریں نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے تمہارا مستقبل بہت شاندار نظر آرہا ہے —— مگر یہ تو بتاؤ بڑے مرتبے پر پہنچ کر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟"

"ہرگز نہیں، چچا! تم ایسی باتیں کیوں کرنے لگے؟"

"اگر تمہارا دل نہیں چاہتا۔ تو میں کوئی بات نہیں کرتا!"

"میرا دل —— میرا دل کیا کچھ نہیں چاہتا" شیریں نے چھت پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "مگر ایسا ہو کر رہے گا۔ خواہ اس میں ——!"

"کیا ہو کر رہے گا بیٹی؟" شمس نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" شیریں نے سنبھل کر جواب دیا۔ "ذہن میں ایک خیال آیا تھا —— ہاں تم کہتے ہو میں بڑے مرتبے پر پہنچ جاؤں گی؟"

"ظاہر ہے۔ ایسا ہو گا!"

"تو ایسا ہونا چاہیئے" یہ کہہ کر شیریں دھت سے کراٹھی۔ اور چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔

جب انسان کے دل پر ایک خاص جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ تو نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔ وہ رات شیریں کی بھی بے خوابی میں گزر گئی —— علی الصبح وہ اٹھی اور اپنا فرض ادا کرنے کے لئے بازار میں چلی گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ لوگ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں جدھر وہ نظر کرتی۔ لوگوں کا جم غفیر دکھائی دیتا۔ وہ گاتی رہی —— نغموں کے دریا بہاتی رہی۔ اور جب شام ہونے کو آئی۔ تو اس مقام کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ جہاں ہرمز اجنبی نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ابھی وہاں پہنچی ہی تھی۔ کہ ہرمز بھی آگیا۔ اور اسے وطن پرستوں کی پراسرار جائے قیام پر لے گیا۔ شیریں نے دیکھا۔ کہ پہاڑوں میں گھرے ہوئے ایک مختصر سے میدان میں متعدد اشخاص جمع ہیں۔ جونہی انہوں نے ہرمز سے سنا۔ کہ ان کے مرحوم راہنما کی لڑکی جانفروش باپ کے نقش قدم پر چلنے کو تیار ہے۔ ان کے چہرے فرط مسرت سے

چھکنے لگے۔ مختصر سی گفتگو کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ شیریں اپنے والد کی طرح دربار میں رسائی حاصل کرے۔ یہ سن کر شیریں کی رگ رگ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اور وہ تصورات کا ہجوم دماغ میں لئے گھر کی طرف روانہ ہو گئی!

(۲)

شیریں کا اصول ہو چکا تھا۔ کہ علی الصبح گھر سے نکل کر بازاروں میں جاتی۔ امرا و وزرا کے مکانوں کے سامنے گاتی اور جب تھک جاتی تو گھر آ جاتی۔ اور شام کے قریب وطن پرستوں کی قیام گاہ کو چلی جاتی۔ وہاں پہنچ کر دن بھر کے واقعات سناتی۔ اور دوسرے دن کے پروگرام کے سلسلے میں تازہ ہدایات لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جاتی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ چند دن تک تو اس نے شمدس کو اپنی نئی سرگرمیوں سے آگاہ نہ کیا۔ مگر جب دیکھا کہ وہ صحیح معنوں میں محب وطن ہے۔ اور اس کا تعاون بے حد فائدہ رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ تو اسے بھی جماعت میں شریک کر لیا۔ اس طرح ایک طرف تو اس کی پُر اسرار سرگرمیاں، گوناگوں مصائب و موانع کو اپنے راستے سے ہٹا کر قوت حاصل کرتی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف اس کی شہرت بلخ کے گوشے گوشے میں مہر نیم روز کی شعاعوں کی مانند پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک مہینے سے وہ اپنے فرائض انتہائی کامیابی کے ساتھ ادا کر رہی تھی۔ اس عرصے میں متعدد امرا و وزرا نے اسے اپنے ہاں بلایا۔ اور اس کے حُسن و نغمہ سے متاثر ہوئے۔ اور کئی ایک تو اس کی محبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ ایک تو لحن داؤدی اور اس پر حُسن جانسوز۔ کونسا دل تھا۔ جو اس مظہرِ جمیل سے متاثر نہ ہوا، کونسی آنکھ تھی۔ جو اس حسن کی دیوی سے چندھیا نہ گئی، اور شیریں —— بلخ کے حسن پرست دلوں اور آنکھوں پر حکومت کرنے والی ساحرہ، حسن پرست دلوں اور آنکھوں کو فرشِ راہ بناتی۔ آندھی کی سی تیزی کے ساتھ تختِ بلخ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اپنی یہ قدر و قیمت دیکھ کر اس نے بازاروں میں گانا بند کر دیا۔ اور صرف امرا کو نوازنے لگی۔ آج بھی علی الصبح وہ غور کر رہی تھی۔ کہ کس امیر کے ہاں جائے۔ کیونکہ کئی امیروں نے اسے بلا بھیجا تھا۔ ابھی اس کا ذہن فیصلہ کرنے میں منہمک تھا۔ کہ شاہی دربار سے پیغام آیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ بلخ کے حکمران نے اسے طلب کیا ہے۔ اس مژدۂ جانفزا کو سنتے ہی اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ اسی مرقعے کا تو وہ انتظار کر رہی تھی۔ عجلت سے دوسرے کمرے میں گئی۔ اپنی عزیز ترین شے "دف" کو محبت اور خوش نگاہوں سے دیکھا۔ دیکھا اور سینے سے لگا لیا۔ دو قطرۂ اشک اس کی آنکھوں سے نکلے۔ اور دف پر گر پڑے اور خون کی مدھم سی لکیروں میں جذب ہو گئے۔ اس کے دل میں ہیجان سا پیدا ہو گیا اس کے ہونٹ تھر تھرائے اور وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"میرے آنسو —— نقش وطن میں جذب ہو گئے۔ اس طرح —— کاش اس طرح میرا جسم، میری روح، میرا دل بھی پیارے وطن آزادی کے راستے میں بٹ جائے" اس نے دف پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اور خیالات کے ہجوم میں کھو گئی۔ یکایک اسے خیال آیا کہ

وہ تو محل میں جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی تزئین و آرائش میں مصروف ہو گئی۔ اور جب شاہی محل میں پہنچی۔ تو اس کا دل عجیب و غریب خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔۔۔ اس کا چہرہ نہایت متین و سنجیدہ تھا۔ اور نگاہیں خالیچے پر جمی تھیں تاجدار بلخ نے اسے مسکرا کر بلایا۔ شیریں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس کے خون شباب سے شاداب رخساروں پر مچلتی ہوئی سیاہ زلفیں یوں نظر آنے لگیں۔ گویا دنیائے رومان کی رنگین فضاؤں میں شب بغداد کے سایے تیر رہے ہیں۔ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی بط کی مانند یا فضا میں تھرتھراتے ہوئے نغمے کی طرح وہ قدم اٹھاتی ہوئی حکمران بلخ کے قریب پہنچ گئی۔

"ہم نے تمہارے گانے کی تعریف سنی ہے۔ واقعی تم اچھا گاتی ہو؟" بلخ کے حکمران بلامیر نے پوچھا۔

"حضور کوئی چیز اس وقت تک مشہور نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس میں خوبی نہ ہو۔" شیریں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم اچھا گا سکتی ہو؟"

"اگر اچھا نہ گا سکتی۔ تو یہاں تک کیونکر آ سکتی تھی؟" مطربہ نے جواب دیا۔

حکمران بلخ نے شیریں کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہ مطربہ کی اس جرأت و بیباکی پر حیران تھا۔

"تمہیں خود پر بہت اعتماد معلوم ہوتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ اعتماد تمہیں دھوکا تو نہیں دے رہا؟"

"حضور کی توجہ فرمائی کا شکریہ! مگر میں یہ پوچھتی ہوں۔ کہ اگر یہ ثابت ہو گیا۔ کہ میرا اعتماد مجھے دھوکا نہیں دے رہا۔ تو پھر؟"

"تو پھر تمہاری قدر کی جائے گی۔" بلامیر نے کسی قدر برافروختہ ہو کر کہا۔

"قدر تو میری دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔" شیریں نے بیباکانہ کہا۔

"تو بادشاہ اور رعیت کی قدردانی میں فرق نہیں کر سکتی؟" بلامیر نے پوچھا۔

"نہیں، کیونکہ مجھے معلوم نہیں بادشاہ کی قدردانی کیا ہوتی ہے؟" شیریں نے مسکرا کر کہا۔ اور دف بجا کر گانے لگی۔ وہ دیر تک گاتی رہی۔ اس دوران میں بلامیر کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے سے نہ ہٹ سکیں۔ جب اس نے گانا ختم کیا تو بلامیر نے اسے پاس بلایا۔

"تو نہیں جانتی۔ بادشاہ کی قدردانی کیا ہوتی ہے؟" حکمران نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں حضور! مجھے اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔"

"تو خوش ہو آج وہ موقعہ تمہیں مل گیا ہے!"

"میں حضور کی شکر گزار ـــــ!"

شیریں فقرہ ختم کرنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ بن بادشاہ نے اُسے کھینچکر اپنے پہلو میں بٹھا لیا ـــــ مطربہ کی بارگاہِ ناز میں بلخ کے حکمران کا یہ پہلا خراج تھا۔

(۷)

شیریں چند دنوں ہی میں بادشاہ کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اس مرحلے کے بعد اسے اپنے حقیقی پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ اور اس کے لئے محبانِ وطن سے استصواب رائے ناگزیر۔ مگر محل کی گوناگوں پابندیوں نے اُسے اس طرح مجبور رکھا تھا۔ کہ وہ باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ کئی دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں اس نے محبانِ وطن کی قیام گاہ پر جانے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر بے سود!

ایک دن وہ پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ کہ اس کے قریب درخت پر ایک تیر لگا۔ اُس تیر سے ایک کاغذ چپٹا ہوا تھا۔ شیریں نے تیر نکال کر کاغذ اتارا۔ کھولا اور پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا تھا: "سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ اپنا فرض ادا کرتی جاؤ۔ ابھی راہ میں کئی مشکلات حائل ہیں۔ ہم سے ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں۔" نیچے ہرمز کا نام لکھا تھا۔

اس عبارت کو پڑھ کر شیریں کا دل مطمئن ہو گیا۔ اور اس نے محبانِ وطن سے ملاقات کرنے کا ارادہ ترک کر کے محل میں زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ بادشاہ اس پر سو جان سے فدا تھا۔ اس لئے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شیریں نے موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انتہائی عروج و اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے ایک کنیز کو اپنا ہمراز بنا لیا۔ اور کبھی کبھی رات کو خادمہ کا لباس پہن کر محبانِ وطن کی قیام گاہ پر جانے لگی۔ ایک رات وہ حسبِ معمول وہاں سے آ رہی تھی۔ کہ راستے میں ایک ٹیلے کے پاس اُسے کوئی تڑپتا ہوا نظر آیا۔ وہ عجلت سے وہاں پہنچی۔ اور دیکھا۔ کہ ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان خون میں شرابور سسک رہا ہے۔ اپنے ایک ہموطن کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل تڑپ گیا۔ وہ زخمی نوجوان پر جھکی۔ اور اس کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد زخمی نوجوان نے آنکھیں کھول دیں۔ اور شیریں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"کس نے زخمی کیا ہے تم کو؟" شیریں نے پوچھا۔

"ان ظالموں نے ـــــ مگر آپ کون ہیں؟" زخمی نوجوان کے لبوں سے نکلا۔

"ایک معمولی عورت ـــــ کیا میرے لباس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی؟" شیریں نے کہا۔

زخمی اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ابھی نہیں۔ مجھے زخموں پر پٹی باندھ لینے دیجئے۔" یہ کہکر شیریں نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑا۔ اور اُس کے زخموں پر پٹی باندھنے لگی۔ اس دوران میں زخمی ممنونانہ انداز میں اپنی محسنہ کو دیکھتا رہا۔

"اس مہربانی کا کیونکر شکریہ ادا کروں؟"

"خاموش رہ کر۔" شیریں نے متبسم ہوکر کہا۔ "یہ میرا فرض تھا۔ جو میں نے ادا کر دیا ہے!"

"اب مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجئے!"

"فرض؟ تم پر کوئی فرض نہیں۔ شکریے کی بجائے تم مجھے اپنے نام اور اس واقعے کی اصلیت سے آگاہ کر سکتے ہو!"

"واقعہ یہ ہے۔ کہ میں حکومت کی نظروں میں باغی سمجھا گیا ہوں۔ حالانکہ یہ الزام کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ ایک عرصے سے میں چھپ چھپا کر زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر آج رات کو سپاہیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا۔ مگر بدقسمتی سے گھوڑا ضعیف تھا۔ اور یہاں آکر بالکل تھک گیا۔ دشمن سر پر آموجود ہوئے۔ مقابلہ تو میں نے کیا۔ مگر کہاں ایک اور کہاں دس بارہ۔ مجھے کئی زخم آئے اور میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ انہوں نے مجھے مردہ سمجھکر چھوڑ دیا۔ یہ ہے تمام واقعہ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھ سے زیادہ میری محسنہ جانتی ہے!"

"لیکن تمہیں باغی کیوں سمجھا گیا؟" شیریں نے پوچھا۔

"یہ میں خود نہیں جانتا!"

"آخر کوئی وجہ تو ہوگی!"

"حکومت کی نگاہوں میں ضرور ہوگی!"

"تعجب ہے!"

"تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے — اور ہاں تم نے میرا نام پوچھا تھا؟"

"پوچھا تو ضرور تھا — اگر تم بتا دو!"

"کیوں نہ بتاؤں — سب کچھ بتا دیا۔ تو نام بتانے میں کیا حرج ہے — تم مجھے فریدوں کے نام سے یاد کر سکتی ہو!"

"فریدوں — فریدوں!! بہت خوب نام ہے!"

"ہوگا — اب تمہاری باری ہے، میری محسنہ!"

"میں نے تو بتا دیا کہ میں ایک معمولی درجے کی عورت ہوں ـــــ ایک غریب کسان کی بیٹی ہوں اور نام ہے سارہ!"

شیریں نے فریدوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سارہ! بڑا پیارا نام ہے"۔

"ہو سکتا ہے"۔ شیریں نے بے پروائی سے کہا۔

"سارہ!"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"تم رہتی کہاں ہو؟"

"ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں!"

"ٹوٹا پھوٹا مکان ہی سہی مگر وہ ہے کہاں؟"

"یہاں سے دور ـــــ بہت دور ـــــ!"

"تو تم رات کو اکیلی!"

ابا ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں نکلی تھی ـــــ ویسے بھی ہم لوگوں کو جنگلوں سے خوف نہیں ہوتا ـــــ عادی ہو گئے ہیں!

اس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اور جب شیریں اٹھی۔ تو اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا اور وہاں سے اٹھنا اسے ناگوار ہو رہا تھا۔

"پھر کب ملو گی سارہ!" فریدوں نے پوچھا۔

"پرسوں!" شیریں نے جواب دیا۔

"پرسوں۔ کل کیوں نہیں؟"

"شاید کل نہ آ سکوں ـــــ" یہ کہہ کر اس نے مسکرا کر فریدوں کو دیکھا۔ اور روانہ ہو گئی۔ فریدوں وہیں کھڑا رہا۔ چند قدم چلنے کے بعد شیریں ٹھہر گئی۔

"اب تم کہاں جاؤ گے فریدوں! اس حالت میں؟"

"میرا ٹھکانہ ہے — مطمئن رہو — سارہ!" فریدوں نے کہا۔

شیریں واپس آگئی۔

"لیکن دشمن؟"

"جہاں میں ہوں وہاں دشمنوں کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا!"

شیریں مڑی اور چلنے لگی — دور جا کر اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ فریدوں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ اور تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ اور چند منٹ کے بعد فریدوں کی نظروں سے غائب ہو گئی۔

(۸)

رات ابتدائی منزل طے کر رہی تھی۔ فریدوں دریا کے کنارے، چٹان پر بیٹھا، اپنی انگلیوں سے نم آلود زمین پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک دو منٹ کے بعد اس نے ٹھنڈی آہ بھری، انگڑائی لی۔ اور پھر اپنی نگاہوں کو سامنے زمین پر گاڑ دیا۔ مٹی پر جابجا سارہ سارہ لکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور وہ ایک اور انگڑائی لے کر خیالات میں محو ہو گیا۔ اپنی محبوبہ سارہ (شیریں) سے وہ سات بار مل چکا تھا۔ اور اس دوران میں محبت کا وہ رشتہ جس نے پہلی ہی ملاقات کے وقت دونوں کی روحوں کو جکڑ دیا تھا، اتنا مضبوط، اتنا مستحکم ہو گیا تھا، کہ دنیا کے گوناگوں حوادث، زندگی کے مختلف واقعات اسے توڑنے میں یکسر ناکام رہتے۔ انہی ملاقاتوں کے دلآویز مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اور اس طرح کئی منٹ گزر گئے۔ یکایک گزشتہ واقعات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اور وہ رنگین تصورات کی عطر آگیں موجوں کے آغوش میں بہتا ہوا، سینۂ مستقبل کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ سارہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اسے متبسم نگاہوں سے دیکھ کر عمر بھر کا پیمان وفا باندھ رہی ہے۔ اس عالم پر کیف میں کسے اپنی خبر رہ سکتی ہے۔ چنانچہ فریدوں پر بھی محویت طاری تھی — اتنی محویت کہ ایک خمیدہ قامت — کریہہ المنظر بوڑھا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ مگر اسے خبر نہ ہوئی — چند لمحے بوڑھا خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ پھر چٹان پر اپنا دایاں پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔ "بیٹا! کیا سوچ رہے ہو؟"

فریدوں نے بوڑھے کی طرف دیکھا اور فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کچھ نہیں — کچھ بھی نہیں!" فریدوں نے کہا۔

"کچھ نہیں — وہ کیونکر؟" بوڑھے نے کسی قدر حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "تم کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہو۔ شاید اپنی حالت

پر اظہار ناسست ہے — تم غلط کہہ رہے ہو؟"

"ایسا ہونا لازمی تو ہے — مگر مجھے تنہائی پسند ہے!"

بوڑھے نے نوجوان کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا، اور اپنا پاؤں چٹان سے ہٹا لیا۔

"جو شخص لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنا چاہے، وہ تنہائی کو پسند کرنے لگتا ہے۔ مگر فریدوں! یہ تو کہو کیا کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا، کہ حکومت نے تمہیں باغی کیوں سمجھا ہے —— جب تم اس پر غور کرتے ہو، تو تمہارے دل میں کیا خیال پیدا ہوتا ہے؟"

"کئی قسم کے خیالات —— مگر سب سے بڑا خیال جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس امر کے پیچھے کوئی بہت بڑا راز ہے!"

"اور بیٹا! آج میں تمہارے سامنے اس راز کا انکشاف کرنے والا ہوں!"

"اس راز کا انکشاف!"

"ہاں، آج میرے ہونٹ ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں" بوڑھے نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ چاند اسرار و رموز کی ایک دُنیا سینے میں لئے ایک اونچے درخت میں سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ فریدوں اس منظر کو دیکھنے لگا۔

"واقعی تم نے ٹھیک سوچا۔ اس امر کے پیچھے بہت بڑا راز ہے۔ اور یہ راز کیا ہے سنو!" بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

"تمہارا باپ جن فوج کا سپہ سالار تھا۔ اور بادشاہ کا عزیز دوست بھی۔ اس پر کئی لوگ اس کے حاسد بن گئے۔ اور اُسے طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ ان لوگوں نے، جیسا کہ قاعدہ ہے، بادشاہ کو بھی اس کے خلاف بھڑکایا۔ مگر بادشاہ کو تمہارے باپ پر بہت اعتماد تھا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ دشمنوں کی تمام تجاویز خاک میں مل گئیں۔ تاہم اُن سیاہ باطن شخصوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس دوران میں تمہارے باپ کو ایک عجمی عورت سے محبت ہو گئی —— اور چند دنوں کے بعد دونوں شادی کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔ اس عورت کے شکم سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام سب سے بڑے جن کے نام پر 'ترمان' رکھا گیا —— جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ تمہارے باپ کے بے شمار دشمن اپنی بدطینتی کا ثبوت دے رہے تھے۔ اور ان کی کوششیں کامیاب ہوتی جا رہی تھیں۔ جب ترمان چار سال کا ہوا، تو اس کی ماں فوت ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسے واقعات بروئے کار آئے، جن کی بنا پر بادشاہ کو تمہارے باپ کے خلاف بغاوت کا شبہ ہو گیا۔ حاسدوں کو موقعہ ہاتھ آیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ تمہارا باپ قید کر دیا گیا، اور 'ترمان' ایک عجمی خاندان میں پرورش پانے لگا۔ اور اس کا اثر جو ہونا تھا، ظاہر ہے۔ ترمان فریدوں بن گیا!

"میں — ترمان ؟ ہن ؟" نوجوان کے لبوں سے عالم حیرت و استعجاب میں نکلا۔

"ہاں تمہیں ترمان ہو! —— اب آگے سنو! کئی سال بعد تمہارا باپ قید خانے سے بھاگ آیا۔ اس وقت تم نوجوان تھے۔ اور تمہیں اپنے باپ کی قطعاً خبر نہیں تھی۔ تمہارا باپ تمہارے پاس آیا تم اس سے ملے۔ اس طرح ملے جس طرح ایک اجنبی دوسرے سے ملتا ہے۔ تمہارے باپ نے ایک جماعت تیار کر لی۔ اور اس جماعت میں تم بھی شامل تھے۔ اگرچہ تم اس کے حقیقی مقاصد سے ناواقف تھے۔ تمہارے باپ کو باغی سمجھا گیا تھا۔ اور اب جو دشمنوں نے دیکھا۔ کہ وہ خفیہ طور پر بہادروں کی جماعت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تو ان کے حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بادشاہ نے اس جماعت کے ہر ایک فرد کو قتل کرنے کے لئے سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ چنانچہ کئی لوگ قتل ہو گئے —— اب تمہیں معلوم ہو گیا۔ کہ تم پر بغاوت کا کیوں الزام لگایا گیا ہے ؟"

"ہاں —— مگر میرا باپ —— کیا وہ بھی قتل ہو گیا ؟" نوجوان نے مضطربانہ پوچھا۔

"نہیں وہ زندہ ہے !"

"کہاں ؟ میں نے اسے نہیں دیکھا ؟"

"دیکھنے کا کیا سوال تم نے متعدد بار اس سے باتیں کیں —— اور"

"مگر وہ کون —— ؟"

"بے صبر نہ ہو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ مگر پہلے یہ بتاؤ۔ کہ تم اپنے باپ کو باپ ہی سمجھو گے ؟"

نوجوان حیرت سے بوڑھے کو دیکھنے لگا۔

"تم حیران ہو گئے حالانکہ یہ حیران ہونے کی بات نہیں۔ باپ بیٹے کا مالک ہوتا ہے۔ اس لئے بیٹے پر باپ کا ہر حکم فرض ہے !"

"یہ کون نہیں جانتا ؟"

"تو سنو! وہ شخص جس نے تمہیں پناہ دی۔ جو شخص تمہیں بیٹا بیٹا کہہ کر پکارتا رہا ہے۔ وہ شخص جو تمہاری ذرا سی بے چینی سے مضطرب ہو جاتا ہے —— وہی تمہارا باپ ہے !"

"کون آپ ؟" فریدوں نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔

"ہاں میرے بیٹے ! میں ہی تمہارا باپ ہوں۔ تم حاکم قوم کے فرد ہو۔ تمہاری رگوں میں ہن قوم کا جرأت انگیز خون موجزن ہے۔

تم خریدوں نہیں ترمان ہو!

نوجوان کے لبوں سے آباکا لفظ نکلا۔ اور وہ بوڑھے سے چمٹ گیا۔

"ترمان! اب جبکہ تم نے اپنے باپ کو پہچان لیا ہے۔ اپنے باپ کے حکم کو سُنو!"

"مَیں ہمہ تن گوش ہوں۔ کہیئے!"

"میرے عزیز بیٹے! تمہارا باپ حکومت کا وفادار رہا ہے۔ اتنی تکلیفوں، اتنی مصیبتوں، اتنی ذلتوں کے باوجود اس کی وفاداری میں فرق نہیں آیا۔ وہ حکومت کا جانفروش وفادار تھا۔ اور تادم واپسیں رہیگا۔ اس لئے تمہیں بھی حکومت کا وفادار ہونا چاہیئے۔ اور یہ وفاداری آج تم سے ایک قربانی چاہتی ہے۔"

"قربانی، کونسی؟"

"تمہارے باپ نے اپنی عزت، اپنی دولت ——— یہاں تک کہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے میں پس و پیش نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتا۔ تو علم بغاوت بلند کر کے حکومت کو الزام لگانے کا مزا چکھا دیتا۔ مگر اس طرح اہلِ بلخ ——— ہماری محکوم قوم کو طاقت حاصل کرنے کا موقع مل جاتا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ یہ تم جانتے ہو! حکومت نے تمہارے باپ کو ذلت کے غار میں گرا دیا۔ مگر وہ حکومت کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہ کر سکا۔ اس طرح تم کو حکومت نے باغی قرار دیا ہے۔ مگر بیٹے! اپنا فرض ادا کرو۔ آج حکومت پر، ایک افتاد پڑی ہے۔ اگر اس سے غفلت کی گئی تو ہن کی سلطنت بلخیوں کی قوت کے جنجے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی!"

"کہیئے آبا! میں بہ جان و دل حاضر ہوں!"

"تم درست کہتے ہو۔ اس کام میں جان کا اندیشہ ہے۔ مگر یہ فرض تم نے ادا کر دیا۔ تو چند دن کے بعد تم فوج کے سپہ سالار ہو گے ——— سارا بلخ تمہارے قدموں پر ہوگا!"

"آبا! وہ فرض کیا ہے ——— مجھے بتاؤ!"

عزیز سُنو! ہمارا بادشاہ ایک بلخی حسینہ کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ اور یہ بلخی حسینہ حکومت کی جڑیں کاٹ رہی ہے ہر روز سربر آوردہ ہن افسر دربار میں قتل کئے جا رہے ہیں۔ اور بلخی بڑے بڑے مرتبے حاصل کر رہے ہیں۔ اس حسینہ نے بادشاہ پر ایسا جادو کیا ہے۔ کہ بادشاہ اس کی ہر خواہش کو اپنی زندگی کا فرض سمجھتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ اگر یہی لیل و نہار رہے۔ تو ہن کی سلطنت جٹ جائے گی۔ کئی سال ہوئے۔ ایک اندھے گرتیے نے بھی بادشاہ کو قابو میں کر کے ہماری قوم کو تباہ کرنا شروع کر دیا تھا

اس کا خاتمہ تو میں نے کر دیا۔ مگر یہ اتفاق معمولی اتفاق نہیں! اس لئے میں چاہتا ہوں ـــــ میں تمہیں تمہاری وفاداری چاہتی ہے کہ تم سلطنت کو اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔"

"وہ کیونکر!" نوجوان نے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ رات کے آخری حصے میں میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں بادشاہ کی محبوبہ کے باغ میں داخل کر دونگا۔ تم وہاں چھپ کر بیٹھ رہنا۔ اور جب وہ ساحرہ اندر آئے۔ تو ایک ہی وار سے ـــــ"

"اُسے قتل کر دوں؟"

"ہاں ـــــ یہ تمہارا فرض ہے۔ اسی طرح سلطنت کو اس بلا سے نجات مل سکتی ہے۔ بولو اس فرض کے لئے تیار ہو ـــــ ان کی سلطنت کو بچانا چاہتے ہو؟"

"مگر میں اس کے باغ میں کیونکر داخل ہونگا۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

"تو میں ـــــ اپنا فرض ادا کرونگا!"

نوجوان نے جوش انگیز لہجے میں کہا۔ "میں سلطنت کی حفاظت کرونگا!"

"میں خوش ہوں میرے عزیز بیٹے! مجھے تم سے یہی امید تھی ـــــ یہ فرض ادا کر کے تم آزاد ہو جاؤ گے۔ نہ صرف آزاد بلکہ فوج کے سپہ سالار بھی ـــــ ہماری جماعت کافی طاقتور ہو چکی ہے۔ آئندہ جو کچھ ہوگا۔ وہ میرے ذہن میں ہے۔ اور ابھی اس کے بتانے کی ضرورت نہیں!"

"میں اپنا فرض ادا کرونگا!"

"ــــ یہی مجھے کہنا تھا ـــــ اب میں جاتا ہوں۔ خبردار احتیاط رکھنا۔ اس خوفناک حسینہ نے جاسوسوں کا جال بچھا رکھا ہے ـــــ!"

"کوئی پروا نہ کریں ـــــ میں ہر طرح محتاط ہوں!"

"میں قیام گاہ پر ہوں۔ جلدی آجانا!"

"آپ جائیں ـــــ میں آجاؤنگا ـــــ"

بوڑھا ایک طرف چلا گیا۔ نوجوان نے زمین پر نگاہیں ڈالیں۔ اور چٹان پر بیٹھ گیا۔

(۹)

شیریں جب محبانِ وطن کی قیام گاہ پر پہنچی۔ اس وقت رات کا ایک پہر گذر چکا تھا۔ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں رات کا قافلہ غیر مرئی ہاتھوں میں ستاروں کی طلسمی شمعوں کو پکڑے آہستہ آہستہ، خاموشی و سکوت کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اور ان شمعوں کی روشنی سے بلخ کا ذرہ ذرہ منور ہو چکا تھا۔ شیریں نے حسبِ معمول دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ اور وہ اندر داخل ہوئی۔ اور دیکھا۔ کہ وطن پرستوں کی ایک کثیر جماعت اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے آتے دیکھ کر ہر ایک کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا۔ شیریں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی جماعت کے جوش کا جائزہ لینے لگی۔ ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ پھر ہرمز اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور پُرجوش لہجے میں کہنے لگا ـــــ "شیریں! وطن کے لئے جو کچھ تم نے کیا ہے۔ وہ بے حد قابلِ احترام ہے۔ آج وطن کے ذرے ذرے کی آنکھیں تمہارے احسانات کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ مگر اصل کام ـــــ اصل فرض ابھی انجام کو نہیں پہنچا۔ بلخ کے تخت پر بدستور خونخوار عرب قابض ہیں۔ وطن کے سینے کو حسبِ معمول وحشی عرب ٹھوکریں لگا رہے ہیں۔ ہمیں وطن کو ان ظالم درندوں کے پنجے سے بچانا ہے ـــــ!"

"درست ہے۔ یہی ہمارا اصل فرض ہے۔" شیریں نے کہا۔ "حکمران میری آنکھوں کے اشارے پر ناچ رہا ہے۔ اور اسی چیز سے فائدہ اٹھا کر میں نے ہزاروں عربوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ ان کی بجائے میرے ہم وطن اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں!"

"یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ہم دشمنوں کی حکومت کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ آج بادشاہ بالکل کمزور ہے اہلِ وطن کے سینوں میں وطن پرستی کی آگ جل چکی ہے۔ ہمیں اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میرا خیال ہے۔ تخت پر قبضہ کر لیا جائے۔"

سب کی نگاہیں مستفسرانہ ہرمز کو دیکھنے لگیں۔

"یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں۔ بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اور پھر ـــــ ایک بغاوت ـــــ اور چند گھنٹوں میں ہمارا وطن ـــــ ہمارا وطن ہو جائیگا۔" شیریں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"یہی ہونا چاہیئے!" ہرمز نے کہا۔

"کل صبح ـــــ سب کچھ ہو جانا چاہیئے ـــــ تم سب کے سب کل محل میں پہنچ جانا۔ اور بادشاہ کے مرتے ہی مبہوت و سراسیمہ

ہنوں کو قتل کرنا شروع کر دینا۔" شیریں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"شیریں"! پاس کھڑے ہوئے شمدس کے لبوں سے نکلا۔ وُہ حیران تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے۔ جو کچھ عرصہ پیشتر گھر سے نکلتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

"مَیں نے جو کچھ کہا ہے۔ وُہ ہو کر رہے گا۔ کل آسمانِ بلخ کے افق پر اہلِ بلخ کی حکومت کا آفتاب طلوع ہو گا"!

"تو بادشاہ کو کیونکر ٹھکانے لگایا جائے" شمدس نے پوچھا۔

"کل شراب پلاتے وقت! کیونکہ یہی بہترین موقع ہے۔ بادشاہ کے ایکدم مرجانے سے ہنوں پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اور وَیسے بھی وُہ جنگ کے لئے تیار نہیں ہونگے —— اُس وقت تم غافل ہنوں پر ٹوٹ پڑنا۔ پھر تخت تمہارا ہے" شیریں نے کہا۔ "مگر کل صبح محل میں بے شمار وطن پرستوں کی ضرورت ہے"!

"اِس کے متعلق تسلی رکھو۔ جتنی محل کی اینٹیں ہیں۔ اتنے ہی جانباز محل میں ہونگے" ہرمز بولا۔

"احتیاط کی سخت ضرورت ہے ——" شمدس نے کہا۔

"جب جان ہتھیلی پر رکھی ہو اسوقت احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی ——" ہرمز نے جواب دیا

"تاہم تم لوگ خفیہ راستے سے محل میں آنا۔" شیریں نے ہرمز کو مخاطب کر کے کہا۔ "خفیہ دروازہ تمہارے لئے کھلا رہے گا"!

"بہتر —— ہم تمہارا ہر حکم ماننے کے لئے بجان و دل تیار ہیں —— ! مجھے یقین ہے۔ کل بلخ کے تخت پر بلخ کی محسنہ رونق افروز ہو گی"! ہرمز بولا

"مجھے تخت کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں —— اپنے محترم باپ کے نقش قدم پر چل رہی ہوں" شیریں نے معصومانہ جوش سے کہا۔

"تاہم اہلِ وطن —— وطن کی محسنہ کے احسانات کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کر سکتے —— اور نہ کر سکینگے"!

شیریں کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وُہ دروازے کی طرف چلنے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر اُس نے مڑ کر مجمع کو دیکھا۔ اور ٹھہر گئی۔

"کل صبح محل میں پہنچنا اور اپنا فرض ادا کرنا —— یہ بات ——"

"ہم بالکل تیار ہیں شیریں! —— کل صبح دیکھو گی ہم کیا کرتے ہیں" ہرمز بولا۔

شیریں نے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ اور باہر نکل گئی۔ پھر مڑ کے دروازہ بند کر لیا۔

وہ تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ مختلف تصورات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ کبھی اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ اور کبھی افسردہ۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر غضب ناک آواز پیدا کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ اور ان کے جسموں سے نرم و نازک پتے لرز رہے تھے۔ آسمان کی پہنائیوں میں، چاند پر کبھی بادل چھا جاتا۔ وہ تین لمحے گزر جاتے۔ پھر چاند بادل کا سینہ چھید کر باہر نکل آتا۔ شیریں کی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اسے اپنے مقصد کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اور وہ تصور کی دنیا میں دیکھنے لگی۔ کہ خون کا سیلاب انسانی نعشوں کو بہاتا ہوا تاریخ کے تخت پر سے گزر رہا ہے۔۔۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اور دریا کے ساحل پر چلنے لگی۔ وہ چل رہی تھی۔ اور اس کا سایہ پانی کی سطح پر لرز رہا تھا۔ آخر وہ اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں اس کا محبوب انتظار کر رہا تھا۔ جونہی فریدوں کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ وہ۔۔۔ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔۔۔ اور محبت انگیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"سابرہ! آج تم نے بڑا انتظار کروایا۔"

"نہیں آج تو میں وقت سے پہلے آ گئی ہوں۔" شیریں نے جواب دیا۔

"انتظار کی گھڑیاں کتنی مشکل سے کٹتی ہیں سابرہ!" یہ کہتے ہوئے فریدوں نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تم کب سے وہاں بیٹھے تھے؟" شیریں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر مجھے اتنا معلوم ہے۔ کہ تمہارا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں تھک گئی ہیں!"

"اور دیکھ لو میں بھی آ پہنچی۔"

فریدوں نے سرد آہ بھری۔ "آ تو پہنچی مگر اتنی تکلیف دینے کے بعد۔"

"جو تکلیف محبت میں اٹھائی جائے۔ وہ تکلیف نہیں راحت ہوتی ہے!"

"تو میں نے شکوہ کب کیا؟ میری سابرہ! اگر تمہارے لئے تمام دنیا کی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ تو بھی میرے لبوں سے شکوے کا ایک لفظ تک نہ نکلے گا۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو!"

اس لئے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ حقیقت ہے۔"

"ہوگی ——؟"

"اوہ شیریں! تم نہیں جانتیں مجھے تم سے کس قدر محبت ہے —— تم اس کا کبھی اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں؟"

"کیوں؟"

"میری محبت کا اندازہ لگانا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا آسمان کے بکھرے ہوئے ستاروں کو شمار کرنا!"

"اور میری محبت کا اندازہ لگانا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا اس پھیلی ہوئی ریت کے ذرّوں کی تعداد معلوم کرنا۔" شیریں نے مسکرا کر کہا۔

دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"مگر سائرہ! تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرتی رہوگی —— دنیا کی کوئی طاقت تمہارے دل کو میرے دل سے علیحدہ نہیں کر سکے گی؟" فریدوں نے سائرہ کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس میں شک ہے؟"

"شک نہیں، میں نے ویسے پوچھا ہے!"

"تمہیں یہ بات ویسے بھی نہیں پوچھنی چاہیئے۔ دنیا کے حالات ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔ مگر ہماری روحوں کو جدا نہیں کر سکتے۔" —————— ممکن ہے۔ زمانے کے تغیرات، زندگی کے فرائض ہمیں جدا جدا رستے پر ڈال دیں۔ لیکن اس عالم میں بھی میں آخری سانس تک تم سے محبت کرتی رہوں گی؟

"فرائض؟" فریدوں نے بے اختیار کہا۔

"فرائض ہمیں مٹا سکتے ہیں۔ مگر ہماری محبت کو نہیں!"

فریدوں خاموشی سے ایک طرف دیکھنے لگا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو فریدوں!"

"کچھ نہیں —— میری سائرہ!" یہ کہتے ہوئے فریدوں نے سائرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں!

"سائرہ تم میری زندگی کی زندگی ہو۔ وہ وقت کتنا دلآویز تھا جب میں نے پہلے پہل تمہیں دیکھا۔ اس وقت میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ زمین کے ذرّے آسمان کے ستارے بنکر چمک رہے ہیں!"

"اور میں محسوس کر رہی تھی۔ کہ آسمان کا چاند میرے پاؤں کو بوسہ دے رہا ہے" شیریں بولی "محبت ایک میٹھا گیت ہے"؟

"کاش ہماری روحیں اس میٹھے گیت میں تحلیل ہو جائیں" یہ کہتے ہوئے فریدوں نے سابرہ کے شانے پر سر رکھدیا۔

ایک دو منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ یکایک شیریں نے فریدوں کا سر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"فریدوں! چند دن ہوئے۔ تم نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی"؟

"کونسی بات میری سابرہ!" فریدوں نے متبسم ہو کر پوچھا۔

"تم نے پوچھا تھا۔ کہ ہم دونوں کب زندگی کے شاہراہ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سفر کریں گے"؟

"ہاں" فریدوں نے کہا۔

"کل صبح یا تو میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤنگی —— یا تا دم واپسیں تمہاری ——"؟

"اور ——" فریدوں آگے نہ بول سکا۔

"کیا —— کہو"؟

"میرا بھی یہی حال ہے —— کل صبح یا تو میں موت کے آغوش میں ہونگا۔ یا محبت کے آغوش میں"؟

دونوں استفسار انگیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"میری سلمٰہ! اگر میں زندہ رہا۔ تو دنیا کی ہر نعمت تمہارے پاؤں پر نچھاور کر دوں گا"؟

"مجھے دنیا کی کسی نعمت کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں یہاں سے دور —— بہت دور کسی غیر آباد گوشے میں چلے جائیں گے۔ اور وہیں اپنی زندگی بسر کریں گے"؟

"تمہاری خواہش میری سب سے بڑی تمنا ہے"! فریدوں نے کہا۔

"تو پھر"؟

"تو پھر کل اس وقت ایک غیر آباد گوشے میں میں ہونگا —— تم ہو گی اور میری محبت ——"؟

"اور اگر ہم میں سے ایک فوت ہو گیا تو"؟

"تو دوسرا بھی دنیا سے رخصت ہو جائے گا"!

"کاش ہم اپنے فرائض میں کامیاب ہوں" شیریں نے آہ بھر کر کہا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے میری سارہ! کہ میں اپنے مقدس فرض کو ادا کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گا۔"

"اور میرے دل کو بھی یقین ہے۔ کہ میرا مقصد ضرور پورا ہوگا۔"

"مگر بعض اوقات فرائض جان کی قیمت پر ادا کئے جاتے ہیں!" فریدوں کے لبوں سے نکلا!

شیریں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فریدوں کو دیکھنے لگی۔

"مگر میری سارہ! میں تمہارے قدموں پر جان دوں گا!"

رات گزرتی جارہی تھی ـــــ دو تین منٹ کے بعد شیریں نے کہا۔ "اب رخصت فریدوں ـــــ!"

فریدوں شیریں کے چہرے پر جھکا۔ اور دونوں کے ہونٹ مل گئے ـــــ چند منٹ کے بعد شیریں محل کی طرف جارہی تھی!

ـــــ (۱۰) ـــــ

شاہی دربار لگا تھا۔ بلخ کا حکمران، شاہانہ تمکنت و وقار کے ساتھ تخت پر جلوہ افگن تھا۔ تخت کے داہنی جانب ایک اور تخت بچھا تھا۔ اور اس پر بادشاہ کی دلنواز محبوبہ شیریں جلوہ افروز تھی۔ شیریں کا تمام چہرہ، سوائے آنکھوں کے رنگین نقاب میں چھپا تھا۔ اور وہ گاہے گاہے متبسمانہ ایک گوشے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ سامنے حکومت بلخ کے عمائد و اکابر کھڑے تھے۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا۔ اور اسی الزام کے باعث وہ قتل کئے جارہے تھے۔ مجرم ملزم کے جرم کی نوعیت بیان کرکے خاموش ہو جاتا۔ شیریں کا ہاتھ اوپر اٹھتا۔ اور اس کے ساتھ ہی جلاد کے ہاتھوں کو حرکت ہوتی۔ اور بدنصیب ملزم کا سر، قریب پڑے ہوئے سرہائے بریدہ میں جا ملتا۔ شیریں کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ اور وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے بادشاہ کو دیکھنے لگتی۔ دیر سے یہ "خونی کھیل" کھیلا جارہا تھا۔ اور بادشاہ تنگ آچکا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"یہ کھیل ختم ہوگا یا نہیں؟"

"کیوں میرے محبوب! ہم حکومت کے باغیوں کو زندہ کیونکر چھوڑ سکتے ہیں؟" شیریں نے جواب دیا!

"مگر حکومت کے اتنے باغی؟"

"ہاں میرے محبوب! یہ ذلیل انسان حکومت کا تختہ الٹنے کی ذلیل کوشش میں مصروف تھے۔ ان کو اور ان کے معاونوں کو فوراً قتل کر دینا چاہیئے ـــــ آپ کچھ بیزار سے معلوم ہوتے ہیں ـــــ مگر کوئی بات نہیں ـــــ میں یہ فرض

بہت جلد دُور کردُوں گی!" یہ کہتے ہوئے شیریں نے ایک گوشے کی طرف خاص انداز سے دیکھا۔ ایک منٹ کے بعد ایک خادمہ ہاتھوں میں ظروفِ زرّیں لئے ہوئے شیریں کے پاس پہنچ گئی۔ شیریں نے شراب سے ساغر بھرا اور مُسکرا کر اُسے بادشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ بادشاہ نے ساغر لبوں سے لگا لیا۔ شیریں نے سرد آہ بھری اور اس کی آنکھوں میں افسردگی سی تیرنے لگی۔ مگر دو تین لمحوں کے بعد یہ افسردگی دُور ہوگئی۔ اور اس کی آنکھیں بدستور مسکرانے لگیں۔

خونی کھیل برابر کھیلا جارہا تھا۔ یکایک ایک جانب سے ہُرمز نمودار ہوا۔ شیریں نے اسے آنکھ کے اشارے سے بلایا۔ اور جب وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ تو شیریں نے آہستہ سے کچھ کہا۔ ہُرمز پیچھے ہٹ کر درباریوں میں غائب ہوگیا۔ چند لمحے اور گزر گئے۔ اچانک ایک طرف سے شور پیدا ہوا۔ شیریں نے مضطرب ہوکر اُدھر دیکھا۔

سپاہی چند آدمیوں کو جن میں فریدوں بھی شامل تھا پکڑے چلے آرہے تھے۔

"حکومت کے باغی ——" ایک سپاہی نے بلند آواز سے کہا۔

"حکومت کے باغی —— ذلیل انسان! فیصلہ کردو ان کا!" شیریں نے گرج کر کہا۔

"آخر حکومت کے اسقدر باغی کیوں ہوگئے؟ معاملہ سمجھ میں نہیں آتا" بادشاہ نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔ فریدوں سمندر کی ایک بیقرار موج کی طرح تخت کے قریب پہنچا۔ شیریں کی نظریں اس پر پڑیں۔ اور مبہوت وششدر ہو کر رہ گئیں۔

"ہم ہرگز حکومت کے باغی نہیں —— ہم سے بڑھ کر حکومت کا کوئی اور وفادار نہیں ہوگا۔ اور اسی وفاداری کا نتیجہ ہے۔ کہ ہم سلطنت کو تباہی کے غار میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے —— بادشاہ سلامت! آپ کے جاں نثار حکومت کے وفادار یہ نہیں برداشت کرسکتے۔ کہ ایک زہریلی ناگن حکومت کے سینے کا خون چوستی رہے۔ اور وُہ غافل ہوکر یہ تماشا دیکھتے رہیں" فریدوں نے بلند آواز سے کہا۔

"زہریلی ناگن؟ کون؟" بادشاہ نے متعجبانہ پوچھا۔

"یہ" فریدوں نے شیریں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہی زہریلی ناگن ہے جو اپنی چال بازیوں سے سلطنت کے پرزے پرزے کررہی ہے۔ جو ایک ایک ہی کو موت کے گھاٹ اتار کر بلخ میں بلخیوں کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے —— اور اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوچکی ہے۔ آپ اس کی چالبازیوں سے غافل ہیں۔ مگر ہم غافل نہیں رہ سکتے۔ آپکے سامنے کیا ہورہا ہے۔ یہ آپ نہیں جانتے؟ قوم کے اکابر قتل ہورہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے یہ باغی ہیں؟ ہرگز نہیں

کیا آپ جانتے ہیں ہم نے بغاوت کی؟ بالکل نہیں۔ پھر اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ آپ اس ملجی ناگن کے اشارۂ چشم و ابرو پر عمل رہے ہیں؟؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم ___" بادشاہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"بادشاہ سلامت! بلخ کی سلطنت تباہ ہو رہی ہے۔ اور وہ بھی آپ کے ہاتھوں ___!"

"کیا ___ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ___ اور" بادشاہ کے لبوں سے نکلا۔

"آپ نہیں جانتے بادشاہ سلامت! ہم ___" فریدوں نے کہا۔ اور وہ حیرت سے بادشاہ کی متغیر حالت کو دیکھنے لگا۔

"خاموش!" شیریں نے گرج کر کہا۔ اس نے نقاب الٹ دی۔ فریدوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور وہ فرطِ حیرت سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"سابرہ!"

"تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت تم کیا کر رہے ہو" شیریں نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ اور تخت سے اٹھ بیٹھی۔

"سابرہ ___ تم ___ تم؟"

"فریدوں! میرے فرض کے راستے سے ہٹ جاؤ ___ ورنہ میں رکاوٹ کو دور کرنا جانتی ہوں!"

"تمہیں شیریں ہو زہریلی ناگن!" فریدوں نے بے اختیاری کے عالم میں کہا۔

"تم نے سنا نہیں ___" شیریں بولی "یہاں سے چلے جاؤ ___ چلے جاؤ فریدوں! مجھے رکاوٹ دور کرنے پر مجبور نہ کرو!"

"اور مجھے بھی اپنے فرض کے راستے سے رکاوٹ کو دور کرنا آتا ہے!" فریدوں نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔ "تو اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلخ پر بلخی حکمران رہیں گے ___ بلخیو!" یکایک وہ قیدیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اس طرح خاموش بیٹھے رہنا انتہائی بزدلی ہے۔ آگے بڑھو اور ایک ایک ملجی کو ٹھکانے لگا دو!"

قیدیوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے جلاد کی تلوار چھین لی۔ اور آگے بڑھ آیا۔

"ٹھہرو او! ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا" شیریں نے للکار کر کہا۔ "دیکھتے نہیں تمہارا بادشاہ مر رہا ہے۔ اور بلخ پر ملجیوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے ___" شیریں نے بادشاہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ___ بادشاہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

اور اپنے ناخنوں سے جسم کو زخمی کر رہا تھا۔ یکایک وہ اٹھا اور زور سے چلایا۔ اس کی آنکھوں اور منہ سے خون بہ رہا تھا۔ تمام لوگوں پر سنسنی چھاگئی۔ بادشاہ شیریں کی طرف مڑا۔ اس کی پیشانی کی نیلی نیلی رگیں ابھر آئیں۔ اور وہ زہر گزیدہ کتے کی طرح مضطربانہ حرکتیں کرنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ وہ شیریں سے کچھ کہے۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ اور دھم سے گر پڑا۔

"یہ تماشا دیکھ رہے ہو ـــــ تم" فریدوں نے قیدیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"فریدوں! تم مجھے بار بار رکاوٹ کے ہٹانے پر مجبور کر رہے ہو۔ اگر اب ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نکلا۔ تو تمہاری گردن اڑا دی جائے گی"

شیریں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ اور ایک طرف دیکھا۔ دور سے محبانِ وطن بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے آرہے تھے۔

"تو کیا میں اپنا فرض بھول گیا ہوں" یہ کہتے ہوئے فریدوں شیریں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمکا اور دوسرے لمحے میں وہ شیریں کے سینے میں پیوست تھا۔

"فریدوں!" شیریں نے گرتے ہوئے کہا

"اب کیا دیکھ رہے ہو۔ دشمنوں کو مٹا دو" ـــــ فریدوں نے قیدیوں کی طرف تیزی کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ ہن تلواریں سونت کر آگے بڑھے۔ محبانِ وطن کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہو گئی۔ یکایک شیریں سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔ "بلخ پر بلخیوں کی حکومت قائم ہو گی۔ ہرمز! ـــــ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب تم ـــــ تم اپنا فرض ادا کرو۔ بلخ کی حکومت پر اہلِ بلخ کا قبضہ ہو گا ـــ بلخ ہمارا وطن ـــــ ہمارا وطن بلخ" یہ کہہ کر وہ گر پڑی۔ دم توڑتے ہوئے بلخی فرطِ جوش میں اٹھ اٹھ کر ہنوں پر حملہ کرنے لگے۔ ایک طرف سے خون میں شرابور ہرمز برق نما رفتار سے آیا۔ اور فریدوں کے پاس پہنچ کر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ دونوں ایک ساتھ گرے۔ محبانِ وطن قریب پہنچ گئے ـــــ ہر طرف تلواریں چمکنے لگیں۔ ہر طرف لاشیں نظر آنے لگیں۔

فریدوں خون میں شرابور، لالہ رنگ فرش پر گھسٹتا، رینگتا چلا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ شیریں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اور پھر اسے شیریں کے قدموں پر رکھ دیا۔ اس کے لب شیریں کے پاؤں پر تھرتھرائے ـــــ ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی ـــــ اور وہ سرد ہو گیا۔ محل اور محل کے باہر قتل و خون کا بازار گرم تھا۔

صحرانورد
کا
ساتواں خط

حکایۂ جنوں

حبیب دلنواز —————————— !!!

اس وقت کہ میں تمہارے لئے تازہ "رومان" لکھ کر اپنی صحرائی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ تمہیں کیونکر بتاؤں۔ کہ تمہارا یہ دور افتادہ دوست تم سے ملنے، تمہارے موجودہ حالات زندگی سننے، اور تمہیں اپنی زبان سے اپنے صحرائی واقعات سنانے کے لئے کس قدر بے تاب ——— کس درجہ مضطرب ہے! کاش تمہارا "رومانی ذوق" تمہیں یہاں کھینچ لائے۔ اس سے ایک تو ہماری سیاحت زیادہ پُر لطف، زیادہ رومان انگیز اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی۔ اور دوسرے تمہاری آرزو بھی پوری ہو جائے گی! اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ میری "تمہیدی عبارت" سے تم کسی حد تک ضرور لطف اُٹھاتے ہوگے۔ لیکن میرے دوست! یقین کرو۔ کہ اس سے میری چاروں طرف بکھری ہوئی رنگینیوں، دلآویزیوں اور دلچسپیوں کا پر تو بھی تمہارے سامنے نہیں آ سکتا۔ تم یہاں آ جاؤ۔ تو تمہیں معلوم ہو۔ کہ علی الصبح پُر اسرار اور کہر میں لپٹے ہوئے مشرقی افق کے سینے پر، غاروں میں رینگتے ہوئے سانپوں کی طرح جب رنگ برنگ کے ابر پارے لہراتے ہیں۔ تو ایک رومان پرست دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور جب شام کے وقت شفق کے دامن میں دھوئیں کے بادلوں کی مانند درختوں کے دھبے آہستہ آہستہ نگاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں۔ تو انسان پر کیا کیفیت چھا جاتی ہے۔ اور پھر جب اس عالم میں کسی برہ کے مارے ہوئے پرندے کی غمناک و درد انگیز آواز فضا میں تھرتھراتی ہے۔ تو روح کی گہرائیوں میں کون سا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن تمہارا "رومان پرست دل" تمہیں وحشت سکھا دے۔ اور تم اپنی آباد و ہنگامہ پرور دنیا سے نکل کر میری ویران و پُر سکون "دنیا" میں آ جاؤ۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟!

اس "رومان" کے متعلق کیا لکھوں۔ یہی سمجھ لو۔ کہ اس نے میرے دل میں مدت سے سوئے ہوئے ایک "جذبے" کو بیدار کر دیا ہے۔ اور میں پھر "وادی نیزا" کی چاندنی راتوں کو یاد کر کے تڑپنے لگا ہوں۔ امید ہے میری طرح تم بھی اس سے متاثر ہو گے! ——— یہ داستان جنوں انگیز محبت کی تباہ کاریوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے ——————— !

محبت اور پھر جنوں انگیز محبت ——————— ! خدا کی پناہ!!

محبت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ بچپن میں یہ قول میں بھی سنا کرتا تھا؟ اور مجھے اس کی صداقت پر ذرہ بھر اعتبار نہیں تھا ــــ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک وہم ہے۔ اور ہر ایک شخص اس وہم میں ملے مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہ یہ بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے ــــ اور کرتا جا رہا ہے۔ لیکن اب میرا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اور میں مندرجہ بالا مقولے کی صداقت کا بدل و جان قائل ہو گیا ہوں۔ یا واقعی محبت کی چنگاری ایک نہایت حقیر، ایک نہایت معمولی واقعے سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں سلگنے لگتی ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ جب یہ ننھی سی چنگاری دل و دماغ کو بھسم کر دینے والے آتشیں شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی انسانی تدبیر اس آگ کو سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ موت کی آندھی کا تیز و تند جھونکا اس آگ کو اور اس کے ساتھ انسانی زندگی کی شمع کو بھی ہمیشہ کے لئے بجھا دیتا ہے۔ یا محبت ایک ایسا زہر ہے۔ جو دل و دماغ کو مسموم کرتا ہوا روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس بے رحم دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر بے سود۔ تا آنکہ موت کے سرد ہونٹ انسان کے ہونٹوں سے لگ کر یہ ہولناک زہر اور اس ہولناک زہر کے ساتھ خونِ حیات کو بھی چوس لیتے ہیں۔ ــ!

اس افسانے میں یہی ناگوار و تلخ حقیقت پائی جاتی ہے ــــــــــــــــــــ!!

امید ہے۔ تم بخیریت تمام ہوگے ــــــــــــــــــــــــــ!!!

تمہارا ــــــــــــ "صحرا نورد"

ــــــــــ (۱) ــــــــــ

میں کیونکر دامِ محبت میں گرفتار ہوا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ اور اس کے بتانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ یہی کہہ دینا کافی ہے۔ کہ جس طرح اور بدنصیب انسان محبت کے غار میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ تو میں نے خود کو تباہی سے بچانے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، تمام احتیاطی تدابیر پر سختی کے ساتھ عمل کیا لیکن میری ہر ایک کوشش خاک میں مل گئی۔ آہ! اس مصیبت سے نہ چھٹکارا ہونا تھا۔ نہ ہوا۔

میری محبوبہ، شہر کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی چودھویں کے چاند کی شگفتگی، اس کی لمبی کالی زلفیں جاڑے کی راتوں کی تاریکی اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں ہرن کی آنکھوں کی مقناطیسیت لئے ہوئے تھیں۔ اس کے رخساروں میں خونِ ناب اس طرح چھلک رہا تھا۔ جس طرح چاندی کے سیمیں سینہ میں شراب احمریں کی موجیں اچھل رہی ہوں۔ وہ جب چلتی۔ تو یہ معلوم ہوتا۔ کہ تالاب کی سطح پر بطخ تیر رہی ہے۔ اور جب بولتی۔ تو یوں محسوس ہوتا۔ گویا دور کہیں ترنم ریز ندی بہہ رہی ہے۔ وہ یگانۂ روزگار

مصور کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھی۔ مگر میری انتہائی بدقسمتی یہ تھی۔ کہ وہ بہت سنگدل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا تھا۔ وہ میری مجنونانہ محبت، میری قابل رحم بےکسی کو دیکھتی۔ اور نہایت سنگدلی کے ساتھ حقارت انگیز قہقہہ لگاتی ہوئی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ میری محبت کی قدر اس کی نگاہوں میں ذرہ برابر نہیں تھی —— ! وہ ظالم حسینہ محبت کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ میں اپنے باغ کے حسین پھول لے کر ایک جگہ کھڑے ہو کر اس کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتا۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی۔ وہ انتہائی بےرخی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیتی۔ یا اگر میرے پاس سے گزرتی اور میں اس کے پاؤں پر پھول گرا دیتا۔ تو ایک لفظ کہے بغیر، پھولوں پر ایک نظر ڈالے بغیر چلی جاتی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کئی بار دوستوں نے مجھ سے کہا "اگر تم مرتے دم تک بھی اسی طرح محبت کی آگ میں جلتے رہے، جب بھی سلمٰی (میری بےرحم محبوبہ) تمہاری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ اپنی زندگی کو اس کی بیرحمانہ محبت میں تباہ نہ کرو۔ شہر میں ہزاروں حسین دوشیزائیں ہیں۔ کیا تمہیں محبت کے لئے کوئی اور نہیں ملتی؟ سلمٰی کا خیال چھوڑ دو۔ ورنہ اس جنون میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" اس کی سہیلیاں کہتیں۔ "ہم نے ہزار کوشش کی کہ سلمٰی کے دل میں تمہارا خیال پیدا کریں۔ مگر جس طرح پتھر میں سے پانی نہیں گزر سکتا۔ اسی طرح اس کے دل میں بھی تمہاری محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔ تم بھی اس سے نفرت کرنے لگو۔"

میں یہ سب کچھ سن کر اپنی بدقسمتی پر افسوس کرتا۔ مگر سلمٰی کا خیال دل میں نہ لانا سلمٰی سے دور بھاگنا، میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ معلوم نہیں۔ کہ اس حسین ساحرہ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ کہ جس قدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر اس کی محبت بڑھتی جاتی۔

میں جوش جنوں میں اکثر شہر سے باہر نکل جاتا۔ اور پرانے قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتا۔ یہ قلعہ مدت سے ویران پڑا تھا۔ اور جب سے حکومت ساہین نے فوج کشی کر کے یہاں کے پہلے حاکم ہاشم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی بھی نہیں جا سکا تھا —— اور کوئی جا بھی کیونکر سکتا تھا۔ قلعے کے آہنیں دروازے بند تھے۔ اور ان کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔

یہ قلعہ چونکہ ایک مدت سے ویران پڑا تھا۔ اور تھا بھی شہر سے دور، اس لئے لوگوں کا گمان تھا۔ کہ اس میں بھوت پریت وغیرہ رہتے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان تو کہا کرتا تھا۔ کہ اس نے کئی بار قلعے کی ایک کھڑکی میں سے ایک حسین لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ الغرض اس پرانی ہیبت ناک عمارت سے طرح طرح کی افواہیں وابستہ تھیں۔

میں قلعے کی ایک سیڑھی پر پڑی ہوئی چھوٹی سی چٹان کے اوپر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اور دل سوز گیت گاتا رہتا۔ اس چٹان سے کچھ پرے ایک کھجور کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک بڑھا آدمی بھی بعض اوقات بیٹھا کرتا تھا۔ میں اس بوڑھے آدمی سے بہت مانوس تھا۔ اس کا نام "بابا حمدی" تھا۔ اور میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ضرور ملا کرتا تھا۔ بابا حمدی محبت کو انسانی زندگی کے لئے خوفناک ترین مرض سمجھتا تھا۔ اور چونکہ میرے واقعاتِ محبت اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس لئے وُہ مجھے اس جنون سے باز رکھنے کے لئے ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا۔ مگر اس کی نصیحتیں رائیگاں جاتیں۔ محبت کا جنون کبھی نصیحتوں سے بھی دور ہوُا ہے؟؟

دُنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کی باتوں سے مجھے ہمدردی کی بُو آتی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا "بابا! تمہارا ٹھکانا کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟" مگر وُہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتا "پھر پھرا کر زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ میرا ٹھکانا ہے"۔

جیسا کہ میں نے بتایا، حمدی نہایت ہمدردانہ لہجے میں مجھے ترکِ محبت کی صلاح دیتا ——— اور اس سلسلے میں عجیب و غریب داستانیں بھی سناتا۔ مگر بدقسمتی سے اس کی نصیحتوں اور داستانوں کو سُن کر میرے دل میں محبت کی آگ اور بھڑک جاتی۔ اور جب میں شہر کا رُخ کرتا۔ تو سلمیٰ کی یاد اس درجہ بیقرار کرتی۔ کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

——— (۲) ———

اس دن میں خاص طور پر غمگین و مغموم تھا۔ بے رحم سلمیٰ کی سرد مہریوں نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اور میں اپنے صد پارہ دل کو سینے میں لئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوُا پرانے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔

دن بیت چکا تھا۔ اور فضاؤں میں تاریکی کے بادل عفریتوں کی طرح چھا رہے تھے۔ وُہ مغربی گوشے میں ایک بلند اور گنجان درخت خوفناک دیو کی مانند آفتاب کی خونچکاں نعش کو بازوؤں پر اٹھائے آہستہ آہستہ تاریکی کے غار میں غائب ہو رہا تھا۔ میں اس غمگین منظر کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوُا۔ کہ ایک دن میں بھی خون شدہ تمناؤں کو لئے ہوئے دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا ——— اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اور میں ایک بندھی ہوئی کشتی میں بیٹھ گیا۔ میرے حقیر آنسو سطحِ آب پر ننھے ننھے دائرے بناتے ہوئے تحلیل ہونے لگے۔ اسی اثنا میں میں نے حمدی کو قلعے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دیکھا۔ میں کشتی سے نکلا۔ اور حمدی کے قریب پہنچ گیا۔ حمدی نے قدموں کی آہٹ سُن کر مُڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پیدا ہوُا۔ اور اُس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "آج تم بہت غمگین نظر آ رہے ہو؟"

"میرا دل ٹوٹ چکا" میں نے جواب دیا!

"اُس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور غمناک لہجے میں کہا "تم خود کو تباہ کر رہے ہو"!

"تو کیا کروں؟

"اس آگ سے نکلو۔ ورنہ اس کے آتشیں شعلے تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے"!

"میں مجبور ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا! اس کی محبت میرے دل کے ذرّے ذرّے کو محیط ہے"!

"حمدی کھجور کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ یکایک ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا، ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر قلعے کی دیوار کے پاس تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شاید وہاں وہ اپنے گھونسلے میں جا بیٹھا تھا۔ بابا حمدی قلعے کو تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار چمک پیدا ہو رہی تھی ——— قلعے کی بلند، مہیب دیواریں نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا ماضی کے دھندلکوں میں عظمت پیشیں اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔

"بابا! میں نے اس قلعے کے متعلق عجیب عجیب باتیں سُنی ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ یہاں بھوت پریت رہتے ہیں۔ کسی کا قول ہے یہاں مُردوں کی روحیں چیختی چلاتی رہتی ہیں بعض لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے چیخیں بھی سنی ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے۔ کہ اس نے قلعے کی کھڑکی میں سے ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم نے بھی کچھ سُنا یا دیکھا ہے"؟ میں نے حمدی سے پوچھا۔

بوڑھا خاموش رہا —— خاموشی سے قلعے کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے دوبارہ استفسار کیا۔ اس پر اس نے کہا۔

"میں نے تو یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اور نہ کبھی کچھ سنا۔ لوگ یونہیں افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ مگر —— جو اصل حقیقت ہے ——"

"اصل حقیقت کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا!

"یہاں بھی حُسن و عشق کا ایک خونیں کھیل کھیلا جا چکا ہے"!

"حُسن و عشق کا خونیں کھیل؟ وہ کیونکر"؟

"لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کیا سناؤں"؟

"یہ درست ہے۔ مگر مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں!" میں نے کہا۔

"تو کیا تم محبت کی ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہیں؟"

"میں خوب واقف ہوں۔ مگر جو چیز اختیار میں نہ ہو۔ اس پر کیا بس چل سکتا ہے؟"

"اگر تم مصمم ارادہ کرلو۔ تو یقیناً محبت کے جال سے رہائی پا سکتے ہو۔ محب کے دل میں محبت کا جذبہ اس لئے شدت اختیار کرتا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو بار بار دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے تو ——"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا!" میں نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔ "جہاں بھی جاؤں گا محبت کی آگ سینے میں لے کر جاؤنگا!"

حمدی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ "تم کوشش تو کرو، میرے بیٹے! ممکن ہے یہ ہولناک مرض دُور ہو جائے۔ محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ ہر زمانے میں تباہی پھیلاتی رہی ہے۔ اور پھیلاتی رہے گی۔ اگر تم نے اس سے نجات حاصل کرنے کی سعی نہ کی۔ تو پھر تمہاری بربادی میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ تمہارے لئے بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ یہاں سے فی الفور چلے جاؤ!"

"اچھا بابا: میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا!"

بابا حمدی کی آنکھیں قدرے چمک اٹھیں۔ اس نے میرے شانے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنی نرم و ہمدردانہ آواز میں، کہنے لگا:۔

"یہ قلعہ انیس سال سے ویران پڑا ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ یہاں شہر کا حاکم ہاشم رہتا تھا۔ ہاشم بے حد ظالم، کینہ جو اور منتقم مزاج انسان تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا۔ اس کی کسی سے نہ بن سکی۔ اور والئی ساہین جعفر سے تو اُسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ جعفر بہت نیک دل اور بہادر حکمران تھا۔ رعایا کا ہر فرد اس کا مطیع و فرمانبردار تھا۔ اور چونکہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس لئے لوگوں کو امید تھی۔ کہ کچھ مدت بعد ولیعہد سلطنت صولت تخت نشین ہو جائے گا۔ صولت باپ سے بھی زیادہ نیک دل اور شجاع تھا۔ عنفوانِ شباب میں اس نے کئی معرکے سر کئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ جوان تھا۔ اس کی شجاعت، دلیری اور نیک طینتی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ شہزادہ صولت سیر و شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ ایک دفعہ شکار کرتے کرتے وہ بہت دُور نکل گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو وفادار خادم تھے۔ تینوں راستہ بھول کر آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ رات کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اور گھوڑے تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ایک کسان سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ حمیرا میں پہنچ گئے ہیں۔ حمیرا اس زمانے میں یہاں سے کچھ دُور ایک گاؤں تھا۔ کوئی اور ہوتا۔ تو فوراً وہاں سے

چلا جاتا۔ کیونکہ اس وقت شہزادہ اپنے جانی دشمن کی سلطنت میں پہنچ گیا تھا۔ مگر شہزادے نے اس کی قطعاً پروا نہ کی۔ اور شب بسری کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ جیسے ہی ہاشم کو کسان کے ذریعے شہزادے کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ وہ اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے لئے بیقرار ہو گیا۔ اس نے اپنے خاص مصاحب شہزادے کو لانے کے لئے بھیجے۔ شہزادہ جانتا تھا۔ کہ وہ دشمن کے ملک میں ہے ——— اسے خبر تھی۔ کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے۔ لیکن اس نے ذرہ بھر احتیاط نہ کی۔ اور اپنے وفادار خادموں کی مسلسل گزارشات کو ٹھکراتے ہوئے، حاکم شہر کے آدمیوں کے ساتھ محل میں پہنچ گیا۔ خادم حیران تھے۔ آخر شہزادے کو کیا ہو گیا ہے وہ کیوں جان بوجھ کر خطرے میں گرفتار ہو رہا ہے۔ آہ! انہیں کیا خبر تھی۔ کہ صولت محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر، موت کے منہ میں جا رہا ہے!

صولت ہاشم کی لڑکی یاسمین کی محبت میں گرفتار تھا۔ اور یہی جذبۂ محبت اسے کشاں کشاں محل کی طرف لے جا رہا تھا۔ نتیجہ ؟ ———

نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ رات کے آخری حصے میں شہزادے کو ایک تاریک اور زمین دوز کمرے میں بند کر دیا گیا اس وقت اسے محسوس ہوا۔ کہ اس کے ساتھ نہایت ہولناک فریب کیا گیا ہے۔ اس نے ادھر ادھر ٹٹولا۔ مگر اس کی انگلیاں پتھر کی طرح سخت دیواروں سے مس ہوئیں ——— اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کافی دیر کے بعد اس کے کمرے میں ہلکی سی روشنی ظاہر ہوئی۔ اس روشنی میں اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ ایک فراخ کمرے میں ہے۔ جس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ ایک طرف آہنی دروازہ ہے۔ جو مقفل ہے۔ شہزادے کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن اب دستِ تاسف ملنے سے کیا ہو سکتا تھا؟

صولت کو یقین تھا۔ کہ ظالم ہاشم اسے مار ڈالے گا۔ مگر منتقم مزاج حکمران اسے اس طرح ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ شہزادے کا اس طرح زندہ رہنا زیادہ مفید ہے۔ ممکن ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے دشمن کی سلطنت پر قبضہ کرلے۔

اسی اثنا میں ایک خادم نے آہنی دروازے کی سلاخوں میں سے کھانا اندر داخل کیا۔ شہزادے نے خادم سے بہت کچھ پوچھا۔ مگر اُسے کسی بات کا بھی جواب نہ ملا۔ خادم اپنا فرض ادا کر کے چلا گیا۔

ادھر تو شہزادہ اسیر ہو گیا۔ ادھر اس کے اس طرح پُراسرار طور پر غائب ہو جانے سے تمام سلطنت میں سنسنی سی پھیل گئی ——— لوگوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر شہزادہ کہاں؟ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ہاشم نے اس کے خادموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لئے اب کسی ذریعہ سے بھی شہزادے کی اسیری کی خبر نہیں

ہوسکتی تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ جنگلی درندوں نے شہزادے اور اس کے ہمراہیوں کو چیر پھاڑ ڈالا ہے!

حمدی رُکا۔ ایک لمبی پُر درد آہ بھری۔ اور اپنی نگاہیں پرانے قلعے کی دیوار پر جما دیں۔

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قلعے کے قریب ایک بلند، بے برگ و بار درخت کی شاخ پر کوئی حسرت نصیب پرندہ، ماتمی صدا کے ساتھ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ درخت کے عین اوپر ایک سفید بادل چاند سے مس کرتا ہوا یوں گزر رہا تھا۔ جیسے ایک بدقسمت محب اپنی محبوبہ کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔

میں نے حمدی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جھریاں پڑے ہوئے ماتھے کے نیچے، غم میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جس طرح کسی شکستہ قبر کے گڑھوں میں نیم روشن و نیم تاریک دھبے جمے ہوئے ہوں! وہ کئی لمحے اپنے خیالات میں غرق رہا۔ پھر اپنی لمبی، کمزور اور جھریوں میں لپٹی ہوئی انگلیاں پیشانی پر پھیریں اور غم انگیز لہجے میں کہنے لگا:۔

"جب آتش فشاں پہاڑ کے سینے سے آتشیں شعلوں کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ تو ارد گرد کی تمام چیزیں جل کر خاکستر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بعینہٖ جو آگ امیر شہزادے کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس کی حدت سے یاسمین کا دل بھی پگھلنے لگا۔ اس نے جب دیکھا۔ کہ اس کا جاں نثار محب محل کے اس تاریک و خوفناک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ جہاں سے آج تک کوئی سلامت نہیں نکل سکا۔ تو وہ بے حد مضطرب و بیقرار ہو گئی۔ اس کا باپ بے کسوں کو دیکھ کر متاثر ہونا جانتا ہی نہیں تھا مگر اس کے برخلاف یاسمین کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل تھا۔ وہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔ کہ ایک پاشا زادہ سلطنت کی امیدوں کا تمنا، شریف طبع اور پھر اس کا پیارا محب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔ اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہو۔ پہلے تو اس نے، اپنے تمام اختیارات سے فائدہ اٹھا کر، اپنے تمام نسائی حربوں کو کام میں لا کر باپ کو شہزادے کی رہائی پر مجبور کیا۔ مگر افسوس اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ بلکہ برعکس اس کے ظالم حکمران امیر شہزادے پر اور ظلم کرنے لگا۔

شہزادی کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں ملا دی گئی تھیں۔ تاہم اُس نے ہمت نہ ہاری محبت میں انسان کا دل زیادہ مضبوط، اس کے ارادے زیادہ بلند اور اس کی رُوح زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر ایک مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے ــــ اور بخندہ پیشانی کرتا ہے۔ شہزادی کے دل میں محبت کا تند جذبہ موجزن تھا۔ اس نے چند قابل اعتبار شخصوں کو

اپنے ساتھ ملاکر شہزادے کو رہا کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ عین اس وقت جب کہ اُن کی کوششیں کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ ایک شخص نے غداری کی۔ اور اس سازش کی خبر حاکم کے کانوں تک پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ ہاشم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے تمام سازشیوں کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر کے شہزادی کو زمین دوز کوٹھری میں قید کر دیا۔

دونوں بدنصیب اسیروں کو کھانا پہنچانے کا فرض صفدر انجام دیتا تھا۔ صفدر شہزادی کا پرانا نمک حلال خادم تھا۔ اور چونکہ محل میں ہر ایک شخص کو اس پر اعتبار تھا۔ اس لئے اس قسم کی نازک ذمہ داریوں کا کام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ صفدر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر دونوں کو مقررہ وقت پر کھانا پہنچایا کرتا۔ اس کے علاوہ انہیں اس مصیبت میں تسلی بھی دیا کرتا۔ مصیبت کا احساس خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ مگر ایک ہمدرد دل کی ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں اس تلخی کو بہت حد تک دُور کر دیتی ہیں۔

یاسمین اور صولت دونوں علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں بند تھے۔ اور ان دونوں کوٹھریوں کے درمیان نہ معلوم کتنا فاصلہ تھا۔ اور یہ کبھی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ دونوں کسی وقت ایک دوسرے کو مل سکیں گے۔ دونوں رات دن پتھروں کی دیواروں میں قید، تڑپتے رہتے —— تڑپتے رہتے اور بدقسمتی پر آنسو بہاتے رہتے!

ایک دن صولت کوٹھری کی ایک دیوار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک اسے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اُس نے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی۔ تو ایک حد تک وہ کھسک گیا۔ جب صفدر آیا۔ تو صولت نے اس سے لوہے کا اوزار لانے کے لئے کہا۔ وفادار خادم کے لئے یہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح لوہے کا ایک اوزار صولت کو پہنچا دیا۔ صولت اوزار کی مدد سے پتھر کو ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پتھر کچھ اور ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر شہزادے کی امید بندھ گئی۔ وہ تمام رات پتھروں کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دیوار میں کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ شہزادہ اس میں داخل ہو گیا۔ اور یہ دیکھ کر کہ اس کے قدم زمین پر پڑ رہے ہیں۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ تاریکی میں وہ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ لوہے کی سلاخوں کو لگا۔ شہزادے کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو آواز دی۔ آواز ہلکی سی گونج پیدا کرتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی۔ اس نے دوبارہ آواز دی۔ اب کے آواز کے جواب میں ایک مضمحل سی چیخ تھرتھرائی۔ شہزادے نے سمجھ لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کی کوٹھڑی ہی کے آہنیں دروازے پر کھڑا ہے۔ اس نے یاسمین کو تسلی دی۔ اور اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا۔ اور آتے ہی دیوار میں پتھر لگا دیئے۔ تاکہ کوئی آئے تو اُسے خبر نہ ہو۔ دوسرے دن پھر صفدر نے روشنی کا انتظام بھی کر دیا۔

رات کے وقت صولت دیوار میں سے نکل کر یاسمین کی کوٹھڑی کی طرف چلا۔ یاسمین سلاخوں کے پاس آکھڑی ہوئی۔ دونوں تمام رات راز و نیاز میں مصروف رہتے۔ انکے درمیان موٹی موٹی خوفناک آہنیں سلاخیں حائل تھیں۔ مگر ان کے دل ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ دو تین دن بعد صولت نے یاسمین کی کوٹھڑی کی دیوار میں سے بھی پتھر ہٹا کر آمد و رفت کا راستہ بنالیا۔ اور یہ دونوں کے لئے بڑی خوش قسمتی تھی۔ شہزادی کی کوٹھڑی میں بھی رستہ بن گیا۔ اب تو صولت دن بھر اپنے کمرے میں رہتا۔ اور رات بھر یاسمین کی کوٹھڑی میں:

دن گزرتے گئے اور اس راز کا علم سوائے صفدر کے اور کسی کو نہ ہو سکا۔ ہاشم کو کئی بار اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ آخر وہ باپ تھا۔ لیکن صفدر نے یاسمین کے مشورہ کے مطابق اس کو شہزادی سے بدظن رکھا۔ شہزادی کو یقین تھا۔ کہ اس کوٹھڑی سے باہر نکل کر ایک تو وہ اپنے محبوب سے جدا ہو جائے گی۔ اور دوسرے وہ اسے آزاد کرانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ جعفر کو خبر مل گئی۔ کہ اس کے دشمن نے صولت کو قید کر رکھا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے دشمن کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ بدطینت کینہ پرور اور انتقام جو ہاشم نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دے دیا۔ کہ فوراً صولت کو قتل کر دو!

رات کا وقت تھا۔ اور چونکہ صولت بیمار تھا۔ اس لئے یاسمین اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ مسلح سپاہی اندر داخل ہوئے صولت کھڑا ہو گیا۔ محبت کی پتلی یاسمین اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ فضا میں تلواریں چمکیں، دو چیخیں گونجیں، اور اس کے ساتھ ہی دو لاشے خون میں تڑپنے لگے —— چند لمحوں کے بعد محب و محبوبہ دونوں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے!"

حمدی کی آنکھیں اس طرح نم آلود ہو گئیں۔ جس طرح خزاں رسیدہ، زرد زرد، سوکھے سوکھے پتوں پر بارش کے قطرے گریں اور پھیل جائیں۔

اس نے میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر قلعے کی جانب دیکھا لمبی آہ بھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے سینے میں طوفان بپا ہے —— وہ بے اختیار رونا چاہتا ہے۔ مگر چند لمحوں ہی میں اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی افسردہ نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ کہ مایوسیوں نے آنسوؤں کو چوس لیا ہے —— وہ رونا چاہتا ہے۔ مگر رو نہیں سکتا!

"یہی وہ محل ہے۔ جس کے ایک کمرے میں دو محبت کرنے والی ہستیوں نے محبت ہی کے ہاتھوں موت کا جام پیا——!
اس واقعے کو ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اب بھی میرا مرحوم دوست صفدر، میرے سامنے بیٹھا ہوا اس دلدوز واقعے کو سنا رہا ہے۔!"

"صفدر آپ کا دوست تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ میرا دوست تھا ــــ اس واقعہ کے بعد وہ دو سال تک زندہ رہا!"

ــــ (۳) ــــ

حمدی نے ایک سرد آہ بھری۔ قلعے کی طرف دیکھا پھر استفسار انگیز نگاہیں مجھ پر ڈالیں۔ اس کے بعد کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔ وہ اس طرح خاموش بے حس و حرکت بیٹھا ہوا یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا ریت کا ایک تودہ ہے۔ یا قلعے کی دیوار سے گرا ہوا ایک پتھر ہے۔ چاند اس بیقرار محب کی طرح جو اپنی محبوبہ کے کاشانے کو نزدیک دیکھ کر، انتہائی تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ آسمان کے ایک ابر آلود راستے پر اڑا جا رہا تھا۔

صولت و یاسمین کی داستانِ محبت سنکر میرا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ کاش میں بھی جان ہتھیلی پہ رکھ کر اپنی محبوبہ کے لئے دنیا کی ہر مصیبت کو بخندہ پیشانی برداشت کروں۔ زندگی کے ہر حملے کے سامنے سینہ سپر ہوں۔ اور اس وقت جبکہ میری جان لبوں پہ ہو میری دلنواز محبوبہ ایک لطف انگیز نگاہ مجھ پر ڈال دے۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ یہی میری زندگی کا حاصل ہے! کاش ــــ!! اے کاش!!!

حمدی دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے زمین کو کریدنے لگا۔ اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا:۔

"مجھے یقین ہے۔ کہ اب تم اس تباہی سامان جنوں کو اپنے دل سے نکال دو گے؟"

"یہ جنوں ــــ آہ یہ جنوں میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے؟" میں نے کہا!

حمدی نے مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "تم بھولتے ہو نوجوان! اگر اب بھی تم اس مرض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو، تو یقیناً کامیاب ہو جاؤ۔ ہر شخص کو محبت کی آگ سے بچنا چاہیئے۔ محبت کی چنگاری شروع شروع میں تو مسرت انگیز و راحت سامان حرارت بدن میں دوڑاتی ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد جاں سوز شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ میری نصیحت مانو! اور محبت کی آگ سے دور بھاگو!"

"کاش میں ایسا کر سکتا! ــــ کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی!"

"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے!"

"محبت کرنے والا دل محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو کہو، صولت نے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی!

بدنصیب یاسمین نے کس لئے اپنی زندگی کو تباہ کیا؟"

"یہ ــــ یہ" حمدی آگے نہ بول سکا۔ اس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر حمدی بولا:۔

"انہوں نے اپنی زندگی سے دشمنی کی ــــ لیکن تم ان کی پیروی کیوں کرو؟"

میں خاموش رہا۔ اس کو جواب میں دے ہی کیا سکتا تھا۔ حمدی نے تکیے پر نگاہیں جما دیں ــــ میں منہ دوسری طرف پھیر کر درختوں میں سے جھلکتے ہوئے دریا کے پانی کی لمبی سی سفید لکیر دیکھنے لگا۔ اور سوچنے لگا: تاریکی میں چمکتی ہوئی اس سفید لکیر کی طرح میرے ظلمت کدہ دل میں بھی ایک ہلکی سی امید روشن ہے ــــ اگرچہ آج سلمیٰ مجھ سے سرد مہری برت رہی ہے۔ مگر ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ مستقبل میں اس کی سرد مہری محبت میں تبدیل ہو جائے۔ اس وقت مجھے یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہو گی ــــ لیکن ایسا کبھی ہو گا ــــ؟ ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟

یہ سوال میرے دل میں اس طرح پیدا ہوا۔ جس طرح دریا میں ایک دم طغیانی آ جائے: "سلمیٰ جو سلوک مجھ سے کر رہی ہے اس کو مدِ نظر رکھا جائے۔ تو پھر اس کی التفات کا گمان بھی ذہن میں نہیں آ سکتا" اس پر اس سفاک سلمیٰ کی طرح طرح کی سرد مہریاں مجھے یاد آنے لگیں۔ تین سال سے میں مسلسل اس کے ظالمانہ سلوک کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایک دفعہ بھی اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ یہ خیالات میرے ذہن پر چھا گئے۔

یکایک ایک خاص خیال کے دماغ میں آنے سے میں نے مڑ کر دیکھا ــــ حمدی غائب تھا۔

قلعے کی مہیب دیواریں، صدیوں کے راز، برسوں کے واقعات اور پھر صولت و یاسمین کی حسرت انجام محبت کی داستان سینے میں چھپائے نہ معلوم کس کا انتظار کر رہی تھیں۔ نہ معلوم کیوں سوگوار و زخم نصیب روحیں، چاند کی مدھم شعاؤں کے ہلالے پر ماتمی اور فراقیہ نغمے گاتی ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر مضطربانہ اڑتی جا رہی تھیں۔

میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرا۔ پھر گھر آ کر لیٹ گیا ــــ نیند نے مجھے دنیا اور مافیہا سے غافل کر دیا۔

کچھ دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ قریب ہی لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی شعاعیں جلتی ہوئی سلاخوں کی مانند میری آنکھوں میں چبھیں۔ میں نے پہلو بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ حمدی کی سنائی ہوئی ٹریجڈی کے واقعات یکے بعد دیگرے میری آنکھوں میں پھرنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ اگرچہ صولت و یاسمین محبت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ تاہم ان کی خوش قسمتی میں ذرہ بھر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ صولت ایک بہت بڑی سلطنت کا ولیعہد تھا۔ ناز و نعم کے آغوش میں پرورش پایا ہوا۔ شاہانہ زندگی بسر کرنے والا۔ دنیا اور زندگی کے مصائب

سے بے خبر۔ اور محبت نے اسے دنیا کی دلچسپیوں سے یکسر محروم کر کے ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔ لیکن اس تکلیف دہ حالت میں بھی اس کی محبوبہ اس کے قریب تھی ـــــ دل و جان سے اسے چاہ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں میں آزاد ہوں۔ جہاں چاہوں، جا سکتا ہوں، جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ لیکن میری محبوبہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ میں نے بے قرار ہو کر پہلو بدل لیا۔

یوں تو یہ تمنا کہ کاش میں موت سے کچھ پیشتر ہی اپنی ظالم محبوبہ کے دل کو فتح کر لوں۔ ہر وقت میرے دل میں بے قرار رہتی تھی۔ لیکن اس وقت تو یہ تمنا میرے دل کے ذرے ذرے پر چھائی ہوئی تھی۔

میں لیٹا رہا۔ اور نہ معلوم کب تک میری یہ حالت رہتی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا میرا نوکر تھا۔ لیمپ کو جلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"لیمپ آپ نے ابھی جلایا ہے۔ یا یہ تمام رات جلتا رہا ہے؟"

"بجھا دو اس کو!" میں نے کہا۔ اور اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خادم لیمپ بجھا کر چپ چاپ چلا گیا۔ میں اپنے سر اور آنکھوں میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے پھر لیٹ گیا۔ اور اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب دن کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ اب میرے دل میں تمنا تھی۔ کہ دن بہت جلد بیت جائے۔ اور میں پھر شام کو حمدی سے ملوں۔ اور اس سے صولت و یاسمین کے متعلق کچھ اور دریافت کروں! نہ معلوم مجھے ان گمشدگان محبت سے، کیوں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کہ میں چاہتا تھا۔ ہر وقت انہی کے متعلق باتیں سنتا رہوں۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ کہ میں اس باغ میں پہنچ گیا۔ جہاں میری محبوبہ سیر کیا کرتی تھی۔ لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ لیکن میری محبوبہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے باغ کے حسین ترین پھولوں کو اکٹھا کر کے گلدستہ بنایا۔ اور باغ سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

مغرب کے خونیں گوشے میں زرد رو آفتاب اس مسافر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جو چلتے چلتے تھک کر، ہر طرف سے مایوس ہو کر، مجبوراً ایک جگہ بیٹھ جائے۔ تاریکی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اچانک مجھے دور سلمیٰ کا شگفتہ مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ وہ ـــــ میرے دل کی ملکہ یوں نظر آ رہی تھی۔ گویا ندی کی شفاف سطح پر ہوا کے جھونکوں سے چاندنی کی سیمیں شعاع لہرا رہی ہو!

وہ تنہا تھی۔ میں نے موقعے کو غنیمت جانا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب آگئی۔ میں نے گلدستہ اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ ذرا رکی۔ حقارت انگیز نظریں مجھ پر ڈالیں اور پھر روانہ ہو گئی ـــــ میں

دل مسوس کر رہ گیا۔

شام کی تاریکی کافی پھیل چکی تھی۔ اور اس تاریکی میں خاک پر پڑے ہوئے پھول بزبانِ خاموشی مجھے میری بدنصیبی کی داستان سنا رہے تھے۔ آہ! میرے سوا دنیا میں کون جانتا تھا۔ کہ یہ رنگین پھول میرے حرماں نصیب دل کے ٹکڑے ہیں جنہیں نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے۔

آخر میں قلعے کے پاس پہنچا۔ اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ ابھی تک سلمیٰ کی آمد کا منتظر ہوں بجلی کی رَو کی طرح اپنی ناکامی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے آہ بھر کر اوپر دیکھا۔ بیکایک قلعے کی کھڑکی میں سے ایک لمحے کے لئے ایک نہایت دلآویز حسین چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا۔ اور پھر غائب!

میں ٹکٹکی باندھ کر کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا — کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ مگر وہاں کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔ کیا یہ سپنا تھا؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ مگر اس حالت میں سپنے کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا۔ میں عالمِ بیداری میں تھا — عالمِ بیداری میں سب کچھ دیکھ رہا تھا!

قلعے کی بلند، سنگین اور مہیب دیوار کے سینے پر تاریک بادلوں کے ہجوم میں سفید ابر پارے کی طرح، چاندنی کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اور اس سفید چادر کے ایک گوشے میں مختصر سا خلا تھا۔ جس میں سے ابھی ابھی ایک حسین و شاداب چہرے نے نمودار ہو کر، میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ دیا۔ اس حالت میں بھی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ آخر یہ خیال کر کے کہ شاید حمدی سے ملاقات ہو جائے۔ میں وہاں سے ہٹا اور کھجور کے درخت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہوا کے سست رو جھونکے درختوں کی شاخوں کو ہلا ہلا کر چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ مگر وہاں حمدی کا نقشِ قدم بھی نہیں تھا۔ میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں قلعے کی دیوار پر جما دیں۔ اسی اثنا میں یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا "یہ حسینہ یاسمین تو نہیں؟" یہ سوال میں نے دل میں بار بار دہرایا۔ مگر جب حمدی کے سنائے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس پر غور کیا۔ تو میرے دل کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ پراسرار حسینہ کسی صورت میں بھی یاسمین نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کئی سال قبل اپنے محبوب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہے۔ تو پھر یہ حسینہ کون ہے؟ انہی خیالات کو ذہن میں لئے ہوئے میں سو گیا۔ خواب میں بھی وہ پراسرار حسینہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ رات کے آخری حصے میں میں بیدار ہو گیا۔ قلعے کی مہیب دیواریں چاندنی کو آغوش میں لئے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں ایک جذبہ

بے تاب کے زیرِ اثر تھا۔ اور اُسی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ جب بالکل مایوس ہو گیا۔ تو پھر با دلِ ناخواستہ گھر کیطرف روانہ ہو گیا۔

(۴)

جیسے ہی شام ہوئی۔ میں گھر سے نکلا۔ اور قلعے کیطرف روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ حمدی اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نیچے چلا گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھے دیکھکر ایک دم کھڑکی سے الگ ہو گیا ہے۔ اسکی صورت تو میں نہ دیکھ سکا۔ لیکن میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یہ وہی قلعے کی حسینہ تھی۔ وُہ رات بھی میں نے وہیں بسر کر دی۔ نہ صرف وُہ رات بلکہ اور کئی راتیں بھی وہیں گزر گئیں۔ میں حیران تھا۔ کہ آخر قلعے کی اس پر اسرار حسینہ نے صرف ایک جھلک دکھا کر مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟ میں کیوں بار بار اس کھڑکی کے نیچے آ کھڑا ہوتا ہوں؟؟

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ میں محسوس کرنے لگا۔ کہ قلعے کی حسینہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مقامِ حیرت یہ تھا۔ کہ سلمیٰ بھی بہت حد تک مجھے بھول گئی تھی۔

ایک رات میں قلعے کے پاس پہنچا۔ اور اس دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ جس کے پیچھے میرا سنہرا سپنا غائب ہو گیا تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس واقعے سے قبل گاہے گاہے حمدی سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب تو میں نے اُس کی شکل بھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ حمدی اس حسینہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ میں اس سے ملاقات کرنے کے لئے اس قدر بے تاب و بیقرار تھا۔

میں قلعے کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ کہ کوئی راستہ اندر جانے کا مل جائے۔ مگر ایک آہنیں دروازے کے علاوہ اور کوئی راستہ اندر جانے کا نظر نہ آیا۔ اور اس آہنیں دروازے کا یہ حال تھا۔ کہ اس کا آدھا حصہ بڑے بڑے پتھروں میں چھپا ہوا تھا۔ پہلے تو ان بڑے بڑے پتھروں کو ہٹایا جائے۔ پھر جا کر کہیں دروازہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس دروازے کو کھولنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اچانک میری نظر قلعے سے کچھ دور شاہ بلوط کے ایک درخت کے قریب، ایک مثالی چٹان پر پڑی۔ میں یہ سوچ کر کہ چٹان پر بیٹھ کر بآسانی کھڑکی پر نگاہ پڑ سکے گی۔ اس طرف چلنے لگا۔ اور وہاں بیٹھ کر کھڑکی کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ اور خواقیہ اشعار گنگنانے لگا۔ جیسے ہی میں نے پہلو بدلا۔ مجھے چٹان کے پاس ایک غار نظر آیا۔ میں فوراً چٹان سے نیچے اُترا۔ اور غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے ایک طرف ایک سیڑھی نظر آئی۔ میں نے سیڑھی پر قدم رکھ دیئے ـــــ خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ مگر قلعے کی پر اسرار حسینہ کا شگفتہ

درخشاں چہرہ میری نگاہِ تخیل کے سامنے نمودار ہوا۔ اور میں آگے چلنے لگا۔ آگے ایک اور سیڑھی تھی۔ اس کے بعد پھر یکے بعد دیگرے کئی سیڑھیاں آئیں۔ میں امید و بیم کے عالم میں نیچے اُترتا گیا۔ تاریکی اس قدر تھی۔ کہ خدا کی پناہ! ہر قدم پر اندیشہ ہوتا تھا۔ کہ اب زندہ باہر نہیں نکل سکوں گا۔ سیڑھیوں کے بعد ایک تنگ و تاریک راستہ تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر قدم اٹھانے لگا۔ آخر میرا ہاتھ ایک دیوار سے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خدا کی پناہ! یہ دیوار ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا۔ کہ راستہ بند ہے۔ میں مڑا اور واپس آنے لگا۔ ارادہ تھا۔ کہ گھر جا کر لیمپ لا کر پھر یہاں آؤں گا۔ اور قلعہ کے اندر جانے کے راستے کا پتہ معلوم کرونگا۔ میرے ہاتھ دیوار سے مس کر رہے تھے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا۔ کہ دیوار میں ایک خلا ہے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ اور ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لینے لگا۔ واقعی یہ ایک وسیع خلا تھا۔ میں خلا میں داخل ہوا۔ میرے پاؤں فرش پر پڑے۔ اور میں آگے چلنے لگا۔ اس حسینہ سے ملنے کی امید راستے کی تاریکی کو روشن کر رہی تھی۔

کچھ دیر چلنے کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا۔ کہ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ میں قلعے میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور اب عنقریب اس پُراسرار حسینہ سے ملوں گا۔ سات آٹھ سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بعد میں قلعے میں تھا —!

چاروں طرف گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ سرو اور شاہ بلوط کے درخت جا بجا کھڑے تھے۔ حوض سوکھ گئے تھے، فوارے زنگ آلود تھے۔ تالابوں میں گرد و غبار پڑا تھا۔ میں ایک بے تابانہ، ایک مجنونانہ، جذبے کے زیرِ اثر اس پُراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ کبھی مجھے خیال آتا۔ کہ میری وہ پُراسرار حسینہ کسی سرو کے سائے میں سو رہی ہے۔ کبھی گمان ہوتا۔ کہ وہ کسی سوکھے ہوئے تالاب کے کنارے کوئی غمگین گیت گا رہی ہے۔ اور کبھی شبہ ہوتا۔ کہ وہ مجھے آتے دیکھ کر، ایک ایسی جگہ چھپ گئی ہے۔ جہاں میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حیران تھا۔ کہ کہاں جاؤں۔ اُسے کہاں تلاش کروں؟

آخر میں ایک تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ چاند قلعے کے مینار کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ابر کا ایک ٹکڑا ایک بے تاب محب کی طرح آوارہ پھر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے، درختوں کے سوکھے سوکھے پتے سوگوار کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے تالاب میں گر رہے تھے۔

میں وہاں سے اُٹھا، اور یہ خیال لیکر اٹھا۔ کہ اس کھڑکی کو تلاش کرنا چاہیئے۔ جس میں سے اس حسینہ نے جھلک دکھائی تھی۔ مگر اس کمرے کو جس میں وہ کھڑکی تھی۔ تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ میں کئی کمروں میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر ہر جگہ اُسے

تلاش کیا۔ لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر تھک کر میں ایک سرو کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ حسین تصورات کی نشاط نمائیوں نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ کئی راتیں عالم بیداری میں گزری تھیں۔ اب جو نیند آئی۔ تو ایسی آئی۔ کہ میں اسوقت بیدار ہوا۔ جب سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ روشنی میں میں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ مگر فضول ——— آخر میں اسی راستے سے باہر نکل آیا۔ عجیب بات یہ تھی۔ کہ باہر نکلتے وقت کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

(۶)

دوسرے دن جب کہ آفتاب اپنے سفر کا تہائی حصہ ختم کر چکا تھا۔ میں اسی راستے سے قلعے میں داخل ہوا۔ اور اس پر اسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں بے تابی کے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا۔ اضطراب کے عالم میں گنجان جھاڑیوں کے اردگرد نگاہیں ڈالتا۔ اور دل میں شوقِ فراواں لئے ہوئے پیچیدہ راستوں کو طے کرتا۔ آخر تھک کر، مایوس ہو کر ایک سیاہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہ سیاہ پتھر قلعے کے مینار سے گرا ہوا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ درختوں کے، پودوں کے، میناروں کے سائے لمبے ہو گئے تھے، آفتاب لبِ بام کی زرد مایوس اور تھکی ہوئی شعاعیں بلند درختوں اور میناروں کا سہارا لے کر، فضا کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ لمبے لمبے سائے سسکتے ہوئے رینگتے ہوئے، اندھیرے کے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ پُر اسرار حسینہ بھی ایک سایہ بن کر، سایوں کی اس دنیا میں غائب ہو رہی ہے۔ ایک سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر چیل بیٹھی اپنی حسرت ناک آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ زرد، افسردہ اور سوکھے پتے ٹہنیوں سے گر گر کر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر، کھڑکھڑ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ قلعے کے عین اوپر بڑے سے سیاہ بادل کے آخری سرے پر مدھم چاند یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا ریت کے تودے پر پھول کی ایک نازک پتی لرز رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا۔ کہ کوئی دبے پاؤں میرے پاس سے گزر رہا ہے۔ میں اُٹھا، مڑ کر دیکھا۔ قریب و دُور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کی لہروں سے ایک پودے کی شاخیں جنبش میں تھیں ——— چاند کی مدھم روشنی درختوں اور پودوں میں سے چھن چھن کر گر رہی تھی۔ میں نے اس پودے کو پکڑ لیا۔ اور دُور تک نگاہیں دوڑائیں۔ ہر طرف متجسسانہ دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ہر قدم پر خیال ہوتا۔ کہ قلعے کی پُر اسرار حسینہ پاس کے پودے میں چھپی ہوئی ہے۔ ہر لحظہ گمان ہوتا۔ کہ وہ ساحرہ جمیل مجھے دیکھ کر کسی زمین دوز کمرے میں چلی گئی ہے۔ اگرچہ بار بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تاہم ایک شدید پُر زور اور جنوں انگیز جذبہ تھا۔ جو مجھے ادھر سے ادھر، اُدھر سے اِدھر دوڑائے پھرتا تھا۔ نگاہوں کو کوئی ہستی نظر نہیں آتی

تھی۔ مگر دل کو کامل یقین تھا کہ وہ حسینہ اسی ویران قلعے کی پُراسرار خلوتوں میں سانس لے رہی ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہے۔ اس کے سیاہ لمبے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ نہایت دلآویز نہایت شاداب ہے۔ وہ سحر و فسوں کی ملکہ ہے۔ اور ہر ہر قدم پر نشہ بکھیرتی ہے۔

میں قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قلعے کے آخری حصے میں پہنچ گیا ——— سامنے ایک سیڑھی نظر آئی۔ میں سیڑھی سے نیچے اترا۔ اب معلوم ہوا کہ یہاں سے قلعے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں گھاس بہت حد تک ترتیب کے ساتھ اُگی ہوئی تھی۔ پودوں کی ترتیب بھی کسی باغبان کی رہینِ منت تھی۔ شاخوں پر طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میرے دل میں نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا۔ مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ دوشیزہ جسے میں انتہائی بے تابی کے ساتھ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اور جو اپنے معطر جلووں سے میرے خوابوں کی فضاؤں کو جھکا رہی ہے۔ یہیں کہیں پودے کے پیچھے ——— یہیں کہیں تالاب کے کنارے بیٹھی ہے۔ میں دیر تک پھرتا رہا۔ پھر حوض کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور بھٹکتے ہوئے، نشہ برساتے ہوئے تصورات کے ہجوم میں تیرنے لگا۔ نیند ایک نرم رو، نکہت بداماں جھونکے کی طرح میری آنکھوں میں آئی اور میں سو گیا ——— دیر تک سوتا رہا۔ یکایک میرے خوابِ حسیں کے افق سے دُور بہتی ہوئی ندی کے ترنم کی طرح ایک دلآویز نغمہ اٹھا اور فضا میں تھرتھرانے لگا۔ میں بیدار ہو گیا۔ وہ دلآویز نغمہ ابھی تک فضا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ واقعی یہ عالمِ بیداری تھا ——— میں آگے بڑھا اور آگے بڑھا۔ ترنم ریز آواز برابر گونج رہی تھی ——— پھر ——— یہ آواز بند ہو گئی ——— اس کے ساتھ ہی شاخوں کے زور زور سے آپس میں ٹکرانے کی آواز کان میں آئی!

ایک جگہ پہنچ کر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مجھ سے کچھ دُور گھاس پر ایک بربط پڑی تھی۔ میرا دل و دماغ مسرت کی مستیوں میں یکسر ڈوب گیا۔ میں تیزی کے ساتھ بربط کے پاس پہنچا۔ اور اسے اٹھا لیا۔

بربط نہایت حسین و جمیل تھی۔ اس کے سنہری تار چاندنی میں چمک رہے تھے۔

میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ "بربط اس قدر حسین و دلآویز ہے۔ تو پھر بربط والی کس درجہ خوبصورت ہو گی؟"

یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ اور میں اسی خیال کو لئے ہوئے، پودوں کی شاخیں ہٹا ہٹا کر، اُس غزالِ رمیدہ کو ڈھونڈنے لگا۔

اسی اثنا میں کچھ دُور مجھے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں اس کی طرف چلا ——— مگر سایہ بہت جلد غائب ہو گیا۔ میں نے بربط ایک طرف رکھ دیا۔ اور کھڑے ہو کر دیر تک نظریں دوڑانے لگا۔ میرا گمان تھا۔ کہ جلد ہی اس پُراسرار ہستی کو دیکھ لوں گا۔ جس کی یہ بربط ہے

مگر میرا خیال فریبِ تخیل ہی ثابت ہوا۔ ایک جنوں انگیز جذبہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ اور میں اس طرف چلنے لگا۔ جہاں ابھی ابھی میری نگاہوں نے ایک سایے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاخ کی ہر جنبش پر محسوس ہوتا۔ کہ وہ اسرار ہستی کسی پودے کے پیچھے چھپ کر شاخوں کو ہٹا کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ ہوا کی ہر سرسراہٹ پر گمان گذرتا۔ کہ وہ سحر طراز حسینہ مجھے دیکھ کر، خوف کے مارے بھاگ رہی ہے۔ اپنی مسلسل وحشتوں کی ناکامی کے باوجود میں نے تلاش جاری رکھی۔ اسے ہر ہر گوشہ میں تلاش کیا۔ ہر ہر کونے میں ڈھونڈا۔ مگر شاید وہ پانی کی ایک لہر تھی۔ جو دریا کے پہلو سے اٹھ کر تودۂ ریگ میں غائب ہو جاتی ہے۔ یا ایک تودۂ ریگ تھی۔ جو سمندر میں گر کر، پلک جھپکانے میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یا پھر وہ ایک روشن ستارہ تھی۔ جو نمودِ سحر پر آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ پودوں کی شاخیں یوں جھکی پڑی تھیں۔ گویا ان پر ایک عجیب و غریب طلسم کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔

آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر ننھے ننھے ستاروں کا کارواں خاموش، دم بخود، رکا ہوا —— چاند کی سیمیں کشتی ایک بڑے سیاہ بادل کے طلسماتی غار میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی ہوئی —— ابر پارے بہوت و ششدر —— ہوا حیرت زدہ رک رک کر چلتی ہوئی —— فضاؤں میں ہر طرف طلسم کے دھندلکے —— زمین پر ہر طرف سحر زا سایے۔ اور اس طلسم و سحر کی دنیا میں، اس سحر انگیز سایوں کی دنیا میں ایک پُر اسرار حسینہ سایوں میں چھپتی، سائے بکھیرتی، ایک سائے کی طرح رواں دواں ——!

یکایک ایک پودے کے قریب ایک سوکھی ٹہنی کو جنبش ہوئی۔ میرا سانس رک گیا، قدم رک گئے —— خیالات کی رو رک گئی —— میری آنکھوں کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر حمدی کھڑا تھا۔

حمدی دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے وہاں پہنچنا چاہا۔ مگر ابھی دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے۔ کہ حمدی غائب ——!

"حمدی یہاں اس ویران قلعے میں! میں نے خواب تو نہیں دیکھا؟ میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟ نہیں میں عالم بیداری میں ہوں؟؟ پھر ——؟" میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ اور جب واپس آیا۔ تو وہاں بربط کا نام و نشان بھی نہ تھا —— میں وہیں سو رہا۔ یہاں تک کہ قلعے کے مینار کے عقب سے سورج طلوع ہوا۔ اور میں قلعے سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

---

(۶)

دوسرے دن جب مغربی آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے لالہ فام ہو گیا میں گھر سے نکل کر سب سے پہلے قلعے کے پاس کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ اور حمدی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں امید و بیم کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا۔ اور جب مایوس ہو گیا۔ تو اسی پر اسرار رستے سے قلعے کے اندر داخل ہوا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ ابھی کوئی خلاف معمول واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور آنکھوں میں ایک دنیائے شوق و بے قراری لئے ہوئے میں قلعے کے اندر پہنچا۔

وہی طلسماتی دنیا تھی۔ وہی سحر آلود سائے اور پھر وہی میرا جذبۂ تجسس۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں اسی جگہ پہنچا۔ جہاں گزشتہ رات گزاری تھی۔ اور پودے کے قریب بیٹھ کر آواز کا انتظار کرنے لگا۔ یکایک کسی کنج سے ایک شیریں و دلآویز نغمہ نکل کر فضا میں تھرتھرایا۔ میں آہستہ آہستہ سانس روکے اٹھا۔ اور اس کنج کی طرف جانے لگا ــــــ آخر ایک سایے کی طرح وہاں پہنچا۔ وہاں میری نظروں نے جو منظر دیکھا۔ وہ میں تا دم واپسیں بھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں پودے سے لگ کر کھڑا ہو گیا ــــــ دوشیزہ کے سنہری بالوں کی لٹیں شفاف رنگ رخساروں پر یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے شفق کے سینے پر طلائی کرنیں تیر رہی ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت حسین تھیں۔ اور ان پر بھویں یوں چھائی ہوئی تھیں۔ گویا دریا کی سطح پر فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ لرز رہا ہے۔ اس کی پتلی پتلی نوازش انگلیاں بربط کے تاروں پر جنبش کر رہی تھیں۔ مجھ پر ایک نیم بے ہوشانہ کیفیت چھا گئی۔ ایک ناقابل تجزیہ نشہ میرے دل و دماغ کو محیط ہو گیا۔

وہ پر اسرار حسینہ چاند کا ایک خواب جمیل تھی۔ پھولوں کے ذہن کا تصور حسین تھی۔ اور پھر موسیقی کی روح سے نکلا ہوا ایک نغمۂ رنگین تھی۔ میں بے اختیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل کر فضا میں تھرتھرائی:

"ڈرو نہیں" ــــ میں نے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بربط گھاس پر گر پڑا۔

"ڈرو نہیں ــــ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں تمہاری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہا ہوں"! میں نے جلدی جلدی کہا

وہ او دپیچھے ہٹ گئی —— مجھے جانے دو —— یہ کہتے ہوئے اس کی سہمی ہوئی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ میں کھڑا رہا۔ اور وہ وحشی ہرنی کی طرح بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسے ڈھونڈا۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

آخر تھک کر بربط کو اپنے سینے سے لگا کر میں لیٹ گیا۔ نیند تو نہ آسکی۔ لیکن خوشگوار تصورات، نکہت کی موجوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔

اس واقعے کے بعد میں نے مسلسل کئی راتیں، ویران قلعے میں گزار دیں۔ مگر اس دوران میں قلعے کی ساحرہ کی جھلک تک بھی نہ دیکھ سکا۔ سوچتا تھا۔ کیا نسوانی فطرت اتنی ہی سنگدل ہوتی ہے۔ یا یہ میری قسمت ہے کہ جس عورت کو بے تابانہ چاہوں۔ وہی مجھ سے دور بھاگے، مجھ سے شدید نفرت کرے۔ پھر خیال آتا ممکن ہے یہ سب کچھ تخیل کی کرشمہ سازی ہو —— اس سنسان اور ویران قلعے میں کوئی حسینہ نہ ہو۔ اور میرے تخیل کی عجوبہ طرازیوں نے ایک دوشیزہ کا مرمریں پیکر اختیار کر لیا ہو۔ یا پھر دل میں کہتا یہ جھلکیاں دکھلانے والی —— جھلکیاں دکھا دکھا کر، دل کو بے تاب کرنے والی کوئی بدروح نہ ہو، جو مجھے ستا ستا کر اپنے لئے سامان مسرت پیدا کر رہی ہے۔

—— (۷) ——

ایک شام کو، جب کہ چاند پوری تابانی کے ساتھ فضائے آسمانی میں چمک رہا تھا، میں ایک گوشے میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھا تھا۔ کہ اتنے میں نرنم کی لہر سامنے کے پودے کی پیشانی سے بلند ہوئی۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا —— وہی پراسرار حسینہ وہاں بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی پکڑ لی —— کلائی پکڑتے ہی اس کے رخسار زرد پڑ گئے۔ وہ بمشکل بولی:۔

"مجھے چھوڑ دو ——!"

"بھاگو گی تو نہیں ——؟"

"نہیں —— مجھے چھوڑ دو!" اس نے [illegible] لرزہ خیز لہجے میں کہا۔

"یاد ہے، پہلے تم بھاگ گئی تھیں۔ اس لئے ——!"

"مجھے چھوڑ دو، کلائی میں درد ہو رہا ہے۔ اور ——"

"اور کیا؟"

"میں جانا چاہتی ہوں —؟"

"اس کا مطلب یہ ہے، کہ جب میں نے تمہیں چھوڑا۔ تم بھاگ جاؤ گی؟"

"ہاں" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا۔ کہ میں بھاگوں گی نہیں — اب کہہ رہی ہو بھاگ جاؤ گی؟"

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے؟"

"کیوں؟"

"تم مرد جو ہوئے — اور دادا جان کہتے ہیں۔ مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں — عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے رخسار اور پیلے پڑ گئے!

"حمدی نے یہ کہا ہے؟"

"نہیں! دادا جان نے۔"

"تمہارے دادا جان کون ہیں؟"

"دادا جان —؟ وہی جو میرے دادا جان ہیں!"

قلعے کی اس بھولی بھالی دوشیزہ نے محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور کہا "تو اب بھاگ جاؤ!"

حسینہ چند قدم چلی، پھر ٹھہر گئی — اور بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"تم ظالم تو نہیں ہو۔ نا؟" اس نے مترنم آواز میں کہا

"میں تو ظلم کا تصور بھی نہیں کر سکتا —" میں نے اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"مگر دادا جان کہتے ہیں۔ ہر ایک مرد ظالم ہوتا ہے!"

"تو پھر تمہارے دادا جان مرد نہیں — ان سے کیوں نہیں بھاگتیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر پودے کی ٹہنی کو ہلا کر کہنے لگی —

"... ر ظالم نہیں — وہ تو بڑے اچھے

جان ہیں"

"تو پھر سمجھ لو میں بھی بڑا اچھا ہوں"

"اگر تم بڑے اچھے ہو تو میں تم سے ضرور ملا کروں گی"

"تمہارا نام کیا ہے ——؟" میں نے پوچھا۔

"شاہینہ!"

"شاہینہ، بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام پوچھو گی؟"

"نہیں، تم خود اپنا نام بتاؤ"

"میں خود بتاؤں ——" میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"میرا نام شہاب ہے"

"شہاب بڑا اچھا نام ہے"

"کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ —— میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔

"اوہ! میری کلائی نہ پکڑو۔ تمہارے ہاتھ لوہے کے ہیں" اس نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو —— اگر تمہیں معلوم ہو جائے۔ کہ میں کتنا عرصہ تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا۔ تو تم شاید بہت غمگین ہو جاؤ"

"تم یہاں آئے کیوں؟"

"تمہاری تلاش میں —— شاہینہ!"

"میری تلاش میں تم یہاں کیوں آئے ——؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا —— تم سے ہر وقت باتیں کرنا چاہتا تھا"

"مگر میں ہر وقت باتیں نہیں کر سکتی۔ دادا جان تمہیں یہاں سے نکال دیں گے"

تم دادا جان سے یہ نہ کہنا۔ کہ شہاب یہاں آگیا ہے —— سمجھ لیا نا شاہینہ! ورنہ دادا جان تم سے ناراض ہو جائیں گے"

"میں نہیں کہوں گی دادا جان سے ——— اور اب میں جاتی ہوں ——— دادا جان یہاں نہ آجائیں"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ اور پودے کے پیچھے غائب ہو گئی!

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا ——— پھر قلعے سے نکل آیا۔

(۸)

جب دل کہیں اور ہو۔ تو ایک لمحہ بھی قیامت کی گھڑی بن جاتا ہے۔ اور مجھے تو جدائی کا پہاڑ سا دن گزرنا تھا۔ انتہائی بے چینی و بے تابی کے ساتھ میں طلوعِ آفتاب سے لیکر غروبِ آفتاب تک انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا۔ اور جب شام ہوئی۔ تو بے تابی سے قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور اندر پہنچ کر اسی محبوب کنج میں اپنی محبوبۂ دلنواز کا انتظار کرنے لگا۔

ماہِ چہار دہم کے بلوریں سینے سے نور کے دریا بہ رہے تھے ——— ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کی ملکہ نغمے اور خوشبوئیں برساتی نغموں اور خوشبوؤں کی سیڑھیوں سے اترتی میری طرف آ رہی ہے۔ جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے کنج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ دور وہ معصوم فطرت دوشیزہ سہمی سہمی سی، گھبرائی گھبرائی سی دامن میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔

میں نے اسے بلایا۔ مگر وہ وہیں سنگِ مرمر کی ایک مورتی بنی ہوئی کھڑی رہی۔

میں نے دوبارہ آواز دی۔ "آجاؤ شاہینہ"!

اس نے اپنے ریشمیں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دو قدم آگے چلی اور پھر رک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔

"کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر تمہیں پرواہ ہی نہیں"۔ میں نے کہا۔

"میں تو وہاں کھڑی تھی"!

"وہاں کھڑی تھیں، کب سے"؟

"بڑی دیر سے ——— شاید اس وقت تم یہاں نہیں تھے"!

"تو تم یہاں کیوں نہ آگئیں"؟

اس نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم آج بھی آگئے، کل بھی آئے تھے ——— اور شاید پہلے بھی آتے رہے ہو"!

"تم میرے آنے پر خوش نہیں؟"

"ہیں —— مگر دادا جان —— وہ دن بھر مجھے بتاتے رہے ہیں۔ کہ نوجوان مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی قصّے سنائے!"

"تم نے میری آمد کے متعلق دادا جان کو بتا دیا؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

وہ مسکرائی "میں نے کہا تو نہیں —— مگر"

"تم نے کہا نہیں۔ تو پھر کوئی ڈر نہیں!"

"تو تم آئندہ بھی آیا کرو گے؟"

"کیوں نہیں —— میں تو چاہتا ہوں۔ کہ ہر وقت یہاں رہوں؟"

"اوہ! ایسا نہ کرنا۔ دادا جان دن کے وقت یہاں ہوتے ہیں۔ مگر تم کیوں یہاں آنا چاہتے ہو؟"

"کیونکہ جب کسی سے محبت ہو جائے۔ تو دل کی یہی آرزو ہوتی ہے؟"

"تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے؟"

"تم سے ——!"

"مجھ سے محبت ہو گئی ہے —— اوہ!" وہ مسکرائی۔ "لیکن دادا جان جتنی محبت تم کبھی بھی مجھ سے نہیں کر سکو گے!"

میں اُس کے معصومانہ چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو —— یہ بات ٹھیک نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اور پھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلوں گی!"

"تم ناراض ہو گئیں —— مجھے اس کا افسوس ہے۔ مگر مجھے بتاؤ۔ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟"

"ہاں ——" اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔

"کتنی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی —— شاید اتنی محبت ہے۔ جتنی مجھے اپنی بربط سے ہے!"

یہ کہہ کر اس نے بربط کو سینے سے لگا لیا۔ بربط کے ایک سرے پر مور کی چونچ اس کے لعلیں لبوں کو مس کرنے لگی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں"!

"کچھ بھی نہیں ——!" "تو پھر تم بتاؤ، تم سے کتنی محبت کروں۔ لیکن یاد رکھو، میں تم سے ہرگز اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی اپنے پیارے دادا جان سے کرتی ہوں"۔

"وہ محبت اس بوڑھے کے لئے ہی رہنے دو!" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:۔

"پھر ——!"

"پھر —— آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا"۔

وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔

"شاہینہ!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "بولتی کیوں نہیں"!

"ہاں! کہو!!"

"خفا ہو گئیں تم"!

"نہیں —— بالکل نہیں"!

یہ کہکر اس نے بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیریں، اور پھر بربط میری گود میں رکھ دی۔ میں بربط بجانے لگا۔ اور وہ مسرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی —— نصف رات تک ہم بربط بجاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آخر گھبرا کر، دادا جان کے خیال سے مضطرب ہو کر، وہ چلی گئی۔ اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۹)

اس کے بعد میں خود کو نئی دنیا میں محسوس کرنے لگا۔ میرے افسردہ و پژمردہ دن، محبت کے حسین اور نغمتوں میں لپٹے ہوئے تصورات سے رنگین و معطر ہو گئے۔ اور میری مایوس و مضمحل راتیں قلعے کی ساحرہ جمیل کے یاسمیں جلووں سے پُر نور و خنداں۔ اس سے پیشتر میں خود کو دُنیا کا بدنصیب ترین شخص سمجھتا تھا۔ مگر اب اپنی خوش قسمتی کو نکتۂ کمال پر تصور کرنے لگا۔ میری تمام کائنات سمٹ سمٹا کر قلعے کی چار دیواری میں محدود ہو گئی۔ اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر صرف شاہینہ کے گرد گھومنے لگے۔ رات کو میں مسرتوں میں ڈوبا رہتا۔ اور دن کو ان مسرتوں کے خیالات میں غرق! آہ یہ زندگی کیسی عجیب زندگی تھی۔ خوابوں کی رنگینیوں میں تیرتی ہوئی ——

نگہتوں کے گہوارے میں جھولتی ہوئی، اور مسرتوں کی لہروں میں بہتی ہوئی خوش نصیب زندگی، اب بھی اس خوشگوار و دلآویز زندگی کا خیال کرتا ہوں۔ تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ شاید میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔

میں ہر رات کو قلعے میں جاکر مخصوص تالاب کے کنارے بیٹھ کر، اپنی معصوم صورت و معصوم فطرت محبوبہ کا انتظار کرتا۔ وہ مسکراتی ہوئی خراماں خراماں آتی۔ ہم دونوں شیریں و فرحت زا گیت گاتے، تالابوں کے کنارے ٹہلتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے اور میٹھی میٹھی، پیاری پیاری باتیں کرتے۔ اسی طرح رات گزر جاتی۔ اور جب سورج کی پہلی کرن میرے لئے رخصت کا پیغام لاتی۔ تو میں اپنی محبوبہ جاں نواز کے لعلیں لبوں پر الوداعی بوسہ دیکر قلعے سے باہر نکل آتا۔ دن پر دن، ہفتوں پر ہفتے گزرنے لگے۔ اگرچہ میں ہر رات کو اپنی شیریں ادا محبوبہ کے پاس رہتا۔ لیکن میری انتہائی خواہش یہ تھی۔ کہ دن کے وقت بھی وہیں رہوں۔ مگر اس میں ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ دن کے وقت حمدی شاہینہ کو عموماً اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا۔ اور اس صورت میں اس سے ملاقات کا ذریعہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا، رات کو تو وہ بے فکر ہو کر سو رہتا۔ اور شاہینہ کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقعہ مل جاتا!

شاہینہ کو جو کچھ معلوم تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ لیکن ابھی تک دو باتیں قطعی طور پر میرے لئے دو معمے تھے۔ پہلی بات تو یہ، کہ میں یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ شاہینہ کون ہے، اور حمدی اس کا حقیقی دادا ہے یا وہ اسے ویسے ہی دادا کہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حمدی نے شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر کے اُسے مردوں سے کیوں اس درجہ بدظن کر دیا ہے؟ میں ان دونوں باتوں پر بہتیرا غور کرتا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اگرچہ حمدی کو ہماری ملاقات کا علم نہ تھا۔ مگر یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک رات میں شاہینہ کے زانو پر سر رکھے، اس کی سنہری لٹوں سے کھیل رہا تھا۔ کہ حمدی ہمارے پاس آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بدن فرطِ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ شاہینہ کانپتی ہوئی لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی ——!

"شہاب ——!" حمدی نے غضب ناک آواز میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ شاہینہ نے حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی:۔

"دادا جان! یہ ان مردوں میں سے نہیں ہے۔ جو ——"

حمدی نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اور اگر میں اسے جلدی سے نہ تھامتا۔ تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

"بابا! غصے کو قابو میں کیجئے!" میں نے کہا۔

"یہ الفاظ کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی کمینے انسان! میں اس معصومہ کو تم ظالموں کے سایے سے بچا تا رہا ہوں۔ مگر آج

تم نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا ۔۔۔۔" یہ کہتے ہوئے حمدی کی رگیں اُبھر آئیں۔ آواز زیادہ غضب ناک ہو گئی۔ تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی ۔۔۔۔ تمہارا یہاں کیا کام تھا ۔۔۔۔ تم اس لئے یہاں آئے۔ کہ ایک معصوم فطرت دوشیزہ کو تباہ کیا جائے۔ ایک بوڑھے کے خونِ دل سے ہاتھ رنگے جائیں ۔۔۔۔؟"

"بابا سوچ سمجھ کر بات کیجئے! آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں ۔۔۔۔" میں نے قدرے خفگی سے کہا۔

"یہ الزام ہے ۔۔۔۔ ظالم کمینے ۔۔۔۔ ! میں تمہیں اچھی طرح نہیں جانتا۔ تمہارے دل کی ایک ایک بات سے واقف نہیں ؟"

شاہینہ ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور عاجزانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"دادا جان! چلئے میرے ساتھ ۔۔۔۔ چلئے نا دادا جان!"

حمدی کہے جا رہا تھا: "میں بوڑھا ہوں۔ مگر یاد رکھو۔ جب تک میرے کمزور و ناتواں جسم میں جان باقی ہے۔ تم اپنے ذلیل مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے ۔۔۔۔ میں اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے طاقتور گردن کو مروڑنا جانتا ہوں، جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے دکھے ہوئے دل کی بددعاؤں سے ڈرو ۔۔۔۔ اس مظلوم و بے کس کی آہوں سے ڈرو ۔۔۔۔ قدرت کے خوفناک انتقام سے ڈرو۔ جاؤ دور ہو جاؤ!"

"دادا جان! چلیے میرے ساتھ دادا جان!"

"ابھی تک وہیں کھڑے ہو تم ۔۔۔۔ مُردار کُتّے!" حمدی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہینہ نے حسرت ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا ۔۔۔۔ اور غمگین و حسرت آغوش لہجے میں کہا۔ "جاؤ ۔۔۔۔ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے!"

میں مڑ کر چلنے لگا۔

"خبردار! آئندہ یہاں نہ آنا" حمدی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

میں نے مڑ کر شاہینہ کی طرف دیکھا ۔۔۔۔ اس نے ہاتھ سے مجھے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

میں قلعے سے نکلا ۔۔۔۔ یہ محسوس کرتے ہوئے نکلا۔ کہ اپنی روشن، منور اور رنگین دنیا کو چھوڑ کر ایک نہایت تاریک

بھیانک اور متعفن غار کی گہرائیوں میں اُتر رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ پیشتر ـــــ میں انتہائی مسرور انسان تھا۔ میری قسمت کا ستارہ انتہائی بلندی پر چمک رہا تھا۔ مگر اب وقت کے ایک حقیر ترین حصے کے گزر جانے پر میری تمام روشن امیدیں۔ رنگین تمنائیں اور خوشگوار توقعات خاک میں مل چکی تھیں ـــــ آہ! مسرتوں کے زینے طے کرتے ہوئے، ثریا کی بلندیوں تک جا پہنچنا، اور پھر پامال و مجروح ہو کر تحت الثریٰ کی پستیوں پر آ کر گرنا۔ کتنا ہمت شکن، کتنا روح فرسا انقلاب ہے!

حمدی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے شاہینہ کا مرجھایا ہوا چہرہ بھی پھر رہا تھا۔ ہر قدم پر رُک رُک کر میں قلعے کی طرف دیکھتا تھا۔ ہر لمحہ میرے ذہن میں اپنی بدقسمتی کا احساس زیادہ تلخ ہوتا جاتا تھا۔

میں اسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہی بیٹھا ہوں گا۔ کہ میرے دل میں سیلابِ اشک موجزن ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور کافی دیر تک بہتے رہے۔ اس وقت مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درخت سسکیاں لے رہے تھے۔ ہوا آہیں بھر رہی تھی۔ اور مایوس، افسردہ چاند، ایک سیاہ مہیب بادل کی طرف رینگتے ہوئے اس طرح جا رہا تھا۔ جس طرح ایک بدنصیب محب، محبت کے زخموں سے نڈھال، اپنے روزگار کے حملوں سے پامال، سینے پر داغ تمنا لئے ہوئے، موت کے اندھیرے غار کی طرف جا رہا ہو!

اسی درخت کے نیچے حمدی پدرانہ شفقت کے ساتھ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا کرتا تھا۔ اور اب اسی درخت کے نیچے میں اس کے بیرحمانہ سلوک کو یاد کر رہا تھا۔ شاہینہ کہا کرتی تھی۔ کہ جس دن دادا جان کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہوا۔ اسی دن وہ سخت ناراض ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے۔ تمہیں یہاں آنے سے روک دیں۔ مگر مجھے حمدی سے سنگدلانہ سلوک کی توقع نہ تھی۔

اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں آنسو بہاتا رہا۔ آخر اشک ریزی ختم ہوئی۔ شاید میرے آنسو ختم ہو گئے تھے۔ ورنہ دل تو اب بھی رونے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے قلعے پر حسرت آگیں نگاہ ڈالی۔ اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دن انتہائی بے قراری کے عالم میں گزرا۔ جب شام ہوئی۔ اور طاقِ مغرب پر چراغ خورشید کا شعلہ تاریکیوں کے ہجوم میں سسکیاں لینے لگا۔ میرے قدم خود بخود قلعے کی طرف اُٹھنے لگے۔ قلعے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ پھر قلعے کے اندر چلا۔ دل زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کی دھڑکن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا۔ کہ بہت آگے نکل آیا ہوں۔ میں مُڑا۔ اور اسی جگہ پہنچا۔ جہاں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر میرا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ کہ یہ راستہ بند ہو چکا ہے۔

میرے ہاتھ کسی سخت چیز سے مس کر رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ سیڑھیوں کے بعد جو آہنی دروازہ تھا۔ اور جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا، بند ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک میں وہیں کھڑا رہا — حیران و سراسیمہ کھڑا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور یہ انتہائی مایوسی انتقام کی آگ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس وقت اگر حمدی میرے قریب ہوتا۔ تو یقیناً میں اس کی گردن مروڑ ڈالتا۔ میں پچھتانے لگا۔ کہ کیوں شب گزشتہ قلعے سے باہر نکل آیا۔ کیوں نہ اسے ہلاک کر ڈالا۔

تمام رات میں قلعے کے گرد چکر لگاتا رہا۔ کہ شاید اندر جانے کا کوئی راستہ مل جائے۔ مگر میری کوششیں رائیگاں ہی گئیں۔ آخر بالکل مایوس ہو کر میں گھر پہنچا۔ میرے دل میں ایک طرف تو امیدوں کی خاک بکھری ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دوسری رات بھی میں نے قلعے کے گرد چکر لگا کر گزار دی۔ اسی طرح کئی راتیں گزر گئیں۔ ایک شام کو جبکہ میرا دل و دماغ غم و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حمدی میرے سامنے کھڑا تھا۔ جی میں آئی کمبخت کو مار ڈالوں۔ مگر اس کی مایوس آنکھوں کو دیکھ کر میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ حمدی چند لمحے گھور کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ" یہ کہکر وہ اسی راستے کی طرف چلنے لگا۔ جو قلعے کے اندر جاتا تھا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم قلعے کے اندر تھے۔ حمدی بیٹھ گیا۔ اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جب بیٹھ چکا۔ تو وہ نرم اور محبت انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

"جانتے ہو۔ میں تمہیں کیوں یہاں لایا ہوں؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"تو سنو! سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر، اور ایک معصوم فطرت دوشیزہ پر ڈورے ڈال کر تم نے سخت ظلم کیا ہے۔ کاش تمہیں اندر آنے کا راستہ نہ معلوم ہوتا — اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کمی نہ کی۔ مگر جو ہونا تھا۔ وہ ہو کر ہی رہا"۔

وہ رک گیا۔ پھر غمناک لہجے میں کہنے لگا۔ "شاہینہ کا معصوم دل دنیا کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا — وہ زہر ہلاہل کو شہد سمجھ رہی ہے"۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا!" میں نے پہلی دفعہ پر جوش لہجے میں کہا۔

"میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں بیٹا! محبت دنیا کی خوفناک ترین مرض ہے۔ اس ظالم مرض نے صولت و یامین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اسی مرض سے بچانے کے لئے میں نے اپنی شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر رکھا تھا — مگر قسمت! شاہینہ

اس مرض میں مبتلا ہو ہی گئی۔"

"بابا! تم میرے دل کا حال نہیں جانتے۔ کاش میں اپنے زخموں سے بھرے ہوئے سینے کو تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کر سکتا!"

"تمہیں واقعی شاہینہ سے محبت ہے؟" حمدی نے پوچھا۔

"بدل وجان"

"اس کا ثبوت؟"

"میرا دل راکھ ہو چکا ہے!"

"کیا اس کے لئے قربانی کرو گے؟"

"میں اس کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں!"

"مگر یہاں قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سلمیٰ؟"

"سلمیٰ ——— سلمیٰ کو میں بھلا چکا ہوں! وہ ایک حماقت تھی ———!"

"تو کل تم شاہینہ کو بھی بھلا دو گے؟"

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا! ——— تادم واپسیں نہیں ہو سکتا ———! میں مرتے دم تک شاہینہ سے محبت کرتا رہوں گا! اس کا آپ کو یقین دلاتا ہوں!"

"تو شاہینہ کے لئے قربانی کرو گے؟" حمدی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہر وقت ———!"

"اگر تم قربانی کرنے کے لئے تیار ہو۔ تو سمجھ لو کہ آج سے تمہیں یہیں رہنا ہوگا؟"

"میری یہ انتہائی خواہش ہے ——— سب سے بڑی تمنا ہے!"

"تو آج سے تم یہیں رہو گے ——— قلعے میں سب کچھ ہے۔ تمہیں کسی چیز کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہوگی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو! شاہینہ کی آہ وزاری سے مجبور ہو کر میں تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اگر میں نے دیکھا۔ کہ تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے۔ اور تم میری بچی کو دھوکا دے رہے ہو۔ تو تمہارے اور اس کے درمیان سنگین دیوار کھڑی ہو جائے گی تم ہمیشہ

کے لئے اسے کھو دو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا ارادہ بدل نہیں سکتی ——— سن لیا تم نے۔ میں کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ شاہینہ کو دھوکا دیا جائے —— یہ کہتے ہوئے حمدی کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

- "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بابا! میں مرتے دم تک شاہینہ سے اسی بے تابی کے ساتھ محبت کرتا رہونگا"!

"تمہارے الفاظ مجھے یقین دلانے سے قاصر ہیں ——— خیر میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کہ شاہینہ کون ہے"؟

میں نے حمدی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی چمک تھی۔ جو سمندر کی سطح پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی رہتی ہے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا۔ کہ صولت اور یاسمین اسی قلعے میں رہتے تھے۔ اور میں نے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ قید خانے کی سنگین دیواریں انہیں جدا نہ کر سکیں، وہ آپس میں ملتے رہے ——— ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ابھی شیر خوار ہی تھی۔ کہ اس کے والدین قتل کر دیئے گئے۔ یہ بچی اسی غلام کے ہاں پرورش پانے لگی جو ان شہیدانِ محبت کو کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ اور ان کا ہمراز تھا——— .... آج وہ بچی شاہینہ ہے۔ اور وہ غلام صفدر یہ بوڑھا حمدی ——"!

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں!

"شاہینہ یاسمین کی بچی ہے!" میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں یہ اسی شہیدۂ محبت کی یادگار ہے"!

"تو یہ زندہ کیونکر رہی"؟

"بچی اپنی ماں کی کوٹھڑی میں تھی۔ اس لئے جلادوں کے پنجے سے بچ گئی۔ میں نے بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے اسے یہاں چھپائے رکھا ہے۔ اسے اپنے والدین کی کوئی خبر نہیں ——"!

میں نے حمدی کو اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اور انتہائی وفاداری کا وعدہ کیا۔ چند منٹ کے بعد میں شاہینہ کے پاس بیٹھا تھا۔

میں پھر قلعے میں رہنے لگا۔ اب میری زندگی اس قدر مسرور، اس درجہ مطمئن تھی۔ کہ مایوسی و اضطراب کا ہلکا سا سایہ بھی میرے دل و دماغ کے قریب نہیں بھٹک سکتا تھا۔ شاہینہ کی خوبصورت آنکھیں دو چاند تھے۔ جن کی عطر آگیں روشنی میں میرے دل کی دنیا ہر وقت جگمگاتی رہتی۔ اور ہر روز علی الصبح جب قلعے کے مشرقی، کہریں ملفوف مینار سے پرے، بلند درختوں کے اوپر خورشید کے بیچھ نوں میں سے روشنی کی ندیاں بہنے لگتیں۔ میں محسوس کرتا۔ کہ میری یہ دُنیا زیادہ روشن، زیادہ شاداب ہو گئی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اب کوئی غم، کسی چیز کی فکر مجھے غمگین و ملول بنا سکتی تھی؟

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر لمحہ میری مسرتوں میں اضافہ کرتا جاتا تھا۔ اور اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ یکایک میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا۔ میرے اور شاہینہ کے درمیان محبت قائم تھی۔ میری تمام مسرتوں کا سرچشمہ وُہ تھی۔ اور اس کی تمام خوشیوں کا مرکز میں ــــ پھر بھی ایک تھکاوٹ سی ایک اضمحلال سا ایک افسردگی سی میں اپنے دل و دماغ میں محسوس کرنے لگا۔ تغیر انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔ اور شاید میری زندگی بھی کسی تغیر کی متمنی تھی۔ ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ کیوں نہ کچھ دیر کے لئے باہر سیر کو آیا کروں؟ اس خیال کا اظہار میں نے شاہینہ کے سامنے کیا۔ وُہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی "مجھ سے اُکتا گئے کیا؟"

"یہ سن کر میرے دل پر برچھی سی لگی۔ کتنا بیہودہ خیال، نہ معلوم کبھی کبھی تم اتنی مایوس و یاس پرست کیوں ہو جاتی ہو؟ ذرا سوچو تمہاری زندگی یہیں گزر رہی ہے۔ اس کے برعکس میں شہر میں پیدا ہو، شہر میں رہا ـــــ؟"

"یہ درست ہے، تاہم میں ڈرتی ہوں۔ شہر میں ہزاروں دلچسپیاں ہوتی ہیں"

"پاگل لڑکی! میں وُہ ہزاروں دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں"

"اور اب مجھے ڈر ہے، تم مجھے چھوڑ کر ان ہزاروں دلچسپیوں کی طرف نہ چلے جاؤ!"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" میں نے کہا۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد یہ طے ہوا۔ کہ رات کے وقت کچھ دیر کے لئے میں قلعے سے باہر جایا کروں۔ اور چونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا۔ کہ حمدی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لئے اس سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

میں قلعہ سے نکل جاتا۔ اور شاہینہ مغربی مینار کے قریب کھڑے ہو کر مجھے دیکھتی رہتی۔ مغربی مینار کی بائیں طرف قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ گر پڑا تھا۔ اس لئے وہاں کھڑے ہو کر، انسان دور دور تک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن خلافِ معمول میری طبیعت دن بھر منغض رہی۔ میں شاہینہ سے اجازت لے کر قلعے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس رات "میرو کا میلا" ـــــــ ہے۔ اس لئے میں یہ سوچ کر کہ وہاں شاہینہ کے لئے چند چیزیں خرید لوں گا۔ "نصرتی باغ" کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں باغ میں پہنچا، اور اپنے آپ کو اپنے آشناؤں اور عزیزوں کی نظروں سے بچا کر چیزیں خریدنے لگا۔ اسی دوران میں باغ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ کچھ لوگ سستا رہے تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ میرے سامنے دو سیاہ آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں رک گیا ـــــــ میرے سامنے 'سلمیٰ' کھڑی گھور گھور کر، میری طرف دیکھ رہی تھی!

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور تیزی سے چلنے لگا۔ ایک آدھ چیز اور خریدی۔ اور باغ سے باہر نکل آیا۔ مگر محسوس کر رہا تھا۔ کہ سلمیٰ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

اپنی محبوبۂ دلنواز کی بے چینی کا خیال کر کے میں قلعے کو نزدیک ترین راستے سے جانا چاہتا تھا۔ مگر جب یہ سوچا۔ کہ کمبخت سلمیٰ برابر میرا تعاقب کر رہی ہے۔ تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ چند قدم طے کرنے کے بعد جب پلٹ کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ بدبخت سلمیٰ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے منہ پھیرا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا ایک بوجھ جو میری روح کو تکلیف دے رہا تھا اب موجود نہیں ہے۔ ایک سایہ جو میرے دل پر لہرا رہا تھا، اب غائب ہو گیا ہے۔

اندر جا کر میں نے تمام چیزیں اپنی محبوبہ کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک دم مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

مگر معلوم کیا بات تھی۔ کہ میرا دل بے چین ہو رہا تھا۔ آدھی رات گزرنے پر میں لیٹنے کو تو لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں، ذہن میں خلش اور خیلات کا ہجوم بے قرار تھا۔ اور میں بار بار سوچتا تھا، یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ سلمیٰ جس کے جور و ستم نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اب میری طرف بار بار دیکھے، میرے پیچھے پیچھے پھرے اور دیر تک پھرتی رہے؟ آخر اس تغیر کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ مجھے اپنے جال میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس التفات کے پردے میں کوئی خطرناک چال پوشیدہ ہے۔ یہی بات ہے، یقیناً یہی بات ہے: میں نے دل میں کہا۔ "لیکن میں اس کے دامِ تزویر میں ہرگز گرفتار نہیں ہونگا۔ میرا

دل، میرا دماغ، میری ہستی کا ذرہ ذرہ، شاہینہ صرف شاہینہ کے لئے وقف ہے۔ میری یہ محبوبہ جاں نواز کتنی نیک دل ــــ کتنی پاکیزہ روح، کتنی معصوم فطرت لڑکی ہے!

انہی خیالات میں رات کا بقیہ حصہ بھی گزر گیا۔ صبح میری صورت دیکھتے ہی شاہینہ مضطرب ہو گئی۔

"تمہاری آنکھیں اس درجہ سرخ ــــ کیا بات ہے شہاب؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــ کچھ بھی نہیں!" میں نے پھیکی ہنسی ہنسکر کہا۔ اور اپنی ذہنی کوفت کو دور کرنے کے لئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ شاہینہ بار بار مجھ سے میرے اضطراب کی وجہ پوچھتی رہی۔ مگر میں اسے ہنسی مذاق میں ٹالتا رہا۔

دو دن تک میں قلعے سے باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے دن میری طبیعت گھبرائی۔ میں شام کو قلعے سے باہر نکلا۔ پھرتے پھراتے آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا، کہ میرے سامنے وہی بدبخت عورت آکھڑی ہوئی۔ میرے قدم رُک گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ سلمیٰ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحے گزر گئے۔ میں تیزی سے چلنے لگا ــــ یہاں تک کہ قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس رات میں نے شاہینہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیا۔ اور کمرے میں جاکر لیٹ گیا ــــ مجھے خود پر بہت غصہ آرہا تھا۔ آخر میں کیوں اس بدبخت عورت سے ڈرتا ہوں۔ مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں۔ پھر اس کی صورت دیکھ کر کیوں میرے ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں۔ کیوں میری ہمت جواب دے دیتی ہے۔

میری نگاہوں کے سامنے سلمیٰ کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں پھرنے لگیں۔ میں سلمیٰ کے تصورات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی صورت میری نگاہوں تلے پھر رہی تھی!

میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں صاف فضا میں دھوئیں کے بادل بل پر بل کھاتے ہوئے لہرا رہے تھے۔ شام کے وقت میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہونگا۔ کہ سلمیٰ میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

"شہاب! ذرا ٹھہرو ــــ اتنی تیزی سے کیوں چل رہے ہو؟" اس نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا ــــ مگر میں اس کی طرف توجہ کئے بغیر چلتا گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وہ بولتی گئی ــــ اس کی آواز میں حسرت تھی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں مایوسی!

"میں تو اب تھک گئی شہاب!" اس نے کہا۔ اور میرا ہاتھ پکڑنے لگی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک پھوڑے سے پودے

پر گر پڑی۔ اور میں تیزی کے ساتھ چلتا گیا۔۔۔ ایک لمحہ توقف کئے بغیر چلتا گیا۔۔۔!

قلعے میں پہنچا۔ تو دیکھا۔ شاہینہ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے نشان ہیں۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑی۔ اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"آہ شہاب! تم نے مجھے بڑا بے قرار کیا۔۔۔ تم کیا جانو، مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟"

"تمہارے پہلو میں بہت نازک اور ننھا منّا دل ہے۔ ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو!" میں نے کہا۔

اس نے مجھے پر حسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اور میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ میں نے بھی اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

فضا میں ایک چکوی بے قرارانہ اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر اُڑ رہی تھی۔ اور اس کی درد انگیز آواز ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔

"میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔۔۔! تم قلعہ سے باہر کیوں جاتے ہو؟ آئندہ یا تو باہر نہ جایا کرو، یا پھر مجھے بھی لے جایا کرو! تم یہاں سے چلے جاتے ہو تو۔۔۔!"

"تم پاگل ہو شاہینہ! ذرا تفریح کے لئے باہر چلا جاتا ہوں!"

"باہر چلے جاتے ہو۔۔۔ تفریح کے لئے۔۔۔ تفریح۔۔۔ اچھا!" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے!

میرا دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو سینے سے لگا لیا۔ اور میرے ذہن سے تمام کشمکش دور ہو گئی۔

چند دن کے بعد میں پھر قلعے سے نکلا۔ جب تک پھرتا رہا۔ سلمیٰ کی صورت نظر نہ آئی۔ مگر جب قلعے کے قریب پہنچا۔ تو میں نے اپنے قریب ایک سایے کو دیکھا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یقیناً سلمیٰ نے قلعے کے اندر جانے کا پُر اسرار راستہ دیکھ لیا ہے۔۔۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اور کافی دیر کے بعد قلعہ کے اندر گیا۔۔۔ لیکن جو یقین دل پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ کیونکر دور ہو سکتا تھا؟

آندھی کے تیز و تند جھونکے بلند اور گنجان درخت کو گرا سکتے ہیں۔ مگر اس درخت کی کسی شاخ سے لپٹے ہوئے جالے کو نہیں ہٹا سکتے۔ اسی طرح میری مسلسل کوششیں سلمیٰ کے تصورات کو بھی میرے ذہن سے نہ نکال سکیں! ہر بار جب میں قلعے

سے نکلتا۔ وہ مجھے دکھائی دیتی ـــــ مجھ سے بولنے کی کوشش کرتی۔ اگرچہ میں اس کا جواب نہ دیتا۔ اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا۔ تاہم وہ بدبخت عورت ایک ناگن بن کر، میرے جسم کی تہوں میں سے گزرتی ہوئی، دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنا زہر بکھیر رہی تھی۔

ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی :-

" ذرا شہاب سوچو تو سہی، تمہاری یہ حرکت کتنی بے رحمانہ ہے۔ تم اس عورت سے بھاگ رہے ہو جس کے نقش قدم بھی تم چومتے رہے ہو ـــ میرے شہاب ! اس تغیر کا سبب ؟"

" مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں، بدبخت عورت !" میں نے کہا۔

" تمہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ـــ کوئی واسطہ نہیں۔ یہ الفاظ شہاب تم کہہ رہے ہو ؟"

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

" شاید تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو ـــ میں بھی تمہارا امتحان لیتی رہی ہوں ـــ !"

" میرا امتحان ؟"

" میرے شہاب ! میں نے تمہارا امتحان لیا تھا۔ میرا دل محبت کی آگ میں جل چکا تھا۔ مگر میں تمہاری محبت کو آزمانے کے لئے تمہاری جانب دیکھتی بھی نہ تھی۔ اور جب تم محبت کے امتحان میں پورے اُترے تو یہاں سے چلے گئے ـــــ نہ معلوم کہاں ؟ میں تمہارا انتظار کرتی رہی ـــــ یہاں تک کہ تم آگئے ! انتظار کی کیفیت سے تو تم واقف ہو ـــــ !"

انتظار کا لفظ سن کر میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے سلمیٰ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اور سامنے دیکھا۔ کچھ دُور ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ایک نازک پودا اس طرح ہل رہا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ٹوٹ جائے گا۔ میں نے قدم اٹھایا۔ سلمیٰ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

" شہاب ! تم اتنے ظالم نہیں ہو سکتے !"

میں رک گیا۔ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پچھلے واقعات دہرانے لگی ـــ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے !

آہ ! میری کمزوری !! وہ تمام منحوس رات میں نے سلمیٰ کے پہلو میں گزار دی !

جب علی الصبح میں قلعے میں پہنچا۔ تو شاہینہ کو مغربی مینار کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں شب بیداری کے

باعث سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ اور بال بے ترتیب و پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی:۔

"رات بھر کہاں رہے شہاب!؟"

"کہیں بھی نہیں ـــ تم مضطرب کیوں نظر آ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"رات بھر کہاں رہے شہاب؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"گھر چلا گیا تھا شاہینہ!" میں نے جواب دیا۔

"گھر چلے گئے تھے سچ کہتے ہو؟"

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟ تمہیں میری بات پہ اعتبار نہیں؟"

"شہاب!" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تم پر اعتبار نہیں کرونگی تو دنیا میں کس پر کرونگی؟"

"تو پھر جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اسے درست مان لو!"

"تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ خیر چھوڑو اس بات کو!"

"شاہینہ! تم میں یہ بہت بُری عادت ہے۔ کہ تم بہت جلد بے چین ہو جاتی ہو!"

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ دو تین لمحوں کے بعد اس نے نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور قریب ہی ایک پودے کے لرزتے ہوئے سایے کو دیکھنے لگی ـــ چند لمحے اور خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "جب تم یہاں نہیں ہوتے۔ تو میرے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے ـــ تمہیں کیونکر بتاؤں۔ کہ یہ رات میں نے کس بے تابی سے کاٹی ہے؟"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ تم میری محبت کو بدگمانی کی نگاہوں سے دیکھتی ہو!"

"نہیں یہ بات نہیں ـــ مگر معلوم نہیں۔ کیا بات ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

اپنی محبوبہ کی بے تابی دیکھ کر میرا دل پریشان ہو گیا۔ اور اس دن میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ آئندہ قلعے سے باہر نہیں نکلونگا ایک ہفتہ گذر گیا ـــ میری طبیعت گھبرائی۔ اور انتہائی بدقسمتی یہ کہ شاہینہ سے میری طبیعت اکتا گئی۔ میں قلعہ سے نکلا۔ اور دو راتیں اور دو دن سلمٰی کے ہاں گذار دیئے۔ جس وقت واپس قلعہ میں پہنچا۔ تو حمدی نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ مجھے سختی کے ساتھ باہر جانے سے روکا۔ اور منت سماجت سے کہا "شاہینہ پر رحم کرو" اس دن تو میرا دل موم کی طرح نرم ہو گیا۔ مگر چند دن کے بعد یہ نرم دل پتھر

بن گیا۔ میں نے قلعے سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ اور شاہینہ سے اجازت مانگی!

آہ! وہ ملاقات ہماری آخری ملاقات تھی۔ آسمان پر کالی کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ایک گوشے میں مایوس و مضمحل افسردہ و پژمردہ چاند یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا کوئی فراق کے صدموں کی ماری، مجروح دل حسینہ بستر مرگ پر آخری سانس لے رہی ہے۔ شاہینہ حزن انگیز گیت گاتی رہی۔ اور بار بار روتی رہی۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی۔ اس نے اپنے آنسو خشک کئے۔ اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمارے قریب کھڑے ہوئے درخت کی ٹہنی سے دو پتے گرے۔ ایک تو شاہینہ کے بازو سے مس کرتا ہوا میرے پاؤں پر آ گرا۔ اور دوسرا ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

چار ہفتے، مسلسل چار ہفتے میں ظالم، چڑیل سلمیٰ کے دام فریب میں گرفتار رہا۔ وہ مجھے ہر لحاظ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتی رہی۔ اور میں ظالم انسان، کمزور دل انسان، اور پھر انتہائی بے وفا انسان اس کی باتوں میں آ گیا۔ آہ! اٹھائیس دن، اور اٹھائیس راتیں میں نے اس کے پہلو میں گزار دیں۔ اس کے بعد جب میرے دل کا شعلہ بھڑکا۔ تو میں جنوں انگیز عجلت کے ساتھ قلعے میں پہنچا۔ مگر اب وہاں کیا دھرا تھا۔ میں نے قلعہ کا ہر گوشہ چھان مارا۔ لیکن نہ تو شاہینہ کہیں نظر آئی۔ اور نہ حمدی!

دنیا میری آنکھوں تلے تاریک ہو گئی۔ دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا ——— انتہائی تلاش کے باوجود بھی مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا —— دن کا آخری حصہ گزر رہا تھا۔ اور میں قلعے میں وحشیوں کی طرح پھر رہا تھا۔ یکایک مغربی مینار کے پاس مجھے ایک سفید سی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں شاہینہ شاہینہ پکارتا ہوا، اس کی طرف دوڑا ——— وہاں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا، کہ ایک متوحش خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرے سامنے سلمیٰ کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔

"میرے شہاب! وحشیوں کی طرح کیوں پھر رہے ہو؟" اس نے کہا

"تم ——— یہاں؟"

"میں یہاں کیوں نہیں آ سکتی۔ آؤ میرے شہاب! اس ویران قلعے سے باہر نکلیں۔ اب ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں!"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔

"کیا کہا تم نے؟" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے کو دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہو گئی ——— اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "میں نے کہا میرے شہاب اب

یہاں سے باہر نکلیں، دیکھتے ہو قلعہ کتنا ویران اور سنسان ہے"!

"تم نے شاہینہ کو۔۔۔؟"

"شاہینہ، کون شاہینہ؟" منگلے نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ خود بخود اس کی گردن کی طرف اُٹھنے لگے۔ دو تین لمحوں کے بعد اُس کی گردن میری مضبوط گرفت میں تھی۔

"بتاؤ شاہینہ کہاں ہے؟ سچ سچ بتاؤ! ورنہ گردن مروڑ ڈالوں گا" میں نے اس کی گردن کو دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی!

"سُنا ہے، وُہ یہاں سے چلی گئی ہے" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

سُنا ہے ۔۔۔ سُنا ہے؟؟ ۔۔۔ سچ سچ نہیں بتاؤ گی؟؟؟" یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ وُہ پیچھے ہٹ گئی۔ اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی:۔

"یہ سب کچھ محبت کی وجہ سے ہوا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ کہ کوئی اور بھی تم سے محبت کرے۔ تمہارا تعاقب کرتی ہوئی میں وہ تین دفعہ یہاں آ چکی تھی۔ اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہینہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور تم اس سے ۔۔۔ اس لئے میری محبت نے مجبور کیا۔ کہ اس کانٹے کو راہ سے ہٹا دوں۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے میں نے تمہیں اپنے ہاں رہنے پر مجبور کیا۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور تم وہاں نہ پہنچے۔ تو میں نے قلعے میں آ کر شاہینہ اور بوڑھے سے کہہ دیا۔ کہ شہاب اب قلعے میں نہیں آئے گا۔ وُہ میرا محبوب ہے ۔۔۔ اس کے ایک ہفتہ بعد جب میں پھر یہاں پہنچی۔ تو وُہ جا چکے تھے"!

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں جانتی ۔۔۔ بوڑھے نے اس دن شاہینہ سے کہا تھا۔ کہ شاہینہ! اب ہمیشہ کے لئے اِس قلعے کو چھوڑ دیں ۔۔۔ یقیناً وُہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں"!

"میرے کانوں میں حمدی کے وہی الفاظ گونجنے لگے۔ جو اس نے قلعے میں کہے تھے!

"ذلیل عورت! تو نے مجھے سخت دھوکا دیا۔ اب تو بھی زندہ نہیں رہ سکتی" میں نے کہا۔ اور اس کی گردن پکڑ لی۔

"شہاب! میرے شہاب!" اس نے کہا۔ اور اپنی گردن چھڑانے لگی۔ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی ۔۔۔ زخمی ہرنی کی طرح اس

نے مجھے دیکھا۔ اور بھاگی ——— یکایک فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی ——— میں نے نیچے دیکھا ——— پتھروں پر خون میں لتھڑا ہوا گوشت نظر آرہا تھا ——— میں نے بھی اپنے آپ کو نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر جب یہ خیال آیا: شاید شاہینہ مل جائے!؟ تو میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۱۳)

سالہا سال میں شاہینہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ مگر کہیں بھی اسے نہیں دیکھ سکا۔ نہ معلوم حمدی اسے ——— کہاں لے گیا ہے ——— کائنات کے کس گوشے میں وہ سانس لے رہی ہے ———!؟

آج میں پھر قلعے میں بیٹھا ہوا، یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ جس جگہ بیٹھا ہوں وہی جگہ ہے، جہاں پہلے پہل میں نے شاہینہ سے گفتگو کی تھی۔ اور ——— جہاں بیٹھ کر میں اُس کا انتظار کیا کرتا تھا!!

میری آنکھوں کے سامنے تاریک سائے پھر رہے ہیں ——— چند سانس باقی رہ گئے ہیں ——— کاش میں ان آخری لمحوں میں بھی اپنی ——— محبوبہ کو دیکھ سکوں ———!!!

صحرانورد
کا
آٹھواں خط

پیارے دوست ———————————— !

آخر ایک مدت کے بعد تمہاری پیاری تحریر آنکھوں کے سامنے آئی۔ اب یہ نہ پوچھو، کہ میں نے اُسے کتنی بار پڑھا، کس دلچسپی و شوق کے ساتھ پڑھا۔ ممکن ہے تم اسے صرف مبالغہ سمجھو۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ جس بے تابی کے ساتھ تم میرے خطوط کا انتظار کرتے رہتے ہو۔ اسی بے تابی کے ساتھ میں بھی تمہاری تحریر کا منتظر رہتا ہوں۔ تمہاری تحریر مختصر سہی، بے کیف سہی، کسی دلچسپ رومان سے یکسر محروم سہی، پھر بھی یہ تمہاری تحریر ہوتی ہے۔ ایک نہایت پیارے دوست — ایک نہایت عزیز ہستی کی پیاری تحریر کیا یہ امر میرے دعوے کی ناقابلِ تردید دلیل نہیں؟

میں نے جب پچھلا رومان بھیجا تھا اس وقت یہ رومان بھی مکمل تھا۔ اور خیال تھا۔ کہ دونوں رومان بھیج دوں گا۔ لیکن یہ ارادہ جلد ہی بدل گیا۔ کیونکہ اس رومان کو زیرِ تحریر رومان کے ساتھ بھیجنا چاہتا تھا۔ اور اب جب کہ یہ رومان بھی مکمل ہو چکا ہے۔ میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں۔ یہ رومان جو ابھی ابھی مکمل ہوا ہے۔ ایک نئی زنجیر کی کڑی ہے۔ اور چند ماہ کے بعد تم اسے اپنے پاس پاؤ گے:

یہ نیا سلسلہ قریباً آٹھ طویل رومانوں پر مشتمل ہے۔ اور تمہیں یقین کرنا چاہیے۔ کہ یہ داستانیں میرے پہلے رومانوں سے زیادہ دلچسپ و دلآویز ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا۔ کہ میں محض تمہاری آتشِ شوق کو بھڑکا رہا ہوں۔ ہرگز نہیں! مجھے تو صرف حقیقت کا اظہار مطلوب ہے۔ اور یہی چیز میرے قلم سے یہ سطریں لکھوا رہی ہے۔

فی الحال انتظار کرو۔ خلشِ انتظار میں بھی ایک قسم کی لذت ہوتی ہے۔ اور پھر تمہارے جیسے رومان پرست انسان کے لئے تو خلشِ انتظار اور بھی لذیذ شے ہے۔

حسبِ عادت تم نے اس خط میں بھی میرے موجودہ حالات کے متعلق دریافت کیا ہے۔ عزیز و مکرم دوست! میں تمہاری محبت ہے۔ تمہاری ہمدردی کا شکرگزار ہوں۔ مگر جیسا کہ میں اپنے بیشتر خطوط میں لکھ چکا ہوں صحرائی زندگی کی گوناگوں سحر انگیز

کیفیات کا تجزیہ میرے قلم و زبان کی طاقت و وسعت سے بہت بلند ــــ بہت بالا واقع ہے۔ صحرا کی لق و دق بے برگ و بار اور پھر خوفناک و ہیبت زا دنیا، انسانی تصور سے زیادہ پُراسرار، سحر طراز اور رُومان پرور دنیا ہے۔

صحرا انسانی زندگی کا ایک مہیب خواب ہے جو لامحدود خوفناک وسعتوں پر بکھرا پڑا ہے ــــ صحرائی زندگی ایک مست و مخمور نغمہ ہے۔ جو طلسم زا دھندلاہٹوں کے دامنوں میں رقص کر رہا ہے۔ اور پھر صحرائی مناظر نغمہ و نگہت کے دلآویز مادی پیکر ہیں۔ جو ہر وقت فضاؤں میں لہراتے رہتے ہیں۔ یہاں کا خود رَو پھول، رنگ و بو کا ایک حسین مجموعہ ہی نہیں۔ بلکہ قدرت کی نادر ترین صناعی اور کامل ترین رعنائی کا ایک لاجواب نمونہ بھی ہے ــــ یہاں کا ہر گوشہ ریت کے صرف چند تودوں، چند بے برگ و بار درختوں اور چند طرح طرح کی جھاڑیوں ہی پر مشتمل نہیں ــــ بلکہ اِن بے رنگ و آب صحرائی عناصر کے ذرّے ذرّے میں وہ حُسن رقصاں ہے۔ جو کہیں تو دلنشیں کرنیں بن کر چاند کے شفاف سینے سے جلوہ نما ہوتا ہے، اور کہیں موسیقی کی کیف آگیں لہروں میں تبدیل ہو کر بربط کے تاروں پر لہرا رہا ہے۔ مگر اس حُسن، اس رُوح دروں کائنات کی حقیقت سمجھنے کے لئے حقیقت پرست آنکھ کی ضرورت ہے۔ سطح بین نگاہ کے لئے یہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا ــــ!

تم نے اپنے خط میں پوچھا ہے۔ کہ یہاں کی تنہائی سے میں گھبرایا رہتا ہوں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اوّل تو آغا بلم کی شخصیت اسقدر دلچسپ ہے۔ کہ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور پھر یہ بھی دیکھو ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال   ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

میری خیال آرائیاں ہر وقت میرے لئے ایک نئی دُنیا آباد کئے رکھتی ہیں:

سچ کہتا ہوں، جب سفر کرتے ہوئے کوئی انسانی کاسۂ سر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ تو تصور مجھے ایک نئی دنیا میں لیجاتا ہے۔ ایک ایسی دُنیا میں جہاں میں اپنے ارد گرد ایک عجیب و غریب تہذیب، ایک حیرت زا تمدن اور ایک ناقابلِ فہم معاشرت کے آثار پھیلے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ ماضی کے کھنڈرں سے حیرت انگیز انسانی شکلیں نمودار ہوتی ہیں ــــ حیرت انگیز شکلیں اور اُن کے ساتھ ہی پُراسرار نغمات ــــ مجھ پر گھنٹوں ایک ناقابلِ تحلیل کیفیت چھائی رہتی ہے۔ اور پھر جب کسی اُونٹ کی ہڈیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تو میری آنکھوں کے سامنے ایک کارواں آجاتا ہے جو تاروں کی چھاؤں میں اپنا راستہ طے کر رہا ہے۔ گھنٹیوں کی خوش آہنگ آواز سے فضا میں ایک طلسم انگیز ترنم لہرا رہا ہے۔ اور حدی خواں کی وجد آور آواز سے ہوا کی لہروں میں ایک طلسمی نشہ سا بکھر رہا ہے۔ کیا اِن ہنگامہ آرائیوں کے باوجود تم مجھے تنہا سمجھو گے؟ میرا خیال ہے۔ میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ اور مگر، ہے یہ

سطریں تمہیں اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں!

آغا بہرام تمہارے سلام اور تمہاری یاد آوری کا بہت ممنون ہے۔ امید ہے تم میرے شکریے کے ساتھ اس کا شکریہ بھی قبول کرو گے ——— چند ماہ تک نئے سلسلے کے رومان بھیجنے شروع کر دوں گا۔

امید ہے تم بخیریت تمام ہو گے ——!

تمہارا ——— "صحرا نورد"

(۱)

ابھرتا ہوا آفتاب شہر تمارت کی بلند، مہیب اور کہر میں ملفوف مشرقی فصیل پر کہیں کہیں روشنی کے مخفی خطوط کھینچ رہا تھا۔ فصیل سے دُور ایک وسیع میدان میں درختوں کے خزاں دیدہ، زرد زرد پتے تیز و تند ہوا کی سفاکانہ ٹھوکریں کھا کھا کر، ماتمی صدائیں بلند کرتے ہوئے اُن مظلوم غلاموں پر گر رہے تھے۔ جو "تمارت" کی موجودہ حکومت کے حکم سے شاہی باغوں اور کھیتوں کو سرسبز و شاداب رکھنے پر مقرر تھے۔ یہ مظلوم اور تیرہ بخت غلام رات کے آخری حصے ہی میں اپنے گھروں سے نکل کر اس وسیع میدان میں پہنچ جاتے۔ اور یہاں پہنچکر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ہل جوتتے۔ پودوں کو سینچتے، پھلوں کی آبیاری کرتے۔ اور ان کے علاوہ اپنے تند خو افسروں کے حسب حکم ہر ذلیل سے ذلیل، ہر سخت سے سخت کام کرتے۔ اور جب شام کی تاریکی پھیل جاتی۔ تو اپنے زخمی جسموں اور زخمی جسموں سے زیادہ زخمی روحوں کو لئے ہوئے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ یہی ان کے روزانہ فرائض تھے۔ اور انہی فرائض کی تکمیل ان کی غلامانہ زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ——!

صبح گوناگوں جلوے لئے ہوئے طلوع ہوتی تھی۔ دن مختلف کیفیات پیدا کرتا ہوا، رات کی تاریکیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ ان زخمی روح غلاموں —— ان حسرت نصیب ہستیوں کی دُنیا، ہر وقت صرف ایک ہی محور کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ اور وہ تھا غلامانہ بے چارگی کا محور —— طلوع سحر کے وقت بے نور و مضمحل چاند، انہیں لرزتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہی دیکھتا —— شام

کے روبہ زوال آفتاب کو ان کے زخمی اور دہشت زدہ جسم ہی نظر آتے۔ اور رات کی تاریکی میں ہوا کی لہریں ان کی کراہوں، اور آہوں ہی کو سُنتیں ——— الغرض ان کی زندگی سانس لیتی ہوئی دہشت تھی چیختا چلاتا ہوا خوف تھا۔ اور خاک و خون میں تڑپتی ہوئی بے کسی تھی ——— اِسی حال میں ان کی زندگی گزر رہی تھی ——— گزرتی چلی جا رہی تھی!

آج بھی وہ حسب معمول اپنے فرائض انجام دے رہے تھے ——— اُن کے آقایانِ محترم وہاں موجود نہیں تھے۔ مگر اس سے کیا؟ اُن کے آقایانِ محترم کے جسم خراش بید تو ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ حکومت کی بے دردی و سفاکی کا لرزہ خیز احساس تو ہر لمحہ اُن کے دل میں موجود تھا۔ اور اپنی غلامانہ بیکسی کا یقین تو ہر وقت ان کی روحوں پر مسلط تھا۔ یہ احساس ——— یہ یقین کیا ان کو بے چارگی و بے کسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا؟؟

سورج اُبھرتا جا رہا تھا ——— روشنی پھیلتی جا رہی تھی!

یکایک ایک غلام نے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ پیشانی پر رکھ کر اُبھرتے ہوئے آفتاب کو دیکھا۔ اور لرزتے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا:۔

"آج تو سورج نکلتا نہیں سردی سے مر جائیں گے!"

دوسرے غلام نے قہر انگیز نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ اور کرخت آواز میں بولا۔ "مر جاؤ! تمہیں زندہ رہنے پر کون مجبور کرتا ہے؟"

پہلے نے لمبی آہ بھری اور کہا۔ "غلامی کے سوا کون ہمیں زندہ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ ہم مر گئے تو کون ان باغوں کو پانی دے گا؟ کون ان کھیتوں کی پرورش کرے گا؟ کون اپنے ننگے جسموں پر خونخوار تاتاریوں کے بید کھائے گا؟؟ کون ———"

"ہمارے ساتھ 'سمارت' کے تمام باشندے تو نہیں مر جائیں گے؟ جانتے نہیں اس بدنصیب ملک کا ہر باشندہ تاتاریوں کا غلام ہے؟" دوسرے نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو درست ہے صفدر!"

صفدر نے ایک زرد پتے پر جو ابھی ابھی زمین پر گرا تھا۔ اپنا پاؤں رکھا۔ اور قدرے پرجوش لہجے میں کہنے لگا: "فاتح قوم کو غلام ملک کے باشندوں پر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے۔ وہ ان کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ ان کی روحوں کو حقارت سے ٹھکرا سکتی ہے اور اُن کے دماغوں کو ہر طرح کچل سکتی ہے ———!"

اس کے جواب میں صفدر کے ساتھی نے آہ بھری۔ اور اپنے ان ساتھیوں کو دیکھنے لگا جو کندھوں پر بڑی بڑی شہتیریاں اٹھائے سامنے پہاڑی کے دامن میں سے گزر رہے تھے۔

ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ صفدر کے چہرے پر حسرت چھا گئی۔ اور اس نے لمبی آہ بھر کر کہا۔ "کاش! پاشا زندہ رہتا ———!"

"اگر پاشا زندہ رہتا۔ تو آج ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہوتا۔" صفدر کے ساتھی نے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اب سورج فصیل کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ غلام اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

"غلام کتو!" یکایک ایک تاتاری افسر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی "شار شار" کی آواز آنے لگی۔ تاتاری افسروں کا یہ روزمرہ دستور تھا۔ کہ وہ آتے ہی غلاموں کے جسموں کو بید سے ادھیڑنے لگتے۔ اور یہ کام ان کے لئے محض تفریح طبع کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ آج بھی وہ اپنی تفریح طبع میں مشغول تھے۔

سورج کی روشنی اب غلاموں کی تاریک دنیا میں بھی پہنچ چکی تھی۔ ہوا میں بدستور تیزی و تندی موجود تھی۔ اور اس کے طوفانی جھونکے درختوں کے پتوں کو نوچ نوچ کر غلاموں پر گرا رہے تھے۔ فصیل کے اوپر ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اڑا چلا جا رہا تھا!

اچانک ایک تاتاری کے ہاتھ حرکت کرتے کرتے رک گئے۔ اور وہ مغرب کی جانب دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا خون میں تر اور ایک کھیت کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کے بازو بلند ہوئے۔ اور اس کے منہ سے ہانپتی ہوئی "اوفو، اوفو" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ اس کے بازوؤں کے بلند ہوتے ہی ایک بڑی سی شہتیری پہاڑی سے لڑھکنے لگی۔ اور پھر دوسرے لمحے میں ایک شخص پہاڑی کے دامن میں گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔ تاتاری افسر لڑکے کی طرف تیزی سے چلنے لگے۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ وہاں پہنچیں۔ لڑکا دھم سے زمین پر گر پڑا۔ ایک تاتاری افسر نے خون میں لتھڑے ہوئے لڑکے کو اپنے بید سے ہلایا۔ لڑکے کے منہ سے خون کی دھار نکلی۔ اور بید کے کچھ حصے کو سرخ کر گئی ———! اب دوسرا تاتاری بھی لڑکے کے چہرے پر جھک گیا۔ چند لمحے گزر گئے۔ یکایک پہاڑی کے دامن سے گرد و غبار کی آندھی سی اٹھتی ہوئی نظر آئی ——— یہ آندھی بڑھنے لگی۔ سب کی نگاہیں اس طرف دیکھنے لگیں۔ تاتاری افسروں کے قریب پہنچ کر گرد و غبار کے کثیف پردے میں سے ایک سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا نمودار ہو گیا۔ اور دو تین لمحوں کے بعد ایک نوجوان نے گھوڑے سے اتر کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لڑکے کو بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔ ایک تاتاری افسر کے ہاتھ سے فرط حیرت میں بید گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے "پاشا" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجی ———!

اس وقت ان کے سامنے حکومت سمارت کا سب سے بڑا باغی کھڑا تھا ـــ!

دونو افسر پاشا کی طرف لپکے پاشا نے ایک ہاتھ سے زخمی لڑکے کو سنبھالا۔ اور دوسرے ہاتھ سے دشمنوں کا مقابلہ کرنے لگا چند لمحوں کی کشمکش کے بعد وُہ گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکے کے منہ سے اور خون نکلا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ آپس میں ٹکرانے لگے ـــــ اور اُن سے اُدفو، اُدفو کہتی ہوئی، ہلکی سی مضمحل سی آواز نکلنے لگی! پاشا گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور ابھی گھوڑے نے چند قدم ہی اٹھائے ہونگے۔ کہ اس کے چاروں طرف گرد و غبار کے بادل چھا گئے۔ اور ان بادلوں میں تاتاری شہسواروں کے گھوڑے ہنہنانے لگے۔

لڑکے کے خون سے لتھڑے ہوئے ہونٹ ابھی تک تھرتھرا رہے تھے۔ اور ان سے بہت مدھم سی آواز نکل رہی تھی ـــ "اُدفو، اُدفو" ـــ ایک بار اور اس کے منہ سے خون کی دھار نکلی۔ اور وُہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ پاشا کی غم و حسرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں اس کے معصوم چہرے پر گڑ گئیں۔ اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا۔ کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے اسوقت اپنی حالت کا اندازہ ہوا۔ جب اس کے بازو زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے۔ اور بے شمار تاتاری سپاہی اس کے گرد کھڑے فتحمندانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

(۲)

ہر طرف ہیبت ناک تاریکی، ہر جانب برف کی طرح سرد سنگین دیواریں، اور پھر تیز و تند ہوا کے جسم خراش و روح گداز جھونکے! پاشا کو یقین کامل تھا۔ کہ وُہ اس خوفناک قید خانے میں چند دن بھی نہیں رہ سکتا۔ اور حکومت نے اسے اس مقام پر قیدی اس لئے کیا تھا۔ کہ وُہ انتہائی تکلیف کی حالت میں ہلاک ہو جائے۔ اور اس طرح حکومت کی مصلحتوں کو ایک خطرناک باغی سے نجات مل جائے!

یہ قید خانہ خاص طور پر باغیوں کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اور پاشا سے پیشتر کئی باغی یہاں شدت سرما سے سوکھ کر، بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر، اور بے چارگی و بے کسی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ چکے تھے۔ اور اب یہی دردانگیز کیفیت پاشا کے ساتھ بھی پیش آنے والی تھی!

نوجوان قیدی کو ایسا محسوس ہوا۔ کہ موت آہستہ آہستہ، اندھیرے کی تہوں میں رینگتی ہوئی، اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔ وُہ اپنے مہیب انجام کا تصور کر کے کانپ اٹھا۔ اور بے تابانہ آگے بڑھکر اپنے ہاتھوں سے لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کو جنبش دینے کی سعی نامشکور کرنے لگا۔ وُہ کئی گھنٹوں سے اس قید خانے کی ہلاکت پرور فضا میں سانس لے رہا تھا۔ اور ان چند گھنٹوں میں کئی بار

اس کا جوشِ جنوں کمزور ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر اُن بے رحم سلاخوں سے ٹکرا چکا تھا۔ اور اب بھی کچھ دیر اس "جنوں نوازی" میں مصروف
رہنے کے بعد، اپنی کوشش کی ناکامی کا احساس کرکے وُہ ایک طرف ہٹ گیا۔ ہوا کا ایک سرد و تند جھونکا تیر کی طرح سنسناتا ہوا اس
کے چہرے کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔ اس نے اپنی انگلیاں پیشانی پر پھیریں اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ باہر سے "شائیں شائیں" کی آواز آتی
تھی یوں محسوس ہوتی تھی۔ گویا زخمی ناگ تڑپ تڑپ کر پھنکار رہے ہیں۔ پاشا کئی منٹ ٹہلتا رہا۔ پھر سلاخوں پر ہاتھ رکھ کر باہر دیکھنے
لگا۔ چاروں طرف تاریکی کے کثیف بادل منڈلا رہے تھے۔ اور ان تاریکی کے بادلوں میں کبھی کبھی بجلی یک لخت جھلک دکھا کر غائب ہو
جاتی تھی ـــــ یا دور، افق کے آخری گوشے میں، درخت کی کسی شاخ پر چمکتے ہوئے قطرۂ شبنم کی مانند ایک سسکتا ہوا ستارہ
دکھائی دے رہا تھا۔

وُہ وہاں کھڑا رہا ـــ کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اور جب چند لمحے ٹہل کر اس نے دوبارہ باہر دیکھا۔ تو اسے محسوس ہوا۔ کہ تمام فضا
تاریکی میں ڈوب گئی ہے۔ وُہ ننھا سا ستارہ جو اب تک سسک رہا تھا۔ کہیں چھپ گیا تھا۔ ہوا میں زیادہ تیزی و تندی پیدا ہو
گئی تھی۔

قیدی کے ذہن میں موجودہ حالت کا احساس کمزور ہونے لگا۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد، دھوئیں کی چھاتی پر لہراتے ہوئے،
بادلوں کی طرح گزشتہ واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ سب سے پہلے پندرہ سال پیشتر کا زمانہ اس کے سامنے آیا۔ اس
زمانے میں وُہ لڑکا تھا مسرور، خوش، بے پروا اور چنچل لڑکا ـــــ جس کا بیشتر وقت مختلف کھیلوں میں گزرتا تھا۔ اور جو غم کے لفظ
سے بھی ناآشنا تھا۔ اس زریں زمانے کے گوناگوں مناظر اسے یاد آنے لگے۔ اس نے دیکھا، کہ وُہ اپنے چچازاد بھائی "سلیم" اور بنتِ عم
زہرا کے ساتھ اپنی پیاری ماں کے سامنے بیٹھا ہے۔ ماں اپنی پیاری اور شیریں آواز میں ملک کے بہادروں کی کہانیاں سنا رہی ہے۔
انہیں تینوں نہایت شوق کے ساتھ سن رہے ہیں۔ جب ماں کی آواز کسی سپاہی کے بہادرانہ کارنامے بیان کرتے وقت پُرجوش ہو جاتی
ہے۔ تو اس کے دل میں عجیب کیفیت چھا جاتی ہے۔ وُہ چاہتا ہے۔ کہ کاش وُہ بھی بہت جلد جوان ہو کر، بہادر سپاہیوں کی طرح جنگ کے
میدانوں کو اپنی بہادری دکھائے اور لوگوں کی زبان سے اپنی تعریف سُنے۔

اس منظر کے بعد دوسرا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ دریا کے کنارے ریت کا ایک تودہ بنا ہوا ہے۔ اور اُس کے
قریب وُہ سلیم کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ بڑی کشمکش، تگ و دو، اور زور آزمائی کے بعد سلیم تھک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور وُہ خوشی سے اچھلتا
کودتا ہوا ایک چھڑی سی، جس کے سرے پر سرخ کپڑا لہرا رہا ہے۔ ریت کے تودے پر گاڑ دیتا ہے۔ گویا ریت کا تودہ ایک قلعہ

ہے۔ جسے دشمن کے ساتھ جنگ کر کے اُس نے فتح کر لیا ہے۔ اور اب مفتوح قلعے پر اپنی فتح کا نشان گاڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں کبھی کبھی "عذرا" بھی حصہ لیتی ہے اور اکثر اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جب وہ اس کے حقیقی بھائی کو شکست دیتا ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ اور خود اس کی فتح کا نشان قلعے پر گاڑ دیتی ہے، دونوں قہقہے لگاتے ہیں، اچھلتے ہیں، کودتے ہیں، مگر سلیم منہ بسورنے لگتا ہے — آخر "آنکھ مچولیوں" میں صلح ہو جاتی ہے — یہ ان کا روزمرہ کا کھیل ہے۔

اس کے بعد تیسرا منظر آتا ہے۔ وہ "عذرا" کے بازو پر اس کا اور اپنا نام کھود رہا ہے — اور "عذرا" — درد محسوس کرنے کے باوجود مسکرا رہی ہے۔

اس کے بعد چوتھا منظر آتا ہے۔ اب اس کی عمر پندرہ سال ہو چکی ہے۔ وہ شام کی تاریکی میں ساحل دریا پر تنہا کھڑا ہے۔ اور ایک دلآویز گیت اس کے ہونٹوں پر لہرا رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں مصنوعی قلعے پر گڑا ہوا پرچم ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ اسی اثنا میں "عذرا" اس کے پاس آ کھڑی ہوتی ہے۔

"میں اس وقت تمہیں یاد کر رہا تھا عذرا!" وہ کہتا ہے۔

"صرف اسی وقت مجھے یاد کر رہے تھے؟" عذرا پوچھتی ہے۔

"اوہ نہیں — میں تو ہر وقت — ہر گھڑی تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔"

عذرا کی نگاہیں جھک جاتی ہیں — اس کے رخسار سرخ ہو جاتے ہیں۔

"پاشا! تم بڑے بہادر ہو۔ آج بھی تم نے قلعہ فتح کر لیا۔" وہ ریت کے تودے پر نگاہیں جمائے کہتی ہے۔

"مگر حقیقت یہ ہے میری عذرا! میری فتح تمہاری رہین منت ہے۔ اگر تم میری مدد نہ کرو، تو میں کبھی بھی سلیم کو شکست نہ دے سکوں!"

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرتی پاشا! بھلا پاس کھڑے ہو کر چیخنا چلانا بھی کوئی مدد ہے؟"

"میرے لئے — میری عذرا! یہ بہت بڑی مدد ہے، تم کیا جانو!"

"لیکن تم واقعی بہت بہادر ہو۔ سلیم سے بہادر، تمام سپاہیوں سے بہادر — تمام لوگوں سے بہادر —" وہ مسکرا کر کہتی ہے۔

دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔

"عذرا! کیا تم تمام عمر اسی طرح میری ہمدرد رہو گی ——؟"

عذرا اس کے جواب میں خاموش رہتی ہے۔ مگر اس کی جھکی ہوئی نگاہیں کہہ رہی ہیں "میں تمہاری ہوں —— ہر گھڑی تمہاری رہی ہوں —— تادم واپسیں تمہاری رہوں گی —!"

چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے۔ عذرا پاس پڑے ہوئے سیلم کے پرچم کو تو دے پر گاڑ دیتی ہے۔ اور پاشا کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے۔ "آؤ ہم عہد کریں۔ کہ تادم واپسیں ایک دوسرے کے رہیں گے"! دونوں "پرچموں" پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں، دو تین لمحے ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں پھر عذرا کی نظریں جھک جاتی ہیں۔

"عذرا!" وہ کہتا ہے۔

"پاشا! یہ پرچم میری قسم کی نشانی ہے۔ اور میں اس پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتی ہوں۔ کہ تمام عمر تمہاری رہونگی۔ ہر حال میں تمہاری شریک رہونگی۔ یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو جاؤں!"

وہ بھی اپنے پرچم پر ہاتھ رکھ کر یہی الفاظ دہراتا ہے۔

دونوں کی نگاہیں پرچموں پر جمی رہتی ہیں —— یہاں تک کہ دونوں کی روحیں، دونوں کے دل ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

یہ منظر دیر تک قیدی کی نگاہوں تلے پھرتا رہتا ہے!

(۳)

بارش کے چند موٹے موٹے قطرے قیدی کے چہرے پر گرے۔ مگر وہ اپنے خیالات کے ہجوم میں اس درجہ غرق تھا۔ کہ اُسے بارش کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ گذشتہ واقعات کی گوناگوں تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھیں۔ اور اب جو منظر اُس کی نگاہوں تلے پھر رہا تھا۔ وہ انتہائی دردناک تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ دشمنوں نے وطن پر حملہ کر دیا ہے۔ اس کا باپ اور چچا، دونوں وطن پرست، وطن کی آزادی کے راستے میں اپنی عزیز ترین چیز قربان کر چکے ہیں۔ خونخوار دشمنان وطن "اہلِ سمارٹ" پر ایسے ایسے مظالم توڑ رہے ہیں۔ جن کا تصور بھی ذہن انسانی نہیں کر سکتا۔ مکانوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو لونڈیاں بنایا جا رہا ہے۔ بوڑھوں اور بچوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ تیغ کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں وہ سنتا ہے۔ کہ اس کے عمِ شہید کے گھر کو نذرِ آتش کر دیا گیا ہے۔ اس ظالم خبر کو سن کر وہ تڑپ جاتا ہے۔ اور جب وہ خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ وہاں

پہنچتا ہے۔ تو اس کی حسرت انگیز نگاہیں دیکھتی ہیں۔ کہ وہ دیواریں جو چند گھنٹے پیشتر چند انسانی زندگیوں اور چند انسانی زندگیوں کا حقیر سا اثاثہ لئے کھڑی تھیں۔ اب خاکستر کے تودوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ وہ فرطِ غم سے دیوانہ ہو جاتا ہے ——— آہ! اس کی آرزوؤں کی روشنی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت اس کی محبوبہ دلنواز عذرا، جلے ہوئے مکان کی خاکستر میں دفن ہو چکی تھی۔

پاشا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے نکل کر، اس کے غم آلود رخساروں پر ڈھلکنے لگے ——— اب اس کے ذہن کی وسعتوں میں ایک اور واقعے کے نقوش ابھر رہے تھے۔ جنگِ آزادی پورے زوروں پر ہے۔ بہادرانِ وطن آزادیٔ وطن کے لئے جانیں قربان کر رہے ہیں ———!

اس کے بعد ایک اور منظر آتا ہے۔ اہلِ سمارت میں سے بیشتر تعداد ان لوگوں کی ہے۔ جو اپنی موجودہ غلامانہ زندگی کو تقدیر کا نہ ٹلنے والا حکم، اور فاتحین فرعون مسلک کے قہر و غضب کو مشیتِ ایزدی سمجھ کر، اپنی تمام جد و جہد، تمام سعی و کوشش سے ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔ اور وقت کے خوفناک پنجے کی آہنیں گرفت مفتوح ملک کے جذبۂ آزادی کو کچلتی جا رہی ہے۔ اگرچہ اہلِ سمارت کی کمرِ ہمت ٹوٹ چکی ہے، مگر ابھی وطن پرستوں کی ایک حقیر سی جماعت جو پاشا، ہیتم اور چند دیگر جانباز اشخاص پر مشتمل ہے، برابر دشمنوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس جماعت کا راہبر جاوید وطن کا ایک آزمودہ کار سپاہی ہے۔ جس کی عمر کا بیشتر حصہ جنگ و جدل میں گزر چکا ہے۔

بارش اور ہوا کے تند جھونکے مل کر کچھ ایسا شور پیدا کر رہے ہیں۔ کہ محسوس ہوتا ہے۔ پانی کا سیلاب پہاڑوں سے ٹکرا رہا ہے۔

پاشا کے کان میں وطن پرست جماعت کے قائد جاوید کے الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔

"آزادی کی جنگ، ہنگامہ پرستی نہیں۔ تم صرف چند حقیر سے ہنگامے پیدا کر کے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکرانا چاہتے ہو۔ مگر یاد رکھو۔ اس طرح تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور طاقت کا یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے گا ——— ہمارا وطن غلام ہے۔ دشمنوں نے سمارت کے چپے چپے کے علاوہ اہلِ سمارت کے دلوں پر بھی قبضہ کیا ہوا ہے۔ اور جب تک اہلِ سمارت کے دلوں سے غلامی کا بوجھ نہیں اٹھے گا۔ وطن غلام ہی رہے گا۔ سب سے پہلے اپنے ہموطنوں کے دلوں سے یہ خیال دور کرو۔ کہ تم غلامی کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ اور تمہاری کوششوں سے دشمنوں پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوگا۔ انہیں بتاؤ کہ سمارت تمہارا وطن ہے۔ اس کا ہر حصہ، ہر گوشہ، ہر کونہ تمہارا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی کوئی قوم تمہیں غلام نہیں بنا سکتی۔ آزادی تمہارا پیدائشی حق ہے۔ اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لو۔ کہ وطن کو غیروں کے پنجے سے آزاد کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد، تمہاری انسانیت کا حقیقی تقاضا اور تمہارے پیدا کرنے والے کا اہم ترین حکم ہے۔ تم سمارت کے ہو، اور سمارت تمہارا ہے۔ اور ہمیشہ تمہارا ہی رہنا چاہیئے۔ اپنے دل میں آزادی کا آہنیں اور شعلہ ریز جذبہ

پیدا کرو۔ جب اس جذبے کی آگ تمہارے اندر بھڑک اُٹھے گی۔ اس وقت تاتاری توتوں کا پہاڑ برف کے تودے کی طرح پگھل کر بہ جائے گا۔

"میرے ہموطنوں نے مجبور رکھا ہے۔ کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ان میں وطن کو آزاد کرانے کی طاقت نہیں ـــــــ وہ دشمنان وطن کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ـــــــ آہ یہی ذلیل، قابلِ نفرت، توہین انگیز اور انسانیت سوز خیال میرے ہموطنوں کو غیروں کا غلام بنائے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے۔ کہ تمہاری جنگِ آزادی بچوں کا ایک کھیل بن کر رہ گئی ہے۔

جب سینوں کے اندر دل دشمنوں کے خوف سے کانپ رہے ہوں۔ اسوقت دو دھاری تلوار بھی ہاتھوں میں ایک حقیر تنکے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مگر جب دلوں میں آتشِ یقین کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ اس وقت بازوؤں کی ایک معمولی سی جنبش بھی غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔

آج تم صرف چند منتشر لہریں ہو۔ مگر جس وقت تمہاری رگ و ریشہ میں خود اعتمادی کا جذبہ موجزن ہو گیا۔ اس وقت تم پانی کا وہ تند سیلاب بن جاؤ گے۔ جو مضبوط سے مضبوط چٹان کو بھی خس و خاشاک کی طرح اپنے بہاؤ میں بہائے جاتا ہے۔

محمود! نہ بنو۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے ـــــــ خود اعتمادی اور یقین پیدا کر کے تاتاریوں سے جا ٹکراؤ ـــــــ ناممکن ہے۔ کہ کل طلوع ہونے والا سورج تمہارے ملک کو آزاد نہ دیکھے ـــــــ!"

نوجوان قیدی کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اسکی بڑی بڑی آنکھیں شعلہ ریز ہو گئیں۔ اور رخسار شعلے کی طرح دہکنے لگے۔

اب ایک اور منظر سے نقاب اُٹھتا ہے۔ آزادی کی جنگ جاری ہے سلیم کے ساتھ اور بھی متعدد جانباز سپاہی شہید ہو چکے ہیں۔ وہ جنگِ آزادی کا ہیرو بن گیا ہے۔ سمارت کی حکومت اُسے مغلوب کرنے کی انتہائی کوشش کر چکی ہے۔ مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا ہے ـــــــ جاوید گرفتار ہو جاتا ہے۔ گرفتار ہونے سے پیشتر وہ اپنے ننھے بچے کو پاشا کی گود میں دے کر کہتا ہے۔

میرے بہادر پاشا! میں جا رہا ہوں۔ مگر میری آنکھیں ہر وقت تم پر لگی رہیں گی ـــــــ مجھے یقین ہے۔ تم وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرا دو گے ـــــــ وہ وقت بہت جلد آ رہا ہے۔ جب تم سمارت کے قلعے پر سمارت کا پرچم گاڑ دو گے! ـــــــ اس کوشش میں یہ میرا لختِ جگر تمہاری کوئی نہ کوئی مدد ضرور کرے گا ـــــــ!"

یہ کہکر وطن کا قائدِ اعظم اپنے ننھے بچے کی پیشانی کو چومتا ہے۔ اسکی آنکھیں قدرے پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ننھے بچے کے ننھے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر کہتا ہے: "میرے بچے! میرے محمود! اپنے چچا کی مدد کرنا ـــــــ یہ میرا حکم ہے!"

اس منظر کے بعد یہ منظر آتا ہے۔

اس کی شہرت سیلاب کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ حکومت سمارت کا وہ سب سے بڑا باغی ہے۔ اور اس کی گرفتاری کے لیے حکومت سمارت نے بڑے بڑے گراں بہا انعامات مقرر کر رکھے ہیں ـــــ ایک طرف ملک کے چپے چپے میں، جاسوس اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور دوسری جانب اس کا ننھا جاسوس محمود رحمت کا فرشتہ ثابت ہو چکا ہے۔ جو ہر مصیبت میں اس کی مدد کرتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ کہ وہ موت کے منہ میں جاتا ہے۔ اچانک محمود کی آواز گونجتی ہے۔ "او فو ـــــ او فو" اس آواز کے سنتے ہی اس کو خطرے کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی جان بچا لیتا ہے۔ وہ موجودہ خطرے کا اندازہ کر کے اپنے حلیفوں کے ذریعے اپنی موت کی خبر مشہور کر دیتا ہے۔ حکومت مطمئن ہو جاتی ہے اور وہ اپنی کوششوں میں مصروف ہے ـــــ یہاں تک کہ اس کی زندگی و موجودگی کی خبر حکومت تک پہنچ جاتی ہے۔ جاں نثار لڑکا اپنا آخری فرض بھی ادا کر دیتا ہے۔

باہر بادل وحشیوں کی طرح گرج رہا تھا ـــــ بارش کا پانی سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا اندر آ رہا تھا ـــــ کئی گھنٹوں بعد سلاخوں سے مس کرتی ہوئی چٹان پر مدھم سی، ہلکی سی روشنی تھرتھرانے لگی۔ نوجوان قیدی نے سلاخوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اور باہر دیکھنے لگا۔ تاحدِ نظر ہر چیز پُراسرار کہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور اس پُراسرار کہر میں کہیں کہیں سورج کی اولیں شعاعیں پہاڑ کے سینے پر چمکتی ہوئی پانی کی باریک لکیروں کی طرح لرز رہی تھیں۔ دور افق کے دامن میں، کانپتا ہوا ننھا سا ستارہ یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا راکھ کے تودے پر، ایک چنگاری ہوا کے جھونکوں سے بجھ رہی ہے۔ قیدی چند لمحے غائب ہوتے ہوئے ستارے کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہ فضا میں تیزی سے اڑتے ہوئے ایک پرندے پر پڑی۔ اس کی گرفت خود بخود مضبوط ہونے لگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ سلاخوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ مگر جیسے ہی اپنی موجودہ حالت کا اندازہ شعلے کی طرح اس کے ذہن میں تڑپا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ عالم مایوسی میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

وہ پہلے بھی تین مرتبہ گرفتار ہو کر قید خانے کی تکالیف برداشت کر چکا تھا۔ مگر اس سے پیشتر کبھی بھی اس کے دل میں بے چینی پیدا نہیں ہوئی تھی ـــــ کبھی بھی وہ مایوسی سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ مگر یہاں، پہلی مرتبہ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور زندہ رہے گا ـــــ اور اس کے بعد اس ظالم، خوفناک قید خانے میں اس کی بجائے اس کی لاش ہو گی۔

وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگا۔ اور کل کے واقعات اس کے ذہن میں پھرنے لگے "میرا یہی انجام ہونا تھا ـــــ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مرنا میرے مقدر میں تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ "وطن ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ـــــ وطن کے قلعے پر دشمنوں کا پرچم لہرا رہا ہے۔ سمارت کا ہر باشندہ غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس حالت میں دنیا سے رخصت ہو جانا کس قدر شرمناک

باہر ہے۔ کاش مجھے فرض ادا کرنے کا موقعہ مل جائے۔ پھر میں ہر سنگین سے سنگین سزا کے لئے تیار ہوں:

اس کے قدموں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ دل زیادہ بیتاب ہو گیا۔

"اگر محمود کو گرتے دیکھ کر میں واپس نہ آتا۔ تو تاتاری بھیڑیئے مجھے گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے غلطی کی اور میری غلطی ہی میری گرفتاری کا سبب بنی ——— مگر وہ جاں نثار اور خون میں شرابور بچہ ——— ؟

پاشا کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "اس ننھے محسن نے ہر مصیبت میں میری مدد کی۔ کئی بار مجھے موت کے پنجے سے بچایا پھر کیا میں نے اس حالت میں دشمنوں کے رحم پر چھوڑ سکتا تھا"؟

یکایک محمود کا ننھا سا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ ایک مدھم سی، مضمحل سی، کمزور سی آواز "اوفو۔ اوفو" کہتی ہوئی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ نوجوان قیدی کو محمود کے شہید وطن باپ کے الفاظ یاد آ گئے "میں جا رہا ہوں پاشا! مگر میری نگاہیں بیقرار رہینگی۔ کہ کب تک تم سمارت کے قلعے سے دشمنوں کا پرچم اتار کر اپنے وطن کا پرچم گاڑتے ہو۔ اس کوشش میں میرا یہ ننھا بچہ تمہاری کچھ نہ کچھ مدد ضرور کریگا ——— !

پاشا کی آنکھوں سے دو قطرے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے ——— تمام دن طرح طرح کے تصورات قیدی کے ذہن کو محیط رہے۔ اور جب شام ہوئی۔ تو وہ آہنیں دیوار سے لگ کر لیٹ گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ یکایک اس نے دیکھا۔ کہ سلاخوں کے باہر روشنی کا ایک حلقہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے اس منظر کو تصور کی فریب کاری سمجھا۔ اور بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اب روشنی سلاخوں میں سے داخل ہو کر قیدخانے کے ایک حصے کو منور کرنے لگی۔ پاشا اٹھا۔ اور سلاخوں کی طرف چلنے لگا۔ سلاخوں کے پاس پہنچتے ہی اس نے دیکھا۔ کہ روشنی ایک دم غائب ہو گئی ہے۔ وہ پیچھے ہٹنے ہی والا تھا۔ کہ اس کا ہاتھ سلاخوں میں سے نکلتی ہوئی کسی چیز سے ٹکرایا ——— چند لمحوں میں غیر شعوری طور پر سب کچھ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ اس کا ہاتھ ایک بوجھل سی چیز اٹھائے ہوئے ہے ——— اس نے سلاخوں کے باہر دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں ایک سایہ نظر آیا ——— مگر یہ سایہ جلد ہی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

قیدخانے کے ایک نہایت مختصر سے حصے میں چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بوجھل سی چیز کو وہاں لے گیا۔ اور اس چیز کو دیکھا۔ رومال میں نہ معلوم کیا لپٹا ہوا تھا ——— اس نے رومال کو کھولا ——— اور یہ دیکھکر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ اب اس کے سامنے وہی چیز پڑی تھی۔ جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکتا تھا۔ یعنی کھانا اور پانی ——— !

اس کے دل و دماغ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"میں یقیناً اپنا فرض ادا کروں گا ——— میں ہی دشمن کے قلعے پر دشمن کا پرچم گاڑوں گا ———" یہ الفاظ اس نے خاص جوش سے کہے اور کھانا کھانے لگا۔

(۵)

پاشا کے دل میں یقین پیدا ہو گیا تھا۔ کہ کوئی محبِ وطن، اپنی جان پر کھیل کر، اُسے موت کے منہ سے بچا رہا ہے۔ مگر وہ حیران تھا۔ کہ آخر اس کا محسن اُسے اپنا نام تک کیوں نہیں بتاتا؟ کون سے ایسے حالات درپیش ہیں۔ جن کی بنا پر وہ اپنی شکل وصورت اس سے پوشیدہ رکھنے پر مجبور ہے؟ اب تک کئی راتیں گزر چکی تھیں۔ اور اس دوران، ہر رات وہ اجنبی، اسی پُراسرار طریقے پر اسے کھانا پہنچا رہا تھا۔

آج رات کو پاشا نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اپنے غیبی محسن سے باتیں کرے گا۔ اور اسی ارادے کو لئے ہوئے وہ اس وقت سلاخوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ فضا میں تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔

پاشا آنے والے واقعات کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ معلوم آج کیا بات تھی۔ کہ اجنبی آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ رات نصف سے زیادہ مسافت طے کر چکی تھی۔ اور قیدی کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا وہ ایک عرصے سے اجنبی کا انتظار کر رہا ہے۔ آخر چٹان پر مدھم سی روشنی لرزنے لگی۔ حسبِ معمول سلاخوں میں سے ایک ہاتھ اندر آیا۔ پاشا نے ایک فوری جذبے کے ماتحت ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ یکایک فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی ——— ایک ہلکی سی نسوانی چیخ۔ پاشا کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی ——— اور اس کے پاؤں میں ایک بھاری سی چیز دھم سے گری۔ اس سے پیشتر کہ پاشا اپنے محسن کے ہاتھ کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش کرے یا کچھ کہے۔ فضا میں بجلی چمکی۔ اور اس چمک کے دامن میں، لمحہ بھر کے لئے ایک نسوانی چہرہ لہرایا اور پھر یہ منظر غائب ہو گیا۔

پاشا، حیرت و استعجاب میں غرق، سلاخوں کے پاس کھڑا رہا۔ اس کے ذہن سے یہ امر بھی محو ہو گیا کہ اس کے پاؤں پر کیا چیز پڑی ہوئی ہے۔ "ایک عورت ——— میرے لئے اتنی قربانی کر رہی ہے!" اس نے دل میں کہا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر اس نے کھانا کھایا۔ اور دیوار سے لگ کر لیٹ گیا۔

دوسرے دن جب شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔ تو قیدی کو ایسا محسوس ہوا۔ گویا اس کے سینے میں خلش سی پیدا ہو گئی ہے ——— ایک لذیذ وشیریں خلش۔ اور وہ آغازِ شب ہی سے اجنبی عورت کے انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔

رات دبے پاؤں اپنے تاریک راستے پر گزر رہی تھی۔ اور قیدی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا!

حسبِ معمول چٹان پر روشنی تھرتھرائی ——— اور اس کے چند لمحوں بعد ایک نازک ہاتھ قیدی کے ہاتھ میں تھا۔

"تم کون ہو؟" پاشا نے پوچھا۔

"شہزادی کی خادمہ ———؟" جواب میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"شہزادی کون؟"

"سمارت کی شہزادی! ——— انہی کے حکم سے میں یہ فرض ادا کر رہی ہوں!"

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔

"اب مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا!"

فرطِ حیرت میں پاشا کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا۔ کہ شہزادی کی خادمہ کب وہاں سے رخصت ہوئی۔ اور جاتی دفعہ اس نے کیا کہا ؟ ——— ہزادی کو مجھ سے ہمدردی ——— آخر یہ راز کیا ہے ؟ ——— اس معاملے کی تہ میں کون سا جذبہ کام کر رہا ہے ؟" قیدی سوچنے لگا۔ قیہ رات اسی سوچ میں گزر گئی۔ جیسے جیسے وہ اس مسئلے پر غور کرتا جاتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال کہ اس طریق سے مجھے غدار وطن انے کی سعی کی جا رہی ہے۔ زیادہ قوت : یادہ اہمیت حاصل کرتا جاتا تھا۔

دن کی روشنی میں سب سے پہلے اس کی نظر رومال پر پڑی۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھانا وغیرہ پرے پھینک دیا۔ تمام دن اسی یشانی میں گزر گیا۔ رات آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی رات کو آنے والی ہستی کا خیال اس کے ذہن میں لہرایا۔ مگر اب وہ اپنے دشمن کا احسان ٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر بیٹھا رہا۔ اسی طرح رات بیت گئی۔ اسی طرح دوسری رات بھی بیت گئی۔ تیسری رات کو بھی س کا خیال تھا۔ کہ شہزادی کی خادمہ کھانا سلاخوں سے اندر پھینک دے گی۔ مگر اس کے خلاف اس نے دیکھا۔ کہ کمرے کی تاریک فضا س روشنی پھیل رہی ہے ——— یکایک اس کی نظر روشنی کے علاوہ ایک نسوانی چہرے پر بھی پڑی۔ اس نے سمجھا۔ کہ شاید وہ خواب یکھ رہا ہے۔ مگر دوسرے لمحے میں اس کے کان میں آواز آئی :-

"قیدی!"

قیدی نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی عورت کو دیکھا۔ جو ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی!

"قیدی!" دوبارہ آواز گونجی

"تم کون ہو؟" پاشا نے پوچھا۔

"میری خادمہ نے تمہیں میرے متعلق شاید کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے"! عورت نے مسکرا کر کہا۔

"شہزادی! —— تم شہزادی ہو؟"

"ہاں بہادر قیدی"! شہزادی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے دشمن کی شہزادی کو میرے ساتھ کیا کام"؟ قیدی نے کرخت آواز میں کہا۔

"بہادر قیدی تمہارا اندیشہ غلط ہے۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ میں تمہاری دشمن حکومت کی شہزادی ہوں۔ اس نے تمہیں غداری کی راہ پر لے جا رہی ہوں —— یہ تمہارا وہم ہے۔ میں تمہاری بہادری کی دل سے مداح ہوں بہادر قیدی!"

"مگر تمہارے سلوک کا مقصد؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

شہزادی نے عجیب انداز سے پاشا کی طرف دیکھا۔ کئی لمحے اس کی نگاہیں قیدی کے چہرے پر جمی رہیں۔ پھر ایک آہ کے ساتھ اس کے لبوں سے نکلا:۔

"بہادر قیدی! کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ تمہارے دشمنوں میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں۔ جو تمہاری بہادری و جرأت سے متاثر ہو سکے؟؟"

ایک منٹ کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

"یہ تمہارا کھانا —— پاشا!"

قیدی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔

یقین رکھو! میں تمہیں تمہارے موجودہ راستے سے ہرگز ہٹانے کی کوشش نہیں کروں گی —— تم اپنا فرض ادا کرتے رہو۔ میں اس لئے تمہاری مداح ہوں۔ کہ تم ایک دلیر انسان ہو۔ حکومت کی کوئی سزا تمہیں آج تک اپنے فرض سے نہیں ہٹا سکی؛

—— یہ کہکر شہزادی نے کھانا پاشا کے سامنے رکھدیا —— پاؤں کی چاپ کے ساتھ قید خانے کی زمین اور سنگین دیوار پر روشنی لرزنے لگی —— !

——(۶)——

شہزادی کے جانے کے بعد پاشا گونا گوں تفکرات میں غرق ہو گیا۔ وہ حیران تھا۔ کہ آخر شہزادی کو اس سے اس درجہ ہمدردی کیوں ہے؟ وہ کیوں اسکی جان بچانا چاہتی ہے۔ کیا وہ اس سے اس ہمدردی کی قیمت وصول کرے گی؟؟ اور یہ قیمت کیا ہوگی؟؟

خیالات کی رَو یہاں پہنچ کر خود بخود رُک گئی۔ اور ایک لفظ بادِ صرصر کے آتشیں جھونکے کی طرح اس کے ذہن کے پردے سے ٹکرایا۔

"غداری" اس نے زیرِ لب کہا۔ اور اس کی مٹھیاں خود بخود بھینچ گئیں۔ اس نے کھانے کو ایک حقارت انگیز ٹھوکر سے ٹھکرا دیا۔ رکابی اور برتن ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ معاً اُسے شہزادی کے الفاظ یاد آ گئے۔ "میں تمہیں ہرگز اس راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کروں گی!"

پاشا کے ذہن میں نئی خلش پیدا ہو گئی۔ اور بقیہ رات اسی خلش میں گزر گئی۔ صبح جب مدھم سی روشنی اس کے قید خانے کے ایک گوشے میں کانپنے لگی۔ پاشا سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ابھی اسے کھڑے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے قریب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شہزادی اسے متبسم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"پاشا!"

پاشا خاموش کھڑا تند نظروں سے شہزادی کو دیکھتا رہا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا پاشا!"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں!" قیدی نے بے پروائی سے کہا۔

"اگر ہر زندہ انسان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو پھر اس کی ضرورت سے کیونکر انکار کر سکتے ہو؟"

"مجھے غداری سکھانے والے کھانے سے نفرت ہے —— اس قسم کے کھانے کا ایک نوالہ بھی میرے لئے زہر سے بڑھ کر ہے!"

شہزادی کی آنکھوں سے حسرت برسنے لگی۔ اور وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔ "بہادر پاشا! میں —— تمہاری دشمن حکومت —— کی شہزادی ہوں۔ مگر —— اس سے یہ کب لازم آتا ہے۔ کہ میں تمہاری جرات و بہادری کا بھی اعتراف نہ کروں؟؟ دنیا کا کوئی انصاف پسند شخص تمہاری دلیری سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور میں تو ——" شہزادی کہتے کہتے رک گئی۔ اور دائیں ہاتھ کی انگلی سے مٹی کی ایک ہلکی سی تہ کو جو نصف دائرے کی صورت میں دیوار کے ایک اُبھرے ہوئے بھورے رنگ کے پتھر پر جمی ہوئی تھی۔ کھرچنے لگی۔

"تمہارا مطلب کیا ہے۔ تم اس ہمدردی کی کیا قیمت وصول کرنا چاہتی ہو؟" پاشا نے کرخت لہجے میں کہا۔

"میں کوئی قیمت نہیں چاہتی —— میں صرف تمہیں —— میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم زندہ رہو!"

"اور زندہ رہ کر تمہاری ظالم سلطنت کے پرخچے اڑاؤں!" پاشا نے جلدی سے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ کہ تم زندہ رہ کر یہ کرو یا وہ کرو۔ میں صرف تمہیں ——— ہر حالت میں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں پاشا: اب تو یہ کھانا کھا لو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ بہت بڑا احسان!" یہ کہتے ہوئے شہزادی نے ایک منقش رومال میں لپٹے ہوئے برتن کو قیدی کے سامنے رکھ دیا۔

"تم پر احسان؟" پاشا نے متحیرانہ پوچھا۔

"ہاں مجھ پر احسان کیونکہ ——— یہ میری تمنا ہے۔ میری آرزو ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ کہ کبھی بھی تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی؟"

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور یہ منظر کئی لمحے قائم رہا۔

"میرے بہادر پاشا! تمہارا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے ——— اور دیکھو میں پھر رات کو آؤں گی ——— میرے منتظر رہو گے نا؟" شہزادی نے قدرے مسکرا کر کہا۔

کچھ دیر کے بعد جب قیدی نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ تو شہزادی کی بجائے ایک اور نسوانی چہرہ دیکھا۔

"شہزادی صاحبہ نے مجھے یہ دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔ کہ آپ نے کھانا کھا لیا ہے یا نہیں؟" اس عورت نے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر میری آواز ضرور سنی ہے۔ میں شہزادی صاحبہ کی خادمہ ہوں!"

پاشا کے ذہن میں شہزادی کے الفاظ گونجے۔ "تمہارا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے۔" اس نے خادمہ کو دیکھا۔ اور پھر وہاں سے نظریں ہٹا کر قریب ہی پڑے ہوئے کھانے کو دیکھنے لگا۔

"کیا میں شہزادی صاحبہ سے کہوں۔ کہ آپ کھانا کھا رہے ہیں؟" شہزادی کی خادمہ نے اشتیاق انگیز لہجے میں کہا۔

پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ خادمہ کی آنکھوں سے مسرت جھلکنے لگی۔ اور وہ تیزی کے ساتھ چلی گئی۔

(۷)

مسلسل ایک ماہ سے شہزادی ہر رات کو پاشا کے ظلمت کدے میں آ رہی تھی۔ اس دوران میں تاتاری حسینہ نے اپنے تمام خوفناک نسوانی حربوں کو کام میں لا کر قیدی کے دل پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئی۔ پاشا کے دل و دماغ کی دنیا میں ایک نیا تغیر ایک نیا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ اور وہ چنگاری جس نے کچھ عرصہ پیشتر قیدی کے سینے کی گہرائیوں

بن آنکھ کھولی تھی، اب آہستہ آہستہ، غیر محسوس طور پر آتشیں شعلے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وطن پرستی کا وہ طوفانی جذبہ جو اُس کی زندگی کا واحد نصب العین اور اس کے دل کی عزیز ترین متاع تھی اب اپنے تمام جوش و خروش سے محروم ہو چکا تھا۔ اور اس کی بجائے تاتاری ساحرہ کی محبت اس کے دل و دماغ کی وسعتوں پر چھا رہی تھی۔

قیدی تمام دن بے قراری کے عالم میں گزرتا۔ اور جب دن کے اختتام پر اس کی محبوبہ اس کے ظلمت کدے میں جلوہ نما ہوتی۔ وہ خود کو ایک نئی دنیا میں پاتا۔ اور جب تک شہزادی اس کے پہلو میں بیٹھی رہتی۔ وہ اسی عالم رنگ و بو میں رہتا۔

آج بھی پاشا انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گن کر، اب شام کے وقت اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ شہزادی آئی۔ اور جب قیدی اس کے ریشمیں زانو پر سر رکھ کر، اس کی لانبی لانبی سیاہ اور عطر فشاں زلفوں سے کھیلنے لگا۔ تو تاتاری حسینہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، دلربایانہ انداز میں کہا۔

"پاشا! ہم دونوں قیدی ہیں —— ہم دونوں کو یہ پتھر کی دیواریں اور لوہے کی سلاخیں محبت کی مسرتوں سے محروم کئے ہوئے ہیں!"

"وہ کیونکر میری محبوبہ؟"

"تم نہیں جانتے —— تم نہیں دیکھتے۔ کہ دن رات کے اتنے لمبے عرصے میں، نہایت مختصر سی مدت کے لئے ہم اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور ملاقات کی یہ گھڑیاں بھی کتنی جلد گزر جاتی ہیں۔ اس وسیع دنیا میں ہمارے لئے صرف یہی ذلیل، تنگ و تاریک جگہ رہ گئی ہے؟"

"لیکن شہزادی! تم تو قید میں نہیں ہو —— تم تو شہزادی ہو ——!"

"نہیں تم سے بڑھ کر مصیبت میں ہوں —— میرے پاشا! دنیا بہت وسیع ہے۔ آؤ ہم اس وسیع دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں چلے جائیں۔ وہاں ہم ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، ایک دوسرے کے قریب رہ کر مسرت انگیز زندگی بسر کریں گے۔ وہاں میں شہزادی نہیں ہوں گی بلکہ تمہاری ایک ادنےٰ خادمہ —— اور تم وہاں کسی کی نگاہ میں باغی نہیں ہو گے —— بلکہ میرے محب —— میرے محبوب!"

یک لخت قیدی کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے اپنا سر شہزادی کے زانو سے ہٹا لیا۔ اور بیٹھ کر قید خانے کی داہنی طرف کی دیوار دیکھنے لگا۔ پتھروں کی دیوار پر ہزاروں مایوس، اشک ریز جلتی آنکھیں، ہزاروں خون میں شرابور، زخموں سے بھرے ہوئے بدن اور

پھر بجلی کی طرح لہراتے ہوئے بید۔۔۔۔ الغرض سمارت کے جہنم کا ہر گوشہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس کے دل میں جذبات کا طوفان بپا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ شہزادی نے مسکرا کر، اپنی باہیں اس کی گردن کے گرد حمائل کر دیں۔ اور وُہ تمام رات قیدی کے پہلو میں بسر کر دی۔ صبح جب سورج کی شعاعیں سلاخوں پر تھر تھرا رہی تھیں۔ قیدی آنے والی رات کو سمارت سے نکل کر جانے پر رضامند ہو چکا تھا۔

وُہ دن پاشانے بڑی بے قراری سے کاٹا۔ اور جب رات آئی۔ تو اس کی خلش اور بڑھ گئی۔ شہزادی آئی۔ اور ابھی اُسے آئے ہوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ کہ اس نے ایک بڑی سی کنجی پاشا کے ہاتھ پر رکھدی۔ پاشانے سلاخوں کے بھاری تالے میں کنجی ڈال دی۔ اور چند گردشوں کے بعد تالا کھل گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ اور اب وُہ دونوں ایک چٹان پر کھڑے تھے۔ چند منٹ کے بعد شہزادی کی خادمہ کشتی لے کر آ گئی۔ پاشا کے دل میں چبھن سی پیدا ہوئی۔ مگر جیسے ہی شہزادی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وُہ کشتی میں بیٹھ گیا۔۔۔۔ اور تھوڑی دیر کے بعد تینوں بہت دور جا چکے تھے!

(۸)

صبح کے نمودار ہوتے ہی ان کی کشتی دوسرے کنارے پر جا لگی۔ تینوں کشتی سے اُتر کر ساحل پر چلنے لگے۔ مشرقی آسمان کی وسعتوں میں، شفق کا سینہ چھید کر، طلوع ہوتے ہوئے سورج کی اولیں شعاعیں دریا کی سطح پر آبدار موتیوں کی طرح مچل رہی تھیں۔ نسیم سحر گاہی کے نکہت بدوش جھونکے، فضا میں ایک نشہ سا، ایک سرور سا برسا رہے تھے۔ خوشنوا پرندے آزادانہ سرودانہ چہچہاتے، شبنم آلود دھندلکوں کو چیرتے، شاخوں کو چومتے اُڑتے پھر رہے تھے۔ پاشا کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کہ دنیا اس کے تصوّر سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف رنگینیاں، مستیاں بکھرتی پھیلتی جا رہی ہیں۔ اور وہ ایک طویل مدت کے بعد کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد تازہ ہوا کے حیات آفریں جھونکے اس کے جسم سے مس کر رہے ہیں۔ اُس نے پلٹ کر کہر اور دھوئیں کی چادروں میں لپٹے ہوئے سمارت کی طرف نظر اٹھائی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بے شمار دھبے ناچنے لگے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اور اپنی محبوبہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تیزی سے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے تیز رفتار گھوڑے خریدے۔ اور ان پر سوار ہو کر کسی نامعلوم منزل کو روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت وُہ سمارت سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ایک وسیع و شاندار عمارت (جسے لوگ قصرِ سرخ کے نام سے موسوم کرتے تھے) میں موجود تھے۔ اس عمارت کے ارد گرد بہت کم آبادی تھی۔ صرف غریبوں کے چند ٹوٹے پھوٹے مکانات

کھڑے تھے۔ البتہ دو تین میل کے فاصلے پر شہر آباد تھا۔

گزشتہ واقعات یا تو پاشا کے دل سے محو ہو چکے تھے۔ یا محو ہوتے جا رہے تھے۔ اور وہ ہر لمحہ، ہر گھڑی نئی مسرتوں، نئی رنگینیوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ شہزادی بھی اپنی شاہانہ زندگی کو فراموش کر چکی تھی۔ اور وہ اپنے محبِ صادق کے پہلو میں انتہائی مسرور، انتہائی خوش تھی۔ مگر ان دونوں کے برعکس مرجانہ کچھ اُداس اُداس سی، کچھ چپ چپ سی نظر آتی تھی۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ محبت کے ان دیوانوں کے ساتھ اس نے بھی اپنے گھر کی راحت و مسرت کو چھوڑا تھا۔ اس لئے اسے لازماً مغموم ہونا چاہیئے تھا اور وہ مغموم تھی۔ شہزادی اور پاشا نے کئی بار اُسے واپس جانے کے لئے کہا۔ مگر اس نے ہر بار یہ کہکر انکار کر دیا۔ کہ میں اس حالت میں اپنی مخدومہ کو یہاں نہیں چھوڑ سکتی!

محل میں وہ صرف ایک خادمہ تھی۔ اگرچہ دوسری خادماؤں سے بہت ممتاز۔ مگر یہاں وہ شہزادی کے لئے خادمہ بھی تھی۔ اور اس کی ہمراز بھی ——!

——(۹)——

وقت کا برق رفتار عقاب مستقبل کے دھندلکے کو چیرتا ہوا، حال کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا، ماضی کی کثیف تاریکیوں میں غائب ہو رہا تھا۔ زمانے کی پیہم گردشیں انسانی قسمت کی روشن لکیروں کو سیاہ دھبوں اور سیاہ دھبوں کو رنگین نقوش میں تبدیل کر رہی تھیں۔ ہر گھڑی میں ایک نیا تغیر، ایک تازہ انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ مگر شہزادی اور پاشا —— دونوں محبت کے متوالے، محبت کی سرمستیوں میں غرق تھے۔ انہیں نہ تو وقت کی برق رفتاری کا کچھ علم تھا۔ اور نہ بیرونی دنیا کے واقعات کی کچھ خبر! محبت کی مسرتوں نے انہیں دُنیا اور مافیہا سے یکسر غافل کر دیا تھا۔ دونوں اپنی موجودہ زندگی سے بےحد مسرور، بےحد مطمئن تھے۔ مگر مرجانہ کا اضطراب، مرجانہ کی بےکلی، روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پاشا اور شہزادی، دونوں کے علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی!

ایک چاندنی رات کو اچانک پاشا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ باغ میں کوئی شخص پودے کے قریب کھڑا تھا۔ پاشا نیچے گیا۔ ایک مدھم سی، دردناک آواز اس کے کان میں آنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اُدھر چلنے لگا۔ جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ مرجانہ، ایک پودے کے قریب بیٹھی ہوئی دردناک لہجے میں ایک فراقیہ غزل گا رہی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ پاشا نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ مغموم عورت جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"پاشا!" اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ اور پھر منہ پھیر کر آنسو خشک کرنے لگی۔

"کیوں مرجانہ! آخر تم اپنی خلش کی وجہ کیوں نہیں بتاتی ـــــ ہم یقیناً تمہاری خلش کو دور کر سکتے ہیں۔ اور دور کر دیں گے۔"

مرجانہ نے حسرت آمیز نگاہوں سے پاشا کی طرف دیکھا۔

"مرجانہ: بولتی کیوں نہیں ـــــ کیوں نہیں اپنا دکھ بتاتی؟" پاشا نے ہمدردانہ پوچھا!

"مجھے کوئی دکھ نہیں ـــــ!"

"کوئی دکھ نہیں ـــــ اور پھر بھی یہ اشکباری ـــــ مرجانہ! اپنا دکھ چھپانے کی کوشش نہ کرو!"

مرجانہ نے بولنے کی کوشش کی مگر پھر رک گئی ـــــ اس کے ہونٹ جن کے گوشوں میں آنسوؤں کی وجہ سے نمی سی نمودار تھی۔ خزاں زدہ پتوں کی طرح کانپنے لگے ـــــ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ رک رک کر، جھجک جھجک کر کہنے لگی:۔

"میری داستانِ حیات بہت مختصر ہے۔ میں شہر ہوزنہ کی رہنے والی ہوں۔ میں ابھی نو سال کی لڑکی ہی تھی۔ کہ ظالموں کے جال میں پھنس گئی۔ اور انہوں نے مجھے ایک دولتمند شخص کے یہاں بیچ دیا۔ چند سال میں وہاں رہی۔ پھر اس نے بھی مجھے بیچ دیا۔ اس طرح میں کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ایک دن ایک بازار سے گذر رہی تھی۔ کہ شہزادی صاحبہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے بکمال لطف مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ اور میں محل میں پہنچ گئی ـــــ میری زبان میں طاقت نہیں، کہ ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ انہوں نے مجھ پر بہت مہربانی کی ہے ـــــ مجھے کبھی بھی اپنی خادمہ نہیں سمجھا ـــــ جب بھی مجھے کوئی تکلیف پیش آتی۔ میں ان سے کہہ دیتی۔ اور وہ ـــــ"

"یہ سب درست" پاشا نے اس کے الفاظ کاٹ کر کہا۔ "اب بھی تم سمارت کو لوٹ جاؤ۔ ان کے دل میں کوئی رنج نہیں ہوگا!"

"سمارت کو لوٹ جاؤں ـــ؟ کیوں؟؟"

"کیونکہ تم کو وہاں جانا چاہیئے۔ وہاں تم نے اتنے سال گزارے ہیں ـــ!"

"سمارت ـــ ہاں ـــ مگر اب"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو ـــ؟"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔ کہ اب سمارت میں جانا فضول ہے!"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ ــــ فوت ہو چکا ہے ــــ مجھے کبھی بھی نہیں مل سکتا ــــ کبھی بھی نہیں مل سکتا!"

"تو ــــ سمارت میں تمہیں کسی سے محبت ہو گئی تھی ــ ؟"

"ہاں ــــ محبت ہو گئی تھی ــــ مگر وہ فوت ہو گیا ــــ اوہ میں نے تمہیں پریشان کر دیا! مگر اب وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی بھی ایسی باتیں نہیں کروں گی ــــ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب اس کے تذکرے سے فائدہ؟ ــ اس کے ذکر سے حاصل؟ آئندہ کبھی بھی نہیں روؤنگی!"

یہ کہکر مرجانہ پودوں کے سایوں میں غائب ہو گئی ــــ اس واقعے سے پاشا نے سمجھ لیا۔ کہ مرجانہ کے غم کی اصل وجہ کیا ہے وہ اور شہزادی اس سے زیادہ مہربانی اور محبت کے ساتھ پیش آنے لگے!

(۱۵)

بہار کی ایک رنگین وخوشگوار صبح کو، پاشا اور شہزادی حسبِ معمول پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے عاشقانہ راز ونیاز میں محو تھے۔ ہر طرف بہار کے نشہ میں تیرتی ہوئی رنگینیاں اور مستی برساتی ہوئی رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یکایک دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ قریب کھڑی ہوئی ایک عورت پر پڑیں۔ اس عورت نے ہاتھ میں دو گلدستے پکڑے ہوئے تھے۔ اور ٹکٹکی باندھ کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ شہزادی نے یہ سمجھکر کہ وہ پھول بھیجنے والی عورت ہے۔ اسے اشارے سے بلایا۔ مگر وہ خاموش، وہیں کھڑی رہی۔ شہزادی نے دوبارہ بلایا۔ مگر اب بھی وہ خلافِ توقع وہیں کھڑی رہی ــــ وہیں کھڑی رہی اور گھور گھور کر ان کو دیکھتی رہی۔ پاشا، حیرت زدہ ہو کر اس کے پاس پہنچا۔ اور اس سے کہنے لگا:۔ "پھول بھیجتی ہو تم ــ مگر یہ شرمانا کیسا! تمہیں دو دفعہ بلایا۔ مگر تم ٹس سے مس نہیں ہوئیں!" اس پر بھی وہ اجنبی عورت خاموش کھڑی اس کا منہ تکنے لگی۔ پاشا نے اس کا شانہ ہلایا، ایک گلدستہ اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ اور وہ منہ پھیر کر چلنے لگی۔ دو تین منٹ کے بعد فضا میں ایک چیخ گونجی ــــ دونوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دوسری چیخ گونجی ــــ دونوں اٹھ کر ایک طرف چلنے لگے۔ تھوڑی دور چل کر انہوں نے دیکھا۔ کہ ایک جھونپڑی کے سامنے، ایک موٹی سی عورت اسی عورت کو، جو چند منٹ پیشتر ان کے قریب کھڑی تھی، بید سے پیٹ رہی ہے۔ پاشا اور شہزادی کو دیکھ کر عورت کے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ ان کی طرف دیکھ کر ملتجیانہ انداز میں کہنے لگی:۔

"معاف کیجئے! اس پاگل نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کر دیا۔ میں نے گلدستے آپ کے لئے بھیجے تھے۔ مگر اس بدبخت

نے آپ کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لاکھ سمجھاتی ہوں۔ مگر اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ کمبخت، ڈائن ــــــ!"

"ہم پھول لے لیں گے ــــــ مگر یہ تو کہو یہ ہے کون؟ تمہاری بیٹی؟" پاشا نے پوچھا:

"نہیں جناب! یہ میری بیٹی نہیں ہے ــــــ مگر میں نے اِسے بیٹی ہی سمجھا ہے ــــــ کمبخت بہت ستاتی ہے۔ دیکھا آپ نے ــــــ!"

"مگر یہ پاگل کیونکر ہو گئی ــــــ؟"

"یہ پاگل ہی نہیں، گونگی بھی ہے!"

"گونگی ہے، جبھی چپ چاپ کھڑی رہی!"

اب وہ گونگی عورت ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے۔ اور ایک ہاتھ سے خون نکل رہا تھا۔

"بڑی بے رحمی سے مارا ہے تم نے! بیچاری کو لہولہان کر دیا۔" شہزادی نے رحم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

عورت نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگی "آپ کو کیا معلوم کہ یہ کتنا ستاتی ہے۔ میں تو اس کے ہاتھوں تنگ آ گئی ہوں۔ بعض اوقات تو اس کا پاگل پن، اتنا بڑھ جاتا ہے۔ کہ میں خود ڈر جاتی ہوں۔ دیکھیے نا۔ میں نے پھول دے کر اسے آپ کی خدمت میں بھیجا۔ مگر یہ آپ کو پریشان کرنے لگی ــــــ ایسی حرکتیں کئی بار کر چکی ہے۔ ذرا سوچیے! ہم پھول بیچ کر ہی تو اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟"

"تمہیں پھولوں کی قیمت مل جائے گی۔" پاشا نے کہا۔

اس پر عورت کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ آہ بھر کر بولی "جناب! اس کی داستان بڑی دردناک ہے۔ میرا مرحوم خاوند اسے غلاموں کی منڈی سے خرید کر لایا تھا۔ اس وقت یہ بولتی تھی۔ مگر سخت بیمار تھی۔ میرا مرحوم خاوند بڑا رحمدل تھا۔ اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اس کی تیمارداری کرنے لگا۔ مگر اس کی بیماری بڑھتی گئی ــــــ یہاں تک کہ ہمیں اس کی موت کا پورا پورا یقین ہو گیا۔ مگر اتفاق دیکھیے۔ اس کا بخار اتر گیا۔ مگر یہ بیچاری گونگی ہو گئی ــــــ اور اس کا سر بھی پھر گیا ــــــ اب ہم دونوں پھول بیچ کر پیٹ بھرتے ہیں۔ مگر جناب یہ جتنا مجھے ستاتی ہے۔ اتنا کسی اور کو ستائے۔ تو وہ اس کی شکل تک نہ دیکھے۔"

شہزادی نے چند سکے عورت کی طرف پھینکے۔ عورت نے ممنونانہ وہ سکے اٹھا لیے۔

"اسے اتنی بے رحمی کے ساتھ نہ مارا کرو" شہزادی نے کہا۔

"نہیں سرکار! اگرچہ یہ مجھے بہت ستاتی ہے ــــ مگر اس پر بھی میں اسے نہیں مارتی: اور آئندہ تو اسے جھڑک تک نہیں دوں گی!"

"اور ہاں ہر روز دو گلدستے ہمارے یہاں پہنچا دیا کرو ــــ" پاشا نے کہا۔

"بہت ــــ بہت اچھا میری سرکار!"

شہزادی نے ایک گلدستہ عورت سے لیا۔ اور دونوں واپس مکان کی طرف چلنے لگے!

(۱۱)

دوسرے دن علی الصبح گونگی عورت دو دلکشا خوش نما گلدستے لئے ہوئے شہزادی کے پاس آئی۔ شہزادی نے گلدستے لے کر ایک طرف رکھ دیئے، اور اس کے ہاتھ میں چند سکے دے کر، اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد پاشا بھی وہیں آ گیا۔ اور گلدستوں کو ہاتھ میں لے کر، انہیں تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اچانک ایک طرف سے "ہی ہی ہی ہی" کی آواز آئی۔ دونوں نے ادھر دیکھا۔ ایک گوشے میں گونگی کھڑی پاشا کو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اوہ! یہ ابھی یہیں ہے!" شہزادی نے تعجب سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ کچھ کہنا چاہتی ہے ــــ" یہ کہکر پاشا نے اشارے سے گونگی کو اپنے پاس بلایا۔ گونگی ہنستی ہوئی ادھر آئی اور ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟" پاشا نے اس سے اشاروں میں پوچھا۔ اس پر گونگی گلدستوں کی طرف اشارہ کر کے بے اختیار ہنس پڑی۔

"اس سے یہ پوچھنا چاہیئے۔ کہ اب اس کی مالکہ اسے پیٹتی ہے یا نہیں" شہزادی نے پاشا سے کہا۔

پاشا نے اشاروں میں اپنا سوال گونگی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ہنسنے لگی ــــ اور ہنس ہنس کر پاشا کی طرف دیکھنے لگی! کچھ دیر وہ اور ٹھہری اور اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے دونوں کو ہنساتی رہی۔ اور پھر اپنی مالکہ کے ڈر سے چلی گئی۔

اس کے بعد تو گونگی کی موجودگی اور اس کی حرکات پاشا اور شہزادی کے لئے سامان خندہ بن گئیں۔ وہ ہر روز آتی۔ ہر روز ان کو ہنساتی اور اس وقت تک وہیں رہتی جب تک اس کی مالکہ خود اسے لینے نہ آ جاتی۔ وہ ان دونوں سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور چاہتی تھی۔ کہ ہر وقت انہی کے پاس بیٹھی رہے!

ایک چاندنی رات کو، پاشا اپنے کمرے سے نکل کر نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ کہ اس نے کچھ دُور کسی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سمجھا۔ کہ مرجانہ ہوگی۔ کیونکہ وہی اپنے مرحوم محب کی فرقت میں راتوں کو مضطربانہ باغ میں پھرا کرتی تھی۔ یہی خیال کرکے وُہ اس طرف گیا۔ مگر یہ دیکھ کر وُہ سخت متعجب ہُوا۔ کہ وہاں مرجانہ کی بجائے گُونگی کھڑی ہے۔

گُونگی نے ہاتھ میں دو گلدستے پکڑے ہوئے تھے۔ اور اس کی نگاہیں پاشا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پاشا نے اس سے آنے کی وجہ پوچھی —— اس کے جواب میں گُونگی کے پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر اس طرح پیدا ہوئی۔ جس طرح ایک زرد پتّے پر سورج کی آخری کرن لرز رہی ہو —— !

پاشا نے اس سے دوبارہ پوچھا۔ اب بھی گُونگی خاموش کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پاشا نے اب اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا گُونگی نے لمبا سانس لیا۔ اور جب ہوا نکالی۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ سخت گرم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ پاشا کو گُونگی کی حرکات پر سخت تعجب ہوا۔ یکایک گُونگی کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے —— اور وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ پاشا نے یہ سمجھ کر کہ اس پر جنون کا دَورہ پڑا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ بخار کی شدت سے دہکتا ہُوا کوئلہ بنا ہوا تھا۔ پاشا نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ مگر گُونگی کے منہ سے برابر چیخیں نکل رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر پاشا نے اسے بازوؤں پر اٹھایا۔ اور اوپر لے جانے لگا۔ اب گُونگی کی چیخیں تھم گئیں۔ اور وُہ یکلخت ہنسنے لگی —— قہقہے مار مار کر ہنسنے لگی۔

اُوپر آ کر پاشا نے گُونگی کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اور مرجانہ کو بیدار کرکے، اس کی تیمارداری پر مامور کر دیا۔

صبح کے وقت گُونگی کا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ اُور سانسوں میں اتنی حرارت تھی۔ کہ محسوس ہوتا تھا۔ اس کے سینے میں آگ جل رہی ہے۔ پاشا، شہزادی اور مرجانہ، تینوں از راہِ ہمدردی اس کی تیمارداری کرنے لگے۔ گُونگی کی عجب حالت تھی کبھی تو وُہ ہنسنے لگتی اور کافی دیر تک ہنستی چلی جاتی، اور جب رونے لگتی۔ تو آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے۔ یہی نہیں۔ بلکہ جب چیخنے پر آتی۔ تو چیختی چلی جاتی۔ ان کے علاوہ اس نے ایک ایسی حرکت بھی کی جس نے اس کے تیمارداروں کو حیرت و تعجب میں غرق کر دیا۔ وُہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی اپنے سر اُور بازوؤں کو اس طرح جنبش دے رہی تھی۔ گویا آنے والے واقعے کی بڑی بے چینی کے ساتھ منتظر ہے۔ یکایک اسکی نگاہیں میز پر رکھے ہوئے سُرخ پھولوں کے گلدستے پر پڑیں۔ اور وہ بے اختیار چیخنے لگی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اُور پلنگ سے اتر کر دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ پاشا نے اس کے بازو پکڑ لئے۔ مگر وہ چیخ چیخ کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس کی نگاہیں ابھی تک انہی سُرخ پھولوں پر جمی تھیں —— شہزادی نے گلدستے کو اٹھا کر، کھڑکی کی

راہ سے نیچے پھینک دیا۔ اس پر گونگی کی چیخیں تھم گئیں۔ مگر بدن ابھی تک کانپ رہا تھا ـــــ تمام کو اس واقعے پر سخت حیرت ہوئی۔ گونگی چند دن پیشتر یہی سرخ پھول ان کے لئے لایا کرتی تھی۔ مگر اب انہی سرخ پھولوں سے ڈر ڈر کر کانپ رہی تھی ـــ!

(١٢)

ویسے تو مرجانہ پہلے ہی افسردہ و مضمحل رہتی تھی۔ مگر چند دن سے تو وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی، پریشان پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ وہ عموماً دن کا بیشتر حصہ مکان کے پائیں باغ میں گزارتی تھی۔ وہاں اس نے کئی تصویریں بنا رکھی تھیں۔ اور کئی تصویریں بنا رہی تھی۔ مصوری اس کے لئے غم غلط کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ اور اس وسیلے ہی سے وہ اپنا زخمی دل بہلایا کرتی تھی۔ شہزادی کو اس کے اس شغل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور وہ اس کی تصویروں کو بڑے شوق سے دیکھتی اور داد دیتی تھی۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی۔ کہ اب تک مرجانہ نے شہزادی کی جتنی تصویریں بنائی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی نقص سے خالی نہ تھی۔ کبھی تصویر میں شہزادی کے رخ پر کوئی دھبہ رہ گیا تھا۔ اور کسی میں اس کی پیشانی زیادہ چوڑی دکھائی گئی تھی۔ ایک تصویر تو مرجانہ نے بڑی محنت، کاوش اور شوق سے تیار کی تھی۔ مگر اس میں بھی ایک معمولی سی خامی تھی۔ یعنی شہزادی کے ہاتھ میں جو گلدستہ دکھایا گیا تھا۔ اس پر ایک سیاہ دھبہ یوں دکھائی دیتا تھا۔ گویا ایک ناگن کنڈلی مار کر بیٹھی ہوئی ہے۔

آج بھی مرجانہ حسب معمول، باغ کے ایک گوشے میں، نہر کے کنارے بیٹھی ہوئی کسی تصویر کو مکمل کر رہی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس کی اولیں شعاعیں، فضا میں چھائے ہوئے کہر کے بادلوں کو چیرتی ہوئی پودوں اور درختوں کی شبنم آلود ٹہنیوں پر مدھم مدھم سے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ گویا اس کے سینے پر کوئی بوجھ سا پڑا ہوا ہے۔ اور نہر کی داہنی جانب، ایک پودا اس طرح جھکا ہوا تھا۔ گویا ہوا کے تیز ہوتے ہی گر پڑے گا۔ مرجانہ کا موقلم تیزی کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ دو تین منٹ وہ اپنے شغل میں غرق رہی۔ پھر تصویر کو ایک طرف رکھ دیا۔ اور ایک لمبی آہ کھینچ کر ندی کے پانی کو دیکھنے لگی۔ پانی کی سطح پر جابجا شکنیں یہ ظاہر کر رہی تھیں۔ کہ ندی کی گہرائیوں میں ایک ہیجان برپا ہے۔ مگر ندی، اس ہیجان کو، اس اضطراب کو دبا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ چند لمحوں کے بعد مرجانہ نے وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ اور پھر تصویر کو بنانے لگی۔ اتنے میں پاشا ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ اور مرجانہ کے عقب میں کھڑے ہو کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ تصویر ابھی غیر مکمل تھی۔ اس میں صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ ایک تودے میں دو تیر سے گڑے ہوئے ہیں۔

"یہ کیا بنا رہی ہو مرجانہ" پاشا نے پوچھا۔

مرجانہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر منہ پھیر لیا۔

"آخر یہ ہے کیا ؟" پاشا نے دوبارہ پوچھا۔ اور مرجانہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مرجانہ کی نگاہیں اٹھیں۔ اور پاشا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"کوئی بڑی ہی شاندار چیز معلوم ہوتی ہے۔" پاشا نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تصویر ـــــ ؟"

"ہاں !"

"مگر یہ تو کچھ بھی نہیں ـــــ صرف تصویر ہے !"

"میں بھی تو اسے تصویر ہی سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ آخر اس تصویر کا مطلب کیا ہے ؟"

"اس تصویر کا مطلب ـــــ ؟ اس تصویر کا کوئی مطلب نہیں۔ آپ سیر کرنے جا رہے ہیں نا ! جائیے۔ جلدی جائیے ! سورج نکل رہا ہے ـــــ"

"اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم مجھے اپنے اس شاہکار کے متعلق کچھ بھی بتانا نہیں چاہتیں۔ ہے نا یہی بات ؟"

نہیں یہ بات نہیں ! ـــــ کوئی بات بھی نہیں۔ آپ جائیے ـــــ !" یہ الفاظ مرجانہ نے بڑی پریشانی کے عالم میں کہے۔

پاشا اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "مرجانہ ! چند دن سے میں تمہیں بہت پریشان دیکھ رہا ہوں ـــــ اور تمہاری پریشانی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ! پاگل عورت ! دنیا میں کون مغموم نہیں ؟ کس کی امیدیں پامال نہیں ہوتیں ؟ کون ـــــ"

"یہ بالکل درست ہے ـــــ بالکل درست ہے۔ کس کی امیدیں پامال نہیں ہوتیں ـــــ اس لئے میری امیدیں بھی پامال ہونی چاہئیں ـــــ میری تمام حسرتوں کا خون ہو جانا چاہیئے ـــــ میں ـــــ میں ـــــ" یہ کہتے ہوئے مرجانہ کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

"مرجانہ کیا ہو رہا ہے تمہیں، ہوش کرو۔ زندگی کو آنسوؤں اور آہوں کے سپرد کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی !"

"کاش میں مرچکی ہوتی ——!"

"بڑی بے وقوف ہو —— چھوڑو ان باتوں کو اور مجھے بتاؤ تم کیا بنا رہی ہو. یہ سرخ و سیاہ لکیریں تو بڑی خوشنما ہیں۔

—— واقعی شاید یہ تیر ہیں ——؟"

"ہاں یہ تیر ہیں۔" مرجانہ نے کہا۔ اسکی نگاہیں پاشا کے چہرے پر جمی تھیں۔

"اور یہ تودا سا؟"

"ایک انسانی دل —— ایک کمزور، قابلِ نفرت انسانی دل!"

"تو ان سب چیزوں سے مراد کیا ہے؟"

"مراد ——؟ میں بتاتی ہوں. تم نے مجھے بتانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ انسانی دل ہے۔ اور اس میں دو تیر گڑے ہیں ایک سُرخ ہے اور دوسرا سیاہ۔ سُرخ تیر فرض کا تیر ہے۔ اور سیاہ تیر عشق کا تیر۔ جو تیر دل میں زیادہ گہرائی تک اتر جائے گا۔ وہی زیادہ اثر کریگا ——!"

"تو کون سا تیر زیادہ گہرائی تک جائے گا؟"

"یہ تیر —— فرض کا تیر!" یہ کہکر مرجانہ نے مو قلم اٹھایا۔ اور خط کھینچنے لگی!

"یہ کیا؟" پاشا نے مضطرب ہو کر کہا۔ مرجانہ کا ہاتھ رک گیا۔

"تم نے تو عشق کے تیر کو آخری گہرائی تک پہنچا دیا —— فرض کا تیر تو یہ ہے —— یہ سُرخ رنگ کا تیر!"

"اوہ میں بھی —— مگر میں کیا کر سکتی ہوں. حقیقت کو کیونکر چھپاؤں —— حقیقت کیونکر چھپ سکتی ہے؟ بتاؤ پاشا؟"

پاشا کی نگاہیں یک لخت تصویر پر جم گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ مرجانہ کہنے لگی "پاشا! میں مجبور ہوں —— کاش تم نے مجھے سمجھا ہوتا —— میں اب مجبور ہو گئی ہوں —— دل پر میرا بس نہیں —— آہ تم ——"

پاشا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں —— پیشانی شکن آلود ہو گئی!

"پاشا!" مرجانہ نے آہستہ سے کہا۔ پاشا نے مڑکر اس کی طرف دیکھا۔ مرجانہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ اور اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ پاشا کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔ اور جھکے ہوئے پودے کی ایک شاخ کو زور سے ہلانے لگا۔ ایک منٹ کے بعد پودا دھم سے اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے پاؤں کو پودے کے نیچے سے نکالتے

ہوئے اپنی بائیں طرف دیکھا ——— مرجانہ کی بجائے اب گونگی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کو دیکھ رہی تھی :

پاشانے وہاں سے نظریں ہٹالیں - اور تیزی کے ساتھ ایک طرف چلنے لگا - اتنے میں شہزادی کی آواز آئی - "پاشا! تم کہاں ہو؟" اور چند لمحوں کے بعد شہزادی اس کے سامنے کھڑی ہوئی اُسے متبسم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی :

"اکیلے بیٹھے بیٹھے میں گھبرا سی گئی —— نہ معلوم کیوں —— اور تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو - کیابات ہے - چلو اوپر - رات میں نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے - اوپر جاکر سناؤں گی"!

شہزادی نے پاشا کا ہاتھ پکڑ لیا - اور اُنہوں نے ابھی دو قدم بھی نہیں اٹھائے تھے - کہ ان کے کان میں چیخوں کی آواز آئی - دونوں کے قدم رُک گئے -

یکایک گونگی چیختی چلاتی ہوئی آئی اور آتے ہی پاشا سے لپٹ گئی - اس کا چہرہ انتہائی سُرخ تھا - نتھنے پھولے ہوئے تھے - اور منہ سے عجیب و غریب مسرت انگیز چیخیں نکل رہی تھیں - اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک تصویر والا کاغذ موجود تھا!

پاشانے دیوانی عورت کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی - مگر وہ اس سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی - کہ جُدا ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی - شہزادی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا - گونگی علیحدہ ہوگئی - اور پاشا کو عجیب انداز میں دیکھ کر بار بار اپنے ہاتھ اوپر اٹھانے لگی - "ہا ہا ہا —— آں —— آزا —— اس —— زا —— آں آں —— آں" کی مسلسل ہیبت پریشان کُن آوازیں اس کے منہ سے نکل کر فضا میں گونج رہی تھیں - اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ، اس کے ہاتھ پارے کی طرح تڑپ رہے تھے -

شہزادی نے پاشا کا ہاتھ پکڑ لیا - اور چلنے لگی - پاشا بھی چلنے لگا - مگر گونگی تڑپ کر اُن کے سامنے آگئی - اور تصویر کی طرف اشارہ کر کر کے، ہاتھ اُوپر اٹھا اٹھا کر، بے معنی چیخیں بلند کرنے لگی -

"آج اس پر عجیب دَورہ پڑا ہے"! شہزادی نے کہا - اور غضب ناک لہجے میں گونگی سے کہا "جاؤ! دفع ہو جاؤ ——!"

مگر پاگل عورت کا دورہ جنوں برابر شدت حاصل کرتا جارہا تھا -

"مارو گی تمہیں!" شہزادی نے مارنے کی نقل اتارتے ہوئے کہا - مگر بے سود! گونگی کی چیخوں میں شدت، اور اس کی حرکات میں زیادہ اضطراب پیدا ہوگیا - شہزادی نے باغ کے مالیوں کو آواز دی - تین چار آدمی آئے - اور انہوں نے شہزادی کے ایما پر پاگل عورت کو پکڑ لیا - اور اُسے ایک طرف لے جانے لگے - گونگی عورت مالیوں کی آہنیں گرفت میں تڑپ تڑپ کر چھینے

گی ——— وُہ اس طرح چیخ رہی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا ابھی اس کا پھیپھڑا پھٹ جائے گا۔

پاشا اور شہزادی اُوپر پہنچ گئے۔ مگر ابھی تک پاگل عورت کی چیخیں اُن کے کانوں میں آرہی تھیں!

(۱۳)

پاشا کا اضطراب روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اور شہزادی حیران تھی۔ کہ آخر کون سا واقعہ اس کے محبوب کے دل کو مضطرب کر رہا ہے؟ آخر کس چیز نے اس کے دل و دماغ میں خلش پیدا کر دی ہے؟ وُہ بار بار اپنی محبت کا، صداقت و شدّت کا واسطہ دے دے کر اس سے بیتابی کا اصل سبب پوچھتی۔ اس کی ہر ہر قول، ہر ہر فعل اور ہر ہر حرکت پر گھنٹوں غور کرتی۔ مگر اس کی مایوس نگاہیں صرف یہی دیکھتیں۔ کہ اس کے محبوب کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے!

نسوانی فطرت بہت وہم پرست ہوتی ہے۔ اور اس کی وہم پرستانہ نگاہیں معمولی سی بات کو بھی انتہائی خطرناک سمجھنے لگتی ہیں اس صورت میں کیونکر ممکن تھا۔ کہ شہزادی پاشا کو بے چین دیکھتی اور خود اس سے بڑھکر بے چین نہ ہو جاتی؟ اپنے محبوب کے ناقابلِ فہم اور اذیت رساں رویئے کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی اس کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اور وُہ تھا اس کی وفادار خادمہ مرجانہ کا یک بیک غائب ہو جانا۔ وُہ مرجانہ سے بے حد مانوس تھی۔ اور کبھی اس کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ مرجانہ یک بیک چلی جائیگی۔ مرجانہ کے علاوہ گونگی کی موجودگی سے بھی اسکا دل بہلتا رہتا تھا۔ مگر اب وُہ بھی وہاں نہیں آسکتی تھی۔ اس دن باغ میں جنون کا جو دَورہ اس پر پڑا تھا۔ اُسنے تمام لوگوں کو ڈرا دیا تھا۔ اور ہر ایک کو یقین ہو چکا تھا۔ کہ اس کی وحشیانہ حرکتیں بہت خطرناک ہو چکی ہیں۔ اس لئے کوئی بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔

اس وقت شہزادی انہی ناخوشگوار امور پر غور کر رہی تھی۔ کہ اس کے دل میں بے تابی نے جوش مارا۔ وُہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور اپنے محبوب کو تلاش کرنے لگی۔ پاشا کسی کمرے میں بھی نہیں تھا۔ تمام کمروں میں گھومنے کے بعد وُہ نیچے، باغ میں آئی۔ اور اسے ڈھونڈنے لگی۔ پاشا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی نگاہیں، دور کہیں جمی تھیں، شہزادی کو وہاں کھڑے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گزرے ہونگے۔ کہ اس نے، قریب ہی بلبل کی آواز سُنی۔ اس نے اوپر نظر اٹھائی۔ بلند درخت کی ایک شاخ پر اس کا پیارا بلبل بیٹھا نغمہ سرائی میں محو تھا۔ اس نے بعجلت بلبل کے پنجرے کی طرف دیکھا، جو ایک شاخ سے لٹک رہا تھا۔ پنجرے کی تیلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کے سنہری برتن گھاس پر پڑے تھے۔ ان کے علاوہ وُہ ظروف زریں بھی جنہیں پاشا اور شہزادی شراب پیا کرتے تھے، اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر شہزادی ایک لمحہ بھی ساکت و صامت کھڑی نہ رہ سکی اس نے آگے بڑھ کر، پاشا کا ہاتھ پکڑ کر ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"پاشا! آخر کب تک مجھے مضطرب رکھو گے، میری حالت کا تمہیں کوئی احساس نہیں؟"

"مجھے تمہاری حالت کا احساس نہ ہو یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" پاشا نے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں تمہیں میری ذرہ بھر پروا نہیں؟" شہزادی نے غمگین لہجے میں کہا۔

"یہ تم نے کیونکر جانا؟"

"تمہارے موجودہ رویّے سے، تمہاری بے پروائی سے اور کس سے؟"

یکایک فضا میں بلبل کی آواز گونجی۔

"اور دیکھو تم نے یہ کیا غضب کر دیا۔ میرا عزیز بلبل چھوڑ دیا۔ اس کا پنجرا توڑ ڈالا۔ برتن پھینک دیئے۔ میرے پاشا! —— میرے محبوب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تم بیمار ہو ——؟"

شہزادی التجا انگیز نگاہوں سے پاشا کو دیکھنے لگی۔ پاشا نے ٹوٹے ہوئے پنجرے کو دیکھا۔ اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ شہزادی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" پاشا نے پوچھا۔

"میرا ہاتھ مروڑ ڈالا اور اب پوچھتے ہو کیا ہوا۔ چھوڑو میرا ہاتھ!"

پاشا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"مجھے تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ کہ تمہارا ہاتھ دبا رہا ہوں۔ معاف کرنا ——"

"بلبل کی آواز پھر فضا میں گونجی۔ شہزادی بے اختیار اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے اس ننھی سی جان کو پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔ مگر میں نے اسے آزاد کر دیا۔ آج یہ خوش ہے، مسرور ہے اور ہمیشہ مسرور رہے گا۔"

"لیکن قید میں اس کو تکلیف کیا تھی؟"

"قید خانے میں اس کو کیا تکلیف تھی؟ قید خانے میں کیا تکلیف ہوتی ہے —— اس ننھی سی جان کو وسیع دنیا کی وسیع فضاؤں سے یکسر محروم کر کے مضبوط تیلیوں میں قید کر دیا۔ کیا یہ ظلم نہیں؟"

"پاشا! بس" شہزادی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

پاشا کرخت آواز میں کہے جا رہا تھا "تم نہیں جانتیں، قید ہونا کتنی ہولناک مصیبت ہے، تمہیں خبر نہیں غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔ تمہیں معلوم نہیں قیدی پر کتنے مظالم توڑے جاتے ہیں؟"

شہزادی نے پاشا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پاشا! تم بیمار ہو۔ تمہارے دماغ میں آگ بھڑک رہی ہے۔"

قریب سے کھڑکھڑ کی آواز آئی۔ جیسے سوکھے ہوئے پتوں پر کوئی چل رہا ہے۔ اور چند لمحوں کے بعد گونگی پاشا کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی کاغذ کا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ جس پر مرجانہ نے فرض اور عشق کی کشمکش دکھائی تھی۔ یک لخت گونگی پاشا کا دامن پکڑ کر اور تصویر کی طرف اشارہ کر کے چیخنے لگی:۔

"آں ـــ آں ـــ ں، آنا ـــ زا ـــ زاں ـــ ں ـــ آں، آں"

شہزادی پہلے ہی پریشان تھی۔ اور اس واقعے نے تو اسے اور بھی پریشان کر دیا۔ اس نے مالیوں کو آواز دی اور غصے سے کہا: "اس کمبخت کو لے جاؤ۔ اور آئندہ اس پاگل کو یہاں قدم نہ دھرنے دینا۔"

مالی پاگل عورت کو گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ وہ تڑپ رہی تھی، چیخ رہی تھی۔

شہزادی نے پاشا سے باتیں کرنی چاہیں۔ مگر جب دیکھا کہ وہ اس کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دیتا۔ تو مایوس ہو کر اوپر چلی گئی۔

شہزادی کو امید تھی۔ کہ دوسرے دن پاشا اس سے باتیں کرے گا۔ مگر جیسے ہی وہ پاشا کے پاس پہنچی۔ پاشا نے اسے دیکھا۔ اور کرخت آواز میں کہا۔

"شہزادی! تم واپس چلی جاؤ!"

یہ سن کر شہزادی ہکا بکا ہو گئی۔

"کہاں؟ پاشا؟"

"اپنے محل میں!"

"اپنے محل کو واپس چلی جاؤں ـــ واپس؟"

"ہاں! تمہیں واپس ہی جانا چاہیے۔ کیونکہ میں جا رہا ہوں!"

"میں کہاں جاؤں ــــ اور تم کہاں جا رہے ہو؟"
"تم واپس اپنے محل کو جاؤ۔ اور میں اپنا فرض ادا کرنے جا رہا ہوں۔"
"اپنا فرض ــــ کون سا فرض؟"
"اپنا وطن آزاد کرنا، یہی میرا سب سے بڑا فرض ہے ــــ یہی میرا پہلا اور آخری فرض ہے۔"
"مگر میرے پاشا ــــ میرے محبوب!"
"شہزادی! تم نے اب تک میرے دل و دماغ کو مسحور کئے رکھا۔ تمہاری محبت کے تیر نے میرے دل میں ترازو ہو کر میری رگ رگ میں بزدلی کا زہر پھیلا دیا ــــ اور مجھے اپنے فرض کا احساس تک نہ ہو سکا۔ مگر اب میں ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ سمارت یا تو تاتاریوں کے آہنیں پنجے سے آزاد ہوگا۔ یا میرا خون اس کی مقدس خاک میں [illegible] دے گا!"
"میں کیا سُن رہی ہوں پاشا، یہ مذاق ــــ؟"
"تو کیا تمہارا خیال ہے میں یہاں عیش کروں۔ اور میرے ہموطن غلامی کی لعنتوں کے نیچے دبے رہیں؟ میں تمہارے ساتھ محبت کے لطف اُٹھاؤں اور سمارت کے باشندے تاتاریوں کے ہر ذلیل حکم پر اپنی جان بھینٹ چڑھاتے رہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرا وطن غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو ــــ اور میں یہاں عیش کروں ــــ لعنت ہے ایسی زندگی پر ــــ!"
"اور تمہیں میرا خیال نہیں ــــ اپنی محبت کا احساس نہیں ــــ میں محل کے عیش و آرام چھوڑ کر تمہارے ساتھ آئی ہوں۔؟"
"میرے ساتھ آ کر تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے ــــ برباد کر دیا ہے۔ مجھے میرے فرض کے راستے سے ہٹا دیا ہے ــــ تم جاسوسہ ہو، مکار ہو۔"
"پاشا ــــ پاشا! کیا کہے جا رہے ہو ــــ میں جاسوسہ، مکار! ــــ پاشا! مجھے اور طرح بھی ہلاک کر سکتے ہو ــــ؟"
"میں نے جو کچھ کہدیا ہے، وہ کہدیا ہے، تم واپس چلی جاؤ!"
شہزادی نے پاشا کا دامن پکڑنا چاہا۔ مگر وہ سیڑھیوں سے اتر گیا۔ شہزادی تیزی کے ساتھ نیچے اتری۔ مگر پاشا کہیں بھی نہیں

ــــ (۱۴) ــــ

گونگی کا جوش جنون کسی صورت بھی کم نہ ہوتا تھا۔ وہ بار بار "قصرِ سرخ" کی طرف بھاگتی اور بار بار لوگوں کو اس کے پکڑنے کے لئے

اس کے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ اس کی مالکہ بے حد بے رحم تھی۔ اور اب تو اس کی بے رحمی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ دیوانی عورت کو، اتنا پیٹتی کہ اس کے بدن سے خون بہنے لگتا۔ مگر اس کے باوجود دیوانی عورت پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ بے رحم مالکہ کی گرفت میں تڑپتی، چیختی چلاتی اور جیسے ہی چھٹکارا پاتی، بے تحاشا "قصر سرخ" کی جانب بھاگنے لگتی۔ آخر تنگ آ کر اس کی مالکہ نے اُسے کوٹھری میں بند کر دیا۔ چند دن کے بعد اس کی حالت آہستہ آہستہ متغیر ہونے لگی۔ اب اس کی دیوانگی میں پہلا سا جوش باقی نہیں تھا۔ اب اس کی حرکات میں وہ پہلی سی شوریدہ سری نہیں رہی تھی۔ اس کی مالکہ نے جب اس کے اس تغیر کو دیکھا۔ تو کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوئی۔ یہ دیکھ کر اس کو بہت حیرت ہوئی۔ کہ ان دنوں میں دیوانی عورت نے کوئلوں کے ساتھ تمام دیواریں سیاہ کر دی ہیں۔ جابجا اس قسم کی تصویریں کھنچی ہوئی تھیں:۔

اور اب بھی وہ زمین پر اس قسم کی تصویر بنا رہی تھی۔

اس کی مالکہ نے اس کے سر پر زور سے دو چپت مارا۔ دیوانی عورت نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اور اپنی مالکہ کو عجیب حسرت انگیز انداز سے دیکھا۔ اور پھر زمین پر لکیریں کھینچنے لگی۔

اس کی مالکہ اسے باہر لے آئی۔ اسی شام شہزادی کی طرف سے پیغام آیا۔ کہ اگر گونگی کا جوش جنوں ختم ہو چکا ہو۔ تو اسے میرے یہاں لے آؤ ــــــ

گونگی کو "قصر سرخ" میں پہنچا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ شہزادی اپنی باوفا خادمہ کی پر اسرار گمشدگی اور پھر اپنے محبوب کے ناگہانی رویئے کی وجہ سے بہت غمگین تھی۔ اور چاہتی تھی۔ کہ کوئی نہ کوئی اس کا دل بہلائے۔

گونگی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی ــــ گم سم۔ شہزادی نے اُسے بتایا۔ کہ مرجانہ کہیں چلی گئی ہے ــــــ اور پاشا بھی لڑائی کے لئے یہاں سے چلا گیا ہے۔ گونگی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک سی پیدا ہوئی۔ اور پھر غائب ہو گئی ــــ!

اس دن گونگی گم سم بیٹھی رہی۔

رات کو شہزادی نے گونگی کو پلنگ پر سلا دیا۔ مگر جب صبح ہوئی۔ تو اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ کہ گونگی بستر پر موجود نہیں ــ محل کے پہرہ داروں اور مالیوں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ رات کی تاریکی میں وہ نہ معلوم کہاں چلی گئی تھی علم خیال

یہ تھا۔ کہ جوشِ جنوں میں اس نے دریا میں یا کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہے!

(۱۵)

برسوں کا غلامی کا عذابِ شدید اور فاتح قوم کے مسلسل، ناقابلِ برداشت مظالم، مفتوح و مظلوم قوم کے ذہن کو اس طرح ناکارہ، پامال اور بے حس کر دیتے ہیں۔ کہ وہ آزادی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی۔ مگر جب ایک مدت کے بعد اس کے دل میں بیداری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ تو وہ آزادی کے راستے میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تل جاتی ہے۔ اس جنگ میں یا تو مفتوح قوم بالکل مٹ جاتی ہے۔ اور یا فاتح قوم کا دامنِ ہستی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ یہی حال سمارت کے ساتھ پیش آیا۔ پاشا کے ولولہ و جوش نے غلاموں کی رگ رگ میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اور وہ حقیر چنگاری جو مجروح سینوں اور زخمی دلوں کی گہرائیوں میں سلگ رہی تھی۔ ایک دم آتشیں شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ ملک کے گوشے گوشے میں جوش و جلال سپاہی کا آتشیں طوفان موجزن ہو گیا۔ اور ہر طرف بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی۔ مظلوم قوم کے افراد جو اپنے آقاؤں کے چہروں کو دیکھ کر کانپ جاتے تھے اب اُن کے جسموں کے پرزے اڑانے لگے۔ اور وہ کمزور انسان جو پانی میں بہتے ہوئے تنکے کی طرح تاتاریوں کے ہر اشارۂ چشم و ابرو پر حرکت کر رہے تھے۔ اب طوفان بن کر تاج و تخت کے مالکوں کو اپنی رو میں بہانے لگے۔

بغاوت ——— ہر طرف خون ریز و تباہی آور بغاوت۔

انقلاب ——— ہر جانب شعلہ ریز و خوفناک انقلاب۔

اور اس بغاوت و انقلاب کی تاریکیوں میں حاکم و محکوم، دونوں کی زندگیوں کے چراغ بجھ رہے تھے۔ کہیں شعلہ ریز ہتھیاروں کی چمکتی ہوئی اور کڑکتی ہوئی بجلیاں، بپھرے ہوئے انسانوں کی خرمنِ ہستی کو جلا کر خاک کر رہی تھیں۔ تو کہیں قوت و طاقت کا سیلاب خونچکاں لاشوں کے انبار سے ٹکرا رہا تھا۔

آج قلعہ سمارت پر اہلِ سمارت کا تیسرا حملہ تھا۔ پہلے دو حملے ناکام رہ چکے تھے۔ مگر یہ حملہ اتنا شدید اور اس قدر زبردست تھا۔ کہ تاتاریوں کے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے۔ تاتاری کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ اور اہلِ سمارت بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پاشا جنگِ آزادی کا ہیرو، سمارت کا جھنڈا پکڑے، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں جوش و ولولہ کا ایک سیلابِ بے پایاں موجزن تھا۔ اور وہ اڑا اچلا جا رہا تھا۔

اب قلعہ تھوڑے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اس نے قلعے کی طرف دیکھا۔ قلعے کے اوپر تاتاریوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر

اس کے جوش و ولولہ میں اور اضافہ ہو گیا ——— اس کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہو گئی۔ یکایک اس کے سینے میں گولی لگی۔
اس کی نگاہوں کے سامنے دھبے ناچنے لگے۔ ان سیاہ دھبوں میں سمارت کا سرخ جھنڈا ایک لمحے کے لئے لہرایا ——— اس
نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود، وہ لڑکھڑانے لگا ——— اچانک ایک ہاتھ بڑھا۔ اور جھنڈے کی سرخی اُس کی نظروں
سے غائب ہو گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ——— !

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ ایک خون آلود ہاتھ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ اور پھر پانی کے قطرے اس کے ہونٹوں پر گرنے
لگے۔ پاشا کے جسم میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ بے تاب ہو کر اُٹھ بیٹھا ——— یکایک فرطِ حیرت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔
خون میں شرابور گونگی اس کے قریب بیٹھی تھی ——— اس کے ہاتھ میں چمڑے کا مشکیزہ نظر آ رہا تھا ——— پاشا کو بیٹھے دیکھ کر گونگی
کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اور اس کے ہونٹوں سے آں آں اں ——— آں کی آواز نکلنے لگی۔

پاشا نے غور سے گونگی کی طرف دیکھا۔ گونگی کے سینے سے خون بہ رہا تھا۔ اس کی قمیص تار تار ہو چکی تھی۔ جیسے ہی پاشا کی نگاہ اس
کے ننگے بازو پر پڑی ——— حیرت کی ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی ——— گونگی کے بازو پر "عذرا" ——— پاشا کے سر میں گویا حروف لرز
رہے تھے ——— گونگی نے خوشی سے آں آں کی آواز نکالی۔ اور اس کا ہاتھ قلعے پر لہراتے ہوئے اہلِ سمارت کے پرچم کی طرف اُٹھنے
لگا۔ ——— اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

دوسرے لمحے میں اس کا سر ڈھلک گیا ——— اور وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔

پاشا نے اس کا سر اپنے آغوش میں لے لیا۔ اس کے سامنے بچپن کا وہ منظر پھرنے لگا۔ جب اس نے ایک معصوم لڑکی کے
بازو پر اپنا اور اس کا نام کھودا تھا۔ اور پھر ریت کے تودے پر دو پرچم نما لکڑیاں گاڑ کر انہوں نے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے
وابستہ ہونے کا عہد کیا تھا۔ پاشا کے کانوں میں عذرا کے الفاظ گونجنے لگے۔

"میں تمہاری ہوں ——— اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی ——— !"

پاشا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر گونگی کی پیشانی پر گرے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا ——— اور عذرا کی نم آلود
پیشانی پر آخری بوسۂ محبت ثبت کر دیا۔

اسی اثنا میں اُس کے قریب سے ایک آواز آئی۔ اس نے نظر اُٹھا کر اِدھر دیکھا۔ شہزادی دوڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی
——— اور دوسرے لمحے میں اس نے دیکھا کہ مرجانہ بھی اسی جانب تیزی کے ساتھ قدم اُٹھا رہی ہے ——— پاشا کی نگاہیں وہاں

سے ہٹ کر قلعے پر پڑیں ـــــ اہلِ سعادت کا سُرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ـــ آنکھیں چمکنے لگیں ـــ
اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ اور گونگی کا سر آغوش میں لئے ہوئے سرد ہو گیا۔

اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ شہزادی اور مرجانہ پاشا اور گونگی کی لاشوں کو حیرت و مایوسی سے
رہی تھیں۔

⁂